ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
سخنور
حصہ سوئم
تذکرہ
شعرا و شاعرات
سلطانہ مہر
مہر بُک فاؤنڈیشن
لاس اینجلیز امریکہ

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

رو میں ہے رخش عمر

خاندانی نام	فاطمہ
قلمی نام	سلطانہ مہر
مقام پیدائش	بمبئی
تعلیم	ایم۔اے (صحافت) کراچی یونیورسٹی
پہلا افسانہ	6 ستمبر 1953ء میں روزنامہ "انقلاب" بمبئی میں شائع ہوا۔
صحافت	روزنامہ "جنگ" کراچی 1967ء تا 1969ء
	روزنامہ "انجام" کراچی 1965ء تا 1967ء
	مدیرہ اعلیٰ ماہنامہ "روپ" کراچی 1980ء تا 1990ء

تصانیف

"داغ دل" (ناول 1962ء)
"تاجور" (ناول 1966ء)
"ایک کرن اجالے کی" (ناول 1969ء)
"جب بسنت رت آئی" (ناول 1972ء)
"آج کی شاعرات" (تذکرہ 1973ء)
"بند سیپیاں" (افسانے 1976ء)
"اقبال دور جدید کی آواز" (1977ء)
"سخن ور" حصہ اول (تذکرہ شعراء 1979ء)
"دھوپ اور سائبان" (افسانے 1980ء)
"دل کی آبروریزی" (افسانے 1988ء)
"ساحر کا فن اور شخصیت" (تالیف 1989ء)
"سخن ور" حصہ دوم (بیرون پاکستان بسنے والے شعراء و شاعرات کا تذکرہ 1996ء)
"سخن ور" حصہ سوم (پاکستانی شعراء و شاعرات کا تذکرہ 1998ء)

زیر طبع

"گفتنی" (نثر نگاروں کا تذکرہ)

سلطانہ مہر ہمارے ملک کی مشہور ادیبہ اور صحافی ہیں۔ "سخن ور" حصہ سوم کی اشاعت کے بعد وہ اردو زبان کی واحد تذکرہ نویس ہیں، جنہوں نے اس دور کے شاعروں اور شاعرات کے بارے میں انتہائی جامع، مضبوط اور قابل اعتماد تذکرہ بہم پہنچایا ہے، جو مستقبل کے مورخین ادب کے لئے بیش بہا سرمایہ ثابت ہوگا۔ اس تذکرہ کی ایک ایک اطلاع خود شعراء اور شاعرات کی فراہم کردہ ہے اور اس لئے اس تذکرہ کی صحت کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ مدیرہ اور مولفہ نے اپنا حق ادارت بخوبی ادا کیا ہے۔

سخن ور کی اردو دنیا میں جس طرح پذیرائی ہوئی ہے، وہ اس میدان کے دیگر ادیبوں کے لئے ہمت افزائی کا موجب ہونا چاہئے۔ میں نے "سخن ور" کی سابقہ جلدوں کا بالاستعیاب مطالعہ کیا ہے اور تیسری جلد میں شامل ہونے والے اندرجات کے سوالات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سلطانہ مہر نے جس ذمہ داری اور عرق ریزی کے ساتھ اس اہم کام کو سرانجام دیا ہے، وہ انہیں ناقابل فراموش تذکرہ نویس اور ادیبہ کی حیثیت دینے کے لئے کافی ہے۔ میں ایک عرصہ سے سلطانہ مہر کی ریاضت اور خلوص کا قائل ہوں اور "سخن ور" کی تیسری جلد کی اشاعت کے بعد جی چاہتا ہے کہ کچھ یوں کہوں کہ "سلطانہ مہر، یہ کام تم ہی کر سکتی تھیں۔"

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ڈائریکٹر قائد اعظم اکیڈمی

وفاقی وزارت ثقافت حکومت پاکستان، کراچی

سخنور

حصہ سوم

شعراء اور شاعرات کا تذکرہ

مصنفہ:- سلطانہ مہر

مہر بک فاؤنڈیشن

لاس اینجلس ریاستہائے متحدہ امریکہ

دنیائے ادب کراچی۔ پاکستان

Sultana Mehr Book Foundation
20873 E Walnut Canyon Road
Walnut CA 91789, U.S.A
Ph: (909) 444-0065 Fax: (909) 444-0077

نگراں	اوج کمال
سرورق	رشید
اشاعت	جنوری 1998ء
تعداد	1100
کمپوزیشن	دنیائے ادب۔ کراچی
قیمت	
مجلد	400 روپے
	15 امریکی ڈالر
	8 پونڈ
غیر مجلد	200 روپے
	10 امریکی ڈالر
	5 پونڈ

(زیر اہتمام)
دنیائے ادب
سی بی۔ 45، الفلاح سوسائٹی۔ شاہ فیصل کالونی
کراچی۔ 75230 پاکستان
فون : 4571322 فیکس : 4589654

انتساب

محبت اور عقیدت کے ساتھ
ان تمام ہستیوں کے نام
جن سے میں نے اکتساب نور کیا

سلطانہ مہر

فہرست

تذکرہ شعراء و شاعرات

تذکرہ مہر و شعر

ڈاکٹر حنیف فوق

پھول کی خوشبو کو گرفت میں لانا آسان ہے لیکن سلطانہ مہر کی شخصیت کے جوہر تک پہنچنا مشکل ہے۔ آج کی خواتین نے قدیم حجاب کو ترک کر دیا ہے لیکن ان کے انکشاف ذات کے سلسلے کچھ کم نظارہ سوز نہیں۔ سلطانہ مہر صحافی بھی ہیں، مضمون نگار و تنقید نگار بھی۔ وہ افسانہ نگار و ناول نگار بھی ہیں اور شاعرو تذکرہ نویس بھی لیکن کسے ان کی ذات کا صحیح یا بھرپور اظہار کہا جا سکتا ہے، اس کا فیصلہ شاید ان کے لئے بھی مشکل ہی ثابت ہو۔ یوں تو سب خواتین میں کسی نہ کسی اعتبار سے معمے کی سی صفت پائی جاتی ہے، جسے سمجھنے سے بعض اوقات بڑے بڑے دانا عاجز رہ جاتے ہیں۔ پھر کہیں ان میں سے کم یا زیادہ میں تصنیف کی لگن آجائے تو ہر عقدہ حالات جہاں کھل جاتا ہے لیکن ان کی اپنی ذات پس حجاب ہی رہتی ہے۔ عصمت کیسا بے باک قلم، کیا نڈر انداز اور کیسی چلتی ہوئی زبان رکھتی ہیں لیکن صحیح معنوں میں آج تک ان کی تحریروں میں پنہاں تخلیقی آتش فشاں کے منبع کی دریافت نہیں ہوئی ہے۔ وہ ٹیڑھی لکیر ہیں یا معصومہ، ان کی معصومیت میں ٹیڑھی لکیر ہے یا ٹیڑھی لکیر ہی معصومیت بن جاتی ہے؟ یہ اور اس طرح کے ان کی تحریروں میں ذات کے جو بہت سے حوالے ملتے ہیں، ان کو جوڑ کر اب تک کسی نے ایسی تصویر نہیں بنائی ہے جو ان کی شخصیت کے رنگوں کو سمیٹ لے۔ عصمت اور سلطانہ مہر میں بڑے فاصلے ہیں لیکن دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلے سے ہے۔ دونوں کا انداز بیان الگ ہے لیکن بہت کچھ کہہ کر بہت کچھ نہ کہنے کی صفت دونوں میں مشترک پائی جاتی ہے۔

نظیری نے کہا تھا کہ "کسے کہ کشتہ نشد از قبیلہ ء مانیست" میدان حرب ہو یا مصاف زندگی، کسی آئیڈیل کے لئے جان دینے (اور جان لینے میں) میں مرد پیش پیش رہے ہیں۔ اس کی شاذ مثالیں عورتوں میں بھی مل جائیں گی لیکن مجموعی طور پر وہ جینے (اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی) پر زیادہ یقین رکھتی ہیں۔ اپنی من بھاتی چیزوں کے لئے اس میں تحریر کی

لگن کو بھی شامل کر لیجئے۔ ان کی قربانیوں کا سلسلہ زندگی کے ساتھ ساتھ ہی چلتا ہے لیکن وہ اس کے لئے رجز خوانی نہیں کرتی ہیں بلکہ اسے اکثر اوقات اپنے آپ سے بھی پوشیدہ رکھتی ہیں۔ سلطانہ مہر کی تحریروں میں بعض مقامات پر اس کا ذکر ہو گیا ہے کہ وہ کن مشکلوں سے گزری ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ اس قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں جو مرنے اور مار ڈالنے سے زیادہ دکھانے اور چھپانے کے فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

اب تک خواتین کو صنف لطیف سمجھا جاتا ہے لیکن سلطانہ مہر اور ان کی بعض ہم قدموں نے جس محنت، جسارت اور پرورش رشحات قلم میں صلابت کا ثبوت دیا ہے، وہ اکثر صنف قوی کے بس سے باہر رہا ہے۔ سلطانہ مہر جس طرح اپنے اردگرد کے موانع دور کرتی اور اپنی نسائی خصوصیت کے ساتھ حرفوں کو اظہار کے قالب میں ڈھالتی ہیں، اس سے ان میں کسی چھپی ہوئی قوت کا سراغ ملتا ہے۔ سلطانہ مہر کو تخلیقی صفت کا جو حصہ ملا ہے، وہ اس کا کسی کم عقل بوڑھی اور بدصورت عورت کے زیورات کی بے جا نمائش کی طرح بھونڈا اظہار نہیں کرتی ہیں بلکہ اسے سلیقے سے کام میں لاتی ہیں اور اسے اپنی شخصیت کا رنگ دیتی ہیں۔ ان کی تحریریں صرف ان کی ذات کے ایک گوشے تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں ان کی زندگی کی ریاضتوں کا عکس ملتا ہے۔ جوش نے کہا تھا کہ۔

"لکھ رہی ہیں، لکھی رہی ہیں، لکھ رہی ہیں انگلیاں"

یہ انگلیاں لکھنے والے کی ذات پر محیط ہیں۔ یہاں ہرگز جوش اور سلطانہ مہر کا موازنہ مقصود نہیں کہ اس سے بڑی بدذوقی کیا ہو سکتی ہے مگر سلطانہ مہر جب کہتی ہیں کہ۔

"وہ چلتی رہی، چلتی رہی، چلتی رہی ہے"

تو یہ ان کی ذات تک محدود نہیں، پوری صنف نسواں کی نمائندگی ہے۔ گویا ان کی ذات بھی اس بڑی اکائی کا حصہ ہے۔ ادبی اوصاف اپنی جگہ لیکن معاشرتی تفاوت کے سبب سے جوش اور سلطانہ دونوں کے انداز نظر میں فرق نمایاں ہے، اس لئے سلطانہ مہر کہتی ہیں کہ۔

انساں ہو تو اس صنف کی تعظیم کرو تم
منصف ہو تو اس صنف کو تسلیم کرو تم

جہاں تک اس صنف کی تعظیم کا سوال ہے تو آج شاید ہم سب اس کے لئے بصد شوق صف بستہ ہو جائیں لیکن اس تسلیم کرنے میں جو ذہنی رکاوٹیں حائل ہیں، ان سے گزرنا آسان نہیں۔

سلطانہ مہر کے کوائف کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تصنیف و تالیف کے

کتنے ہی مرحلوں کو سر کیا ہے لیکن تذکرہ نگاری جس کے ثبوت میں ان کے "سخن ور" کی شائع شدہ جلد میں پیش کی جاسکتی ہیں' ان کی شہرت کا خاص سبب بن گئی ہے۔ اب وہ سخن ور کی نئی جلد منظر عام پر لا رہی ہیں۔ ان کی اس محنت سے ہم عصر ادب اور ادیبوں کی زندگی کے کئی گوشے نمایاں ہوئے اور ہوں گے۔ پھر جب مستقبل میں کسی حوالے کی کتاب کی ضرورت پڑے گی تو بھی ان جلدوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔ ان سوالوں کے جواب (کہ کیا اس محنت کے پیچھے کوئی تصور ادب یا تاریخ موجود ہے یا حقیقتاً" ان میں اس وقت نظر سے کام لیا گیا ہے' جسے ہم' ہم عصر ادبی تاریخ کا حصہ کہہ سکتے ہیں۔) ان کتابوں کے مطالعے کے بعد پڑھنے والے دیتے رہیں گے لیکن یہاں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ تذکرہ نگاری ایک ایسی صنف ہے' جسے آج کے دور میں زندہ رکھنا بھی ایک اہم ادبی کارنامہ ہے۔ جب یہ دیکھا جائے کہ اس کے لئے سلطانہ مہر کو ہر ہر گام پر کیسی کیسی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ہم عصر ادیبوں کے بارے میں بہت سی ایسی معلومات فراہم کی گئی ہیں کہ جنہیں قلم بند نہ کرلیا جاتا تو امتداد زمانہ کی گرد انہیں چھپا دیتی۔ سلطانہ مہر کا تعلق چونکہ افسانہ اور شاعری دونوں سے رہا ہے' اس لئے ان کے بیان میں وہ دل کشی بھی آگئی ہے جو قصے اور تاثر کو یکجا کر دیتی ہے۔ پھر ان کی تحریروں میں اس نسائی وصف کا ذکر بھی ضروری ہے جو کہی اور ان کہی کی سرحدیں ملا دیتا ہے۔ وہ جتنا کچھ کہتی ہیں اور جتنا کچھ کہنے سے چھوڑ دیتی ہیں' اس سے ان کی تحریروں میں ایک ایسی فضا بن جاتی ہے' جسے دلکش اور دل خواہ کہا جاسکتا ہے۔ میں ان کی نئی کاوش قلم پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

Dr. Hanif Fauq
F-14, Noaman Garden
Abul Hasan Isphahani Road
Karachi, Pakistan

سلطانہ مہر کی تذکرہ نگاری

حمایت علی شاعر

سلطانہ مہر کی پہچان کے تین بنیادی زاویے ہیں۔ شاعری، صحافت اور افسانہ نگاری۔ اسی لئے میں نے سن 76ء میں ان کے افسانوں کے مجموعہ "بند سیپیاں" پر مضمون لکھتے ہوئے ان کی شخصیت کو "سہ گوشہ" بلور سے تشبیہ دی تھی۔ بلور میں کئی رنگ ہوتے ہیں، عہد بہ عہد یہ رنگ ان کی شخصیت سے منعکس ہوتے جارہے ہیں۔ انہوں نے شاعری کی، ناول لکھے، افسانے لکھے، اقبال اور ساحر لدھیانوی پر کتابیں مرتب کیں۔ ماہنامہ "روپ" ایڈٹ کیا اور متعدد شعراء اور شاعرات کے تذکرے لکھے اور اب وہ کم و بیش 13 یا 14 کتابوں کی مصنف اور مولف ہیں۔ اپنے پیش رو اور ہم عصر خواتین اہل قلم پر نظر ڈالیئے تو شاعرات، افسانہ نگار اور ناول نگار تو بہت مل جائیں گی (اور بلاشبہ ان میں صف اول کی منفرد لکھنے والیاں بھی ہیں) مگر جتنی متنوع خصوصیات سلطانہ مہر کی ہے، بہت کم خواتین میں نظر آئیں گی۔ تنقید میں ممتاز شیریں کے بعد کوئی معتبر نام دور تک نہیں ملتا۔ اسی طرح تحقیق میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کے علاوہ چند پی ایچ ڈی خواتین کے نام لئے جاسکتے ہیں مگر ادب میں ان کے مقالوں کے بعد کہیں ان کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔ تراجم کے ضمن میں زاہدہ زیدی اور ساجدہ زیدی ضرور کچھ اہمیت رکھتی ہیں مگر وہ بھی تدریس اور شاعری کی نذر ہو گئیں۔ فارسی ادب پر البتہ ڈاکٹر رضیہ اکبر نے اہم کام کیا ہے۔ (ایران میں جدید فارسی ادب کے پچاس سال 1900 - 1950ء) مگر اتفاق سے ان میں ممتاز شیریں کے سوا سبھی خواتین ہندوستان سے تعلق رکھتی ہیں۔ پاکستان میں البتہ محترمہ ادا جعفری کا نام بحیثیت تذکرہ نگار لیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے "غزل نما" کے نام سے شعرائے قدیم کا (قلی قطب شاہ سے میاں داد سیاح تک) ایک جامع انتخاب کیا اور ان کا تعارف لکھا۔ تنقیدی مطالعے کے حوالے سے ڈاکٹر عالیہ امام کی دو کتابیں "شاعر

انقلاب" اور "رفیق دل فگاراں" اور نجمہ خان کے مقالات کا مجموعہ "محک" (کسوٹی) حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ادھر کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض نے بھی دو ایک کتابوں کے ترجمے کئے ہیں، جن کا ذکر ان کی اضافی خدمات میں کیا جاسکتا ہے مگر ادب کی وہ خدمات جو کسی اہل قلم کی پہچان بن جائے (بالخصوص اپنے عہد کی ادبی تصویر کشی اور تذکرہ نگاری کے حوالے سے) ہماری ہم عصر اہل ادب خواتین میں سلطانہ مہر کے سوا کسی کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ وہ کل بھی مصروف عمل تھی اور آج بھی ہیں۔ امریکہ جا کر ان کی مصروفیات کا کینوس اور بھی وسیع ہو گیا اور انہوں نے پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں آباد اردو شعراء اور ادیبوں کا احوال جمع کرنا شروع کردیا۔ یہ احوال صرف BIO-DATA تک محدود نہیں بلکہ ایک سوال نامے کے ذریعے ان کے طرز فکر، ان کے اسلوب، ان کے محسوسات، جذبات بلکہ یوں کہئے کہ ان کی پوری شخصیت کا آئینہ دکھاتا ہے۔

تذکرہ نگاری کا یہ سلسلہ سلطانہ مہر نے روزنامہ "جنگ" میں 1967ء سے شروع کیا تھا۔ "آج کا شاعر" کے عنوان سے ہر ہفتہ ایک شاعر کا انٹرویو برسوں تک چھپتا رہا۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "آج کی شاعرات" کے نام سے 1973ء میں شائع ہوئی، جس میں 103 شاعرات کا احوال ان کے کلام کے انتخاب کے ساتھ موجود ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ 1- بوئے گل 2- نالہ دل 3- دود چراغ محفل، ان عنوانات ہی سے شاعرات کے انداز فکر، انداز بیان اور ان کی عمر کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کتاب میں بزرگ ترین شاعرہ بغدادی بیگم (ولادت 1908ء) کا بھی انٹرویو شامل ہے، جو خدا کے فضل سے ابھی سلامت ہیں۔ تبرک کے طور پر ان کے دو ایک شعر ذہن میں محفوظ کرلیجئے۔

ہمارے قتل کا چرچا جو کو بہ کو ہوگا
زمانہ کچھ تو خجل ہوکے نرم خو ہوگا

جس میکدے میں تشنہ لبی رسم عام ہو
اس میکدے کو پھونک دو رندوں پہ وار کے

اسی طرح "سخن ور" کی پہلی جلد جو 1979ء میں شائع ہوئی 60 نوجوان و بزرگ شعراء کے حالات زندگی اور ان کے منتخب کلام پر مشتمل ہے۔ ان شعرائے کرام میں بزرگ ترین شاعر حضرت تابش دہلوی (ولادت 1911ء) بفضل خدا ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کا تازہ ترین مجموعہ کلام "دھوپ چھاؤں" 1996ء میں شائع ہوا۔ تابش بھائی کی تازہ ترین غزل کے دو چار شعر بھی نوٹ کرلیجئے۔ یہ اشعار انہوں نے اس مضمون کی تحریر کے دوران 2 مارچ 1998ء کو ٹیلی فون پر مجھے لکھوائے تھے۔

یوں تو یہ انفس و آفاق ہیں مظہر میرے
ایک دنیا ابھی آباد ہے اندر میرے
کتنے دکھ ہیں جو رہے تشنہ اظہار اب تک
کوزہ ء حرف سے سمٹے نہ سمندر میرے
اپنے قامت کا بھی اندازہ ہو کچھ تو مجھ کو
لیکن آتا ہی نہیں کوئی برابر میرے
جن محاذوں پہ قوی پایا نہ دشمن اپنا
ان محاذوں سے پلٹ آئے ہیں لشکر میرے
میرے افکار کی تنقیص نہ کیجئے تابش
آپ تولے نہ خذف ریزوں سے گوہر میرے

"سخن ور" کی دوسری جلد جس میں (88) شعراء و شاعرات شامل ہیں بیشتر ان اہل قلم کے حالات اور کلام سے مزین ہیں جو ممالک غیر میں آباد ہیں یعنی مشرقی وسطی کی عرب ریاستیں، یورپ، امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیاء وغیرہ۔ ان میں کچھ شاعر ایسے بھی ملیں گے، جو ہندوستانی شہری ہیں۔

دراصل اردو کی زاد بوم تو یہی برصغیر ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں کہئے کہ تقسیم پاکستان کے نتیجے میں بیشتر خاندان اپنے آبائی علاقوں سے ہجرت کر گئے۔ پھر پاکستان اور بنگلہ دیش سے بھی ہزاروں لاکھوں افراد روزگار سے مجبور ہو کر دنیا کے مختلف علاقوں میں جا بسے، ان میں بڑی تعداد اردو بولنے والے کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ زمین سے رشتہ نہ جوڑنے کی سزا اردو زبان اور اردو بولنے والوں کو مل رہی ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہونے کے باوجود اردو کے لئے "ہندوی" اور "ہندوستانی" جیسے ناموں سے گریز اور ایک ایسے "لفظ میں پناہ" جس کے لغوی معنی ہی "لشکر" کے ہیں.... کیسے ہمیں آسودہ رکھ سکتی ہے۔ بقول علامہ آئی آئی قاضی (سندھ یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر۔ خطبہ، اردو کانفرنس 1938ء کراچی) "لشکر" سے پہلے "خوف" کا تصور ابھرتا ہے پھر بے ربط "ہجوم" کا۔ ہجوم میں تنظیم نہیں ہوتی ہے، ایک اجتماع ضرور ہوتا ہے مگر باہم کوئی "تعلق" نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے پر "فوقیت" پانے کا اندھا جذبہ ہوتا ہے، اپنے قدو قامت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس کسی زبان کی "زمینی نسبت" اسے اپنی تہذیبی اقدار سے وابستہ رکھتی ہے۔ اردو اپنے خمیر میں اپنی مٹی کی خصوصیت ضرور رکھتی ہے لیکن لسانی تشکیل میں "حکمران" بیرونی زبانوں کے تتبع میں تھوڑی سی "برہمن" مزاج ہو گئی ہے۔ ہماری قوائد ہندوستانی (پاکستانی) ہے، ہمارا عروض عربی ہے اور ہمارا رسم الخط ایرانی ہے۔ چنانچہ ہمارا معتبر سرمایہ الفاظ اور ہماری معتبر اصناف سخن فارسی سے

ماخوذ ہیں۔ ہم نے پاک و ہند کی کسی علاقائی صنف سخن سے فیض حاصل نہیں کیا۔ ہم باہر کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں اور اپنے اندر کم۔ یہی سبب ہے کہ اردو اپنے ملکوں میں محدود ہوتی جارہی ہے اور اردو بولنے والے باہر زیادہ ہوتے جارہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا اردو۔۔۔ باہر کے ممالک میں اپنے قدم جما سکے گی؟ یہ مسئلہ آج ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اردو آبادی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اردو کی یہ خصوصیت کہ یہ جس زبان پر چڑھی' اسی کے ہو رہی۔ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ دوسری زبانیں بولنے والے بھی آسانی سے اسے اپنا لیتے ہیں اور اردو ان کے دل میں گھر کر جاتی ہے مگر کیا یہ خصوصیت اردو کو "تحریری طور پر" عام کر سکتی ہے؟

جہاں تک ایک مشترک تہذیب کی امین ہونے کا معاملہ ہے' اردو سارے پاکستان اور سارے ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔ ہندوستان میں ممکن ہے اس کا "لباس" بدل جائے۔ مغربی ممالک میں بھی ممکن ہے اسے اپنا "چولا" بدلنا پڑے اور ترکی کی طرح وہاں "رومن" میں لکھی جانے لگے۔ رسم الخط کے حوالے سے جو اندیشے ابھرتے ہیں وہ اکثر ہمارے دل کا دھڑکا بن جاتے ہیں اور اسی دھڑکے سے مجبور ہو کر اردو کے باشعور لوگ اس کی بقا کے بارے میں سوچنے لگے ہیں۔

کمپیوٹر کی ایجاد کے صدقے میں اردو رسم الخط کو اپنی بقا کا آسرا تو مل گیا ہے۔ خدا کرے یہی اس کے لئے "آب حیات" بن جائے۔ ورنہ ہم تو ابھی تک "دست کاری" کے دور میں تھے۔ ہمارے یہاں "ٹائپ" تک رائج اور مقبول نہ ہو سکا تھا (کاتب حضرات ہماری زبان کے حق میں "کاتب تقدیر" بنے ہوئے تھے)۔ کمپیوٹر کی ایجاد سے پہلے ممالک غیر میں یہ عالم تھا کہ ایک مختصر سا دعوت نامہ بھی کتابت کے لئے پاکستان یا ہندوستان بھیجا جاتا تھا' تب کہیں اس کی طباعت عمل میں آتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ سائنسی علوم کی برکات نے ہماری یہ کمزوری دور کر دی۔

سخن ور (جلد دوم) کے مطالعے کے دوران میں ایک ایسے "عربی نژاد" شاعر سے بھی واقف ہوا جو اس وقت اردو کے بزرگ ترین شاعر ہیں۔ استاد ابراہیم العریض عنایت (ولادت 1908ء) وہ بمبئی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک وہیں تعلیم پائی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر 1926ء میں بحرین چلے گئے۔ وہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے اور آج بھی بفضل خدا بر سر خدمت ہیں۔ عربی میں ان کے چار شعری مجموعے ہیں۔ رباعیات عمر خیام کا بھی عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان علمی خدمات پر مختلف اعزازات سے نوازے بھی گئے۔ اردو میں ان کا مجموعہ کلام "گل باری" کے نام سے شائع ہو چکا ہے ان کا ایک فکر انگیز شعر ملاحظہ کیجئے۔

کس کی تلاش میں ہیں یہ سب' ہر طواف میں
ہے تو خدا کا گھر' پہ وہ ملتا ہے کم وہیں

جلد دوم ہی میں ایک بزرگ ترین "اردو نژاد" شاعر کا احوال بھی نظر سے گزرا۔ موسیقار کے طور پر انہیں ایک دنیا جانتی ہے۔ فلمی دنیا میں وہ "موسیقار اعظم" مانیں جاتے ہیں۔ مگر ہند و پاک کے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ شاعر بھی ہے۔

موسیقار نوشاد۔۔۔ اصل نام نوشاد علی ہے۔ 1919ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ سے تعلق ہے اور اچھے شعر کہتے ہیں۔۔۔

اچھی نہیں نزاکت احساس اس قدر
شیشہ اگر بنو گے تو پتھر بھی آئے گا
اس واسطے اٹھاتے ہیں کانٹوں کے ناز ہم
اک دن تو اپنے ہاتھ گل تر بھی آئے گا

مندرجہ بالا حوالوں سے آپ کی نظر میں ان کتابوں کی اہمیت واضح ہو گئی ہوگی۔ اب سلطانہ مہر نے "سخن ور" کی تیسری جلد مرتب کی ہے' اس میں بھی نئے کم عمر اور بزرگ 82 شعراء اور شاعرات کا تذکرہ اور ان کا منتخب کلام شامل کیا گیا ہے اور جس سوالنامے کی معرفت جوابات حاصل کئے گئے ہیں وہ سلطانہ مہر کی ادب کے موجود مسائل سے بھرپور آگاہی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ تقریباً" سب ہی اہل قلم نے اپنے علم کے مطابق جوابات سے نوازا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے اختلاف بھی ممکن ہے مگر ان کی روشنی میں اپنے عہد کے بارے ایک زاویہ نگاہ بھی مرتب ہوتا ہے۔

ہم سب ہی جانتے ہیں کہ اردو میں ہر صنف سخن غیر ملکی زبانوں سے مستعار ہے۔ فارسی تو ہے ہی وہ زبان' جس کی ساری اصناف' طرز فکر' انداز بیان۔۔۔۔ جوں کی توں اردو میں موجود ہے۔ قواعد سے قطع نظر اردو کی شعری لسانیات کا خمیر بھی فارسی سے اٹھا ہے۔ عربی کی خصوصیات بھی فارسی کی معرفت اردو میں آئی ہیں۔

فارسی جب تک ہم پر حکمران تھی' اردو اس حد تک اس کے تابع رہی کہ اکثر صرف ایک "فعل" سے اس کی شناخت ہوتی تھی مثلاً۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل' آئینہ بے مہری قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غمخوار جان دردمند آیا (غالب)

لیکن کوئی زبان ہو زمین کی خوشبو اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ ایسے شعراء بھی آئے جو اس کا آنچل اپنے پیڑوں سے باندھتے رہے۔ موجودہ صدی میں جب اقبال جیسا شاعر بھی صرف تین مجموعے اردو کو دے کر اس زبان سے کنارہ کش ہو گیا اور اپنے افکار سے فارسی کو نوازنے لگا تو ہمیں اپنی بے بضاعتی احساس ہونا لازمی تھا۔

اردو کے اتنے بڑے شاعر سے محرومی بعض اہل دانش کو سوچنے پر مجبور کرنے لگی کہ ہم نے اب تک کیا کیا اور رفتہ رفتہ کدھر جا رہے ہیں۔ آرزو لکھنوی، عظمت اللہ خان اور میراجی کی کاوشیں اردو شاعری میں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

فارسی ہندوستان سے جا چکی۔ پاکستان میں بستر لپیٹ رہی ہے۔ اس کے آثار اب اردو کی معرفت ہی اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ سنا ہے "مقتدرہ" میں پھر وہی تجربہ دہرایا جا رہا ہے جو حیدر آباد دکن میں ناکام ہو چکا۔ عالم یہ ہے کہ پاکستان میں بھی اب ہمارے طالب علم سائنسی اصطلاحات کو اردو کی بجائے انگریزی میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں ان اصطلاحات اور ایجادات کو "مشرف بہ اردو" کرنے کا رجحان ہی غلط ہے۔ جب ہمیں علمی سطح پر کسی "ایجاد اور دریافت" کی توفیق ہی نہیں ہوئی تو کسی اور کے حاصل محنت کو نام بدل کر اپنا لینا، اسے اپنی شناخت سے محروم کر دینا اور اس کے "اپنے خاندان" سے جدا کر دینا کہاں کا انصاف ہے۔ انسانوں کی طرح لفظ بھی اپنی روٹس (Roots) سے جڑے رہنا چاہتے۔ اگر نام بدلنے کا عمل "دواؤں" کے ساتھ ہونے لگے تو سوچیئے کہ بیماروں اور مریضوں کا کیا حشر ہو گا؟

سائنسی علوم نے اس وسیع و عریض کائنات کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اب ہر "غیر ممکن"..... ممکنات میں داخل ہو چکا ہے اور تسخیر حیات و کائنات کا عمل جاری ہے۔ ہماری زبان جو پہلے ہی سے بڑی "کشادہ دل" واقع ہوئی ہے اور ایک سو سال کے "عہد غلامی" میں دنیا کے ترقی یافتہ علوم سے بھی کسی حد تک متعارف ہو چکی ہے، اسے مقامی اور غیر مقامی زبانوں (فارسی، عربی) کے علاوہ انگریزی کے مستعمل الفاظ اور اصطلاحات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہیئے۔ فارسی و عربی کی طرح "اختر الایمان" اور "خورشید الاسلام" کو لفظی اعتبار سے غلط تراکیب قرار دینے والی ذہنیت اسی "برہمنیت" کی غماز ہے، جس کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا۔ اسی طرح موسم برسات، لب سڑک، دن بہ دن، برس ہا برس یا رنگ و روپ وغیرہ کو بھی اب درست قرار دے کر رائج کر دینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ انگریزی اور اردو الفاظ میں بھی اب "دوستی" ہو جانی چاہیئے۔ اگر ابھی ہم نے وقت کے تقاضوں کو نہ سمجھا

تو "وقت کا جبر" ہمیں "سب کچھ" قبول کرنے پر مجبور کردے گا۔ ہمیں سنسکرت اور عبرانی زبانوں کے انجام سے سبق سیکھنا چاہیے۔

فارسی اور عربی بھی اردو کی طرح نئے علوم سے محروم زبانیں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان زبانوں میں کئی سو سال سے کوئی بڑا سائنس داں، کوئی بڑا فلسفی، کوئی بڑا ادیب، کوئی بڑا شاعر اور کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہوا۔ اردو تو ان کے مقابلے میں بہت چھوٹی زبان ہے۔ مغرب میں آباد اردو لکھنے اور بولنے والوں کو سنجیدگی سے ان مسائل پر غور کرنا چاہیے کیونکہ وہ ہم سے کم از کم پانچ سو سال آگے کی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں۔

"سخن ور" کی تیسری جلد میں سلطانہ مہر نے جدید تر نسل کے شعراء کے ساتھ حسب معمول کچھ بزرگ شعراء کا بھی انتخاب کیا ہے۔ یہ جدید شعراء بیشتر پاکستانی ہیں اور بڑی تعداد میں یہیں آباد ہیں۔ اس میں ممالک غیر کے صرف وہی شعراء ہیں، جو کسی وجہ سے کتاب کے حصہ دوم میں شامل نہ سکے تھے۔ ان شعراء میں بزرگ ترین پاکستانی شاعر ڈاکٹر الیاس عشقی (ولادت 1922ء) اور کینیڈا میں پروفیسر عبدالقوی ضیاء (ولادت 1925ء) ایسے شاعر ہیں، جو اپنی ذات میں ایک ادارے سے کم نہیں۔ الیاس عشقی.... سچل سرمست کی طرح موجودہ سندھ کے "ہفت زبان" شاعر ہیں۔ اردو، ہندی، فارسی، انگریزی، پنجابی، سندھی اور سرائیکی....(ان کے علاوہ راجستھانی اور برج بھاشا سے بھی واقف ہیں)۔ عشقی صاحب کو ان زبانوں پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ نہ صرف مضامین لکھتے ہیں بلکہ شعر بھی کہتے ہیں۔ بڑے دوست دار اور صاحب علم انسان ہیں مگر شہرت سے گریز کرتے ہیں۔ فارسی میں ایک مجموعہ کلام "شعر آشوب" (1979ء) اور پنجابی اور سندھی شاعری کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہے۔ ہر صنف سخن میں لکھا ہے بالخصوص دوہے، (درست بحروں میں) اور منظوم ڈرامے ان کی خاص پہچان ہے۔ نظمیں بھی اپنے موضوعات کے لحاظ سے منفرد ہوتی ہیں۔ ریڈیو میں برسوں میرے رفیق کار رہے۔ بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں۔ ان کے بارے میں بس یہی کہہ سکتا ہوں۔۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اسی طرح عبدالقوی ضیاء۔

زبان پہ بار خدایا، یہ کس کا نام آیا

ضیاء صاحب عرصہ دراز سے کینیڈا میں آباد ہیں۔ حیدر آباد سندھ میں تاریخ کے استاد تھے۔ تقریباً" ایک ہزار صفحات پر مشتمل "تاریخ اندلس" ان کا تاریخی کارنامہ ہے۔ شعری مجموعہ "برف زار" دل کو ٹھنڈک پہنچانے والی کتاب ہے۔ فکر انگیز، گرم جوش، روایات سے ہمکنار اور جدید حسیت سے سرشار ان کی غزلیں بدلتے ہوئے دور میں بھی انہیں ایک معتبر

اور بلند مقام عطا کرتی ہیں۔ ضیاء صاحب بفضل خدا ابھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور نوجوانوں کی طرح ایک فعال زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں اپنی ادبی و علمی خدمات پر کئی ایوارڈز مل چکے ہیں۔ اردو اور انگریزی میں ضیاء صاحب کی جو کتابیں منظرعام پر آئی ہیں' وہ کینیڈا میں اردو ادب کی تاریخ کے مترادف ہیں۔

سلطانہ مہر کی اس کتاب میں 82 شعراء اور شاعرات کے حالات اور ان کا منتخب کلام جمع ہے۔ اس کلام میں غزلیں' پابند اور آزاد نظمیں' ہائیکو' ثلاثیاں' رباعیات' قطعات اور نثری نظمیں بھی شامل ہیں۔ "نثری نظم" کے سلسلے میں کہیں پسندیدگی کا اظہار ہے اور کہیں سرے سے انکار ہے۔ میرا خیال ہے ابھی ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ فیض صاحب کے مصرعے۔۔

جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

کے مصداق ہمیں اپنا دامن وسیع رکھنا چاہئے۔ اردو ادب میں ممالک غیر سے بہت کچھ درآمد ہوا ہے۔ سانیٹ' بلینک ورس (نظم معریٰ) فری ورس (آزاد نظم)۔ لرک' ترائیلے' ہائیکو (پنج ہفتیات) اور پروز پوئم (نثری نظم) وغیرہ ان سب اصناف میں ابھی تک صرف فری ورس (آزاد نظم) ہی اردو کا حصہ بن سکی۔ مندرجہ بالا کسی صنف سخن کو ابھی تک ہمارے ادب میں "اپنائیت" کا مقام حاصل نہ ہوسکا۔ "آزاد نظم" سب سے پہلے عبدالحلیم شرر نے لکھی تھی' لیکن جب اسے ن۔ م۔ راشد' تصدق حسین خالد' فیض احمد فیض' میراجی اور اختر الایمان جیسے شاعر نصیب ہوئے تو اسے اردو نے اپنا لیا۔ "نثری نظم" بھی اگرچہ گذشتہ 70-72 سال سے اردو میں متعارف ہے مگر ابھی تک ہمارا غنائی مزاج اسے قبول نہ کرسکا۔ یہ صنف فرانسیسی شاعر بادلیئر سے منسوب ہے۔ اردو میں سب سے پہلے ستمبر 1924ء میں علامہ نیاز فتح پوری نے اپنے رسالے "نگار" (بھوپال) میں مصری شاعرہ آنسہ می کی عربی میں لکھی ہوئی نثری نظموں کے تراجم شائع کئے اور اس صنف کو "نظم منثور" کا نام دیا۔ اسی زمانے میں صلاح الدین قریشی نے آنسہ می کی نثری نظموں کے مجموعے "ظلمت واشعہ" کا ترجمہ کرکے "ظلمت و نور" کے نام سے شائع کیا۔ (اختر حسین رائے پوری نے بھی اس صنف کے بارے میں اچھی رائے دی تھی) بعد ازاں بشیر ہندی کی نثری نظموں کا مجموعہ "انگارے" اور حجاب اسماعیل (حجاب امتیاز علی تاج) کی کتابیں "نغمات موت" اور "ادب زریں" کے نام سے آئیں۔ انہیں بھی نثری نظم سے موسوم کیا جاسکتا ہے اگرچہ ان کی فضا افسانوی ہے۔ کچھ عرصہ بعد ٹیگور اور خلیل جبران کے تتبع میں لکھی جانے والی نظمیں رسائل کی زینت بنیں۔ آصف علی (ارونا آصف علی فیم) کی کتاب "پرچھائیں" بھی اسی قسم کی تحریروں کا مجموعہ تھی۔ 1964ء میں سجاد ظہیر کی نثری نظموں کا مجموعہ "پگھلا نیلم" شائع ہوا۔

سن 40ء کے عشرے میں "نثری نظم" کی مخالفت بھی ہوئی اور اس کا مذاق بھی اڑایا گیا۔ سن 42ء میں سعادت حسن منٹو کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا، جس میں منٹو نے خود نثری نظمیں لکھ کر بڑے دلچسپ انداز میں ان کا تجزیہ کیا اور اسے مغربی شاعری کی سستی تقلید جتاتے ہوئے تضحیک آمیز لہجے میں رد کر دیا۔ یہ تمام حوالے اور ان کے اہم اقتباسات میرے مجموعہ مقالات "شخص و عکس" (مطبوعہ 1984ء) میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کشور ناہید، احمد ہمیش، قمر جمیل اور ان کے بعد آنے والے شعراء کی نثری نظموں کے بارے میں میرے تاثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

ہمارے بعض نہایت اہم اور معتبر اہل قلم مثلاً" پروفیسر منظور حسین شور، ڈاکٹر وزیر آغا اور صہبا لکھنوی کو "نثر نظم" کی ترکیب ہی پر اعتراض ہے حالانکہ یہ حضرات مغربی ادب پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ انہیں یقیناً" معلوم ہوگا کہ اردو کی ایک قدیم صنف سخن "نثر مرجز" بھی ہے، جس پر بزرگوں نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور "سہل ممتنع" بھی اسی قبیل کا ایک پیرایہ اظہار ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان اصناف میں جو آہنگ اختیار کیا گیا ہے، اس سے ہمارے غنائی مزاج کو کوئی دھچکا نہیں پہنچتا۔ مثلاً" سہل ممتنع میں غالب کا ایک شعر دعوت فکر دیتا ہے۔

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ شعر نثر بھی ہے اور نظم بھی۔ "نثری نظم" کا آہنگ الہامی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ اس اعتبار سے اس آہنگ کو "آہنگ ربانی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے تخلیقی جوہر کو اس آہنگ میں آزمائے بغیر اس کی افادیت سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ تجربے، انسان کو آگے بڑھاتے ہیں۔ رد و قبول کا فیصلہ وقت کرتا ہے۔ اردو شاعری میں خواجہ میر درد نے "رباعی" کو "مستزاد" میں بھی لکھا ہے عرصہ ہوا ہمارے دور میں مظہر امام نے "آزاد غزل" کی بنیاد ڈالی۔ قمر ساحری نے "آزاد رباعی" کا تجربہ کیا۔ بشیر بدر نے "نثری غزل" لکھی اور میں 60ء سے "ثلاثی" لکھ رہا ہوں۔ علاقائی زبانوں سے فیضیاب ہوتے ہوئے اب ماہیا، دوہا، سی حرفی اور وائی بھی لکھی جانے لگی ہے۔ انشاء اللہ، ٹپہ، کافی اور دوہیڑے بھی لکھے جائیں گے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہر چیز "علم" کے راستے سے ادب میں آئے۔ "لاعلمی" کی راہ سے آنے والی تخلیقات ایک دن اپنے ہی ملبے میں ڈھیر ہو کر رہ جائیں گی۔

سلطانہ مہر چونکہ خود بھی "سخن ور" ہیں۔ مادری زبان گجراتی ہونے کے باوجود اردو ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ ان کی ہر کاوش علم و ادب سے شعوری وابستگی کی دلیل ہے اور اہل ادب جانتے ہیں کہ وہ بڑی ذمہ داری سے تذکرہ نگاری کی خدمات بھی انجام دے رہی

ہیں۔ یہ تذکرے اپنے عہد کے شعری ادب کی تاریخ مرتب و مدون کرنے میں مستقبل کے ادبی مورخ کی بڑی رہنمائی کریں گے۔ یہ کام یقیناً" بہت محنت طلب اور صبر آزما ہے لیکن جس محبت اور لگن سے وہ یہ خدمات انجام دے رہی ہیں امید ہے کہ آئندہ بھی جاری رکھیں گی اور جیسا کہ اعلان کیا گیا ہے۔ ہمارے دور کے نثر نگاروں کے بارے میں بھی ان کی جلد ہی کوئی کتاب شائع ہو گی۔۔

اللہ کرے مرحلہ ء شوق نہ ہو طے

حمایت علی شاعر

۳/۳/۱۹۹۸

Himayat Ali Shair
CB-45, Al-Falah Society
Shah Faisal Colony
Karachi-75230, Pakistan

زندگی جہد است و استحقاق نیست

پروفیسر سحر انصاری

اردو ادب کا دامن جس زاویے سے دیکھئے وسعت کا حامل نظر آئے گا۔ مسرت کا مقام ہے کہ اس وسعت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ نئی نئی اصناف ادب اور تحریر کے جدید اسالیب اس کو برابر ترقی دے رہے ہیں۔ اس سفر میں خواتین اہل قلم کی کاوشوں کو بطور خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک زمانے تک دنیا کے ہر ادب کی طرح اردو ادب بھی خواتین اہل قلم کی بھرپور نمائندگی سے محروم رہا لیکن اب صورتحال خاصی مختلف ہے۔

اسی طرح ایک نقطہ نظر یہ تھا کہ خواتین کچھ لکھیں تو اس کا تعلق افسانہ یا شاعری سے رہے۔ ہرچند کہ افسانہ اور شاعری بھی کوئی کھیل نہیں لیکن ہمارے معاشرے کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ فلسفہ سائنس یا تنقید و تحقیق کے مقابلے میں یہ اصناف زیادہ آسان ہیں۔ بہرحال افسانے اور شاعری میں تو خواتین کی صفوں میں بہت اہم نام شامل ہو چکے ہیں۔ البتہ تحقیق اور تنقید کا میدان ابھی خالی نظر آتا ہے۔

جب بھی کوئی کاوش ایسے شعبوں میں ہوتی ہے، جنہیں عموماً "دقیق اور خشک کہہ کر نظر انداز کردیا جاتا ہے تو غیر روایتی ذہن ضرور ایسی کاوش کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال سلطانہ مہر کا وہ کتابی سلسلہ ہے جو "سخن ور" کے نام سے اب تک دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور یہ تیسری جلد اپنی آب و تاب کے ساتھ منصہ شہود پر آرہی ہے۔

سلطانہ مہر زندگی سے بھرپور اور نئے نئے خیالات سے معمور شخصیت کا نام ہے۔ طویل مدت سے وہ ادب اور صحافت کی دنیا میں مصروف عمل ہیں۔ میں انہیں ان کی تحریروں کے وسیلے سے بھی جانتا ہوں اور ان سے ذاتی ملاقاتوں کا بھی ایک گہرا تاثر قائم ہے۔ وہ اسی معاشرے کی فرد ہیں جو کسی کو رعایت نہیں دیتا۔ اس معاشرے میں زندگی انعام یا ارمغان نہیں بلکہ بڑی محنت اور جگر کاوی کے ذریعے حاصل کی ہوئی متاع گراں بہا ہے۔ سلطانہ مہر نے زندگی میں جو مقام حاصل کیا ہے، وہ ان کی مسلسل، طویل اور انتھک جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ جب بھی وہ ملی ہوں یا ٹیلی فون پر بات ہوئی ہو تو ان کے لہجے میں سرخوشی اور حوصلہ مندی نہ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک خاتون کی حیثیت سے انہیں زمانے کے سرد گرم کے بڑے بڑے چیلنجوں سے گزرنا پڑا لیکن سلطانہ مہر نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ وہ شاید اقبال کے اس قول کو اچھی طرح جانتی اور مانتی ہیں کہ۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست

جبھی آج سلطانہ مہر کے دامن میں شاعری، افسانہ، ناول، تذکرہ نویسی اور خاکہ نگاری کے متعدد گلدستے اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

سلطانہ مہر نے "آج کی شاعرات" اور "سخن ور" کے عنوان سے جو کتابیں مرتب کی ہیں، وہ تنقید، تبصرہ، تذکرہ اور ہم عصر شاعری کی پرکھ اور پہچان کے قابل قدر نمونہ ہیں۔ "سخن ور" کے اب تک دو حصے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا حصہ پاکستان کے مختلف شہروں میں رہنے والے شعراء کے تعارف، حالات زندگی، نمونہ ء کلام وغیرہ پر مشتمل ہے جبکہ "سخن ور حصہ دوم" میں ایسے شاعروں کا کلام اور تعارف شامل ہے جو بیرون پاکستان اردو کے مختلف مراکز میں شعر و سخن کی آبیاری کر رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب "سخن ور" حصہ سوم ہے۔ اس میں ایسے شعراء اور شاعرات کو شامل کیا گیا ہے جو پہلے دو حصوں میں بوجوہ شریک نہ ہو سکے تھے۔ "بوجوہ" کا لفظ میں نے یوں استعمال کیا کہ ایک طرف تو ہر کتاب کی ضخامت مناسب صفحات تک ہی رکھی جاسکتی ہے، اسی لئے اس کو کئی حصوں میں شائع کرنا پڑا۔ دوسرے سلطانہ مہر کو شعراء سے رابطہ قائم کرنے، ان سے ضروری کوائف اور نمونہ کلام حاصل کرنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، وہ انہیں ایک تیز رو مسافر کی طرح آگے بڑھ جانے اور ست رو ہم سفروں کو پیچھے چھوڑ جانے پر مجبور کرتی ہیں۔ جس طرح کی ترتیب و تدوین، تحقیق و تنقید کا کام وہ کر رہی ہیں، اس میں شخصیات کی توجہ کے لئے لامتناہی انتظار اور غیر معمولی تعطل ممکن ہی نہیں ہے۔ سلطانہ مہر بڑے صبر و استقامت کے ساتھ اس طرح کے مراحل سے گزر جاتی ہیں۔ عدم تعاون، حوصلہ شکنی اور بے نیازی انہیں دل برداشتہ نہیں کرتی، یہی سلطانہ مہر کی کامیابی و کامرانی کی کلید ہے۔

فکشن اور شاعری چونکہ سلطانہ مہر کے تخلیقی جہات میں شامل ہے، اس لئے ان کا اسلوب نگارش، شستہ، رواں دواں اور دل نشیں ہوتا ہے۔ ان کی تنوع پسند طبیعت، ان کی تعارفی تحریروں کو یکسانیت کا شکار نہیں ہونے دیتی۔ ہر تعارف، ہر خاکہ اپنا ایک جداگانہ رنگ و رخ رکھتا ہے۔ ورنہ عام طور پر تذکرے یکسانیت اور پھیکے پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر سلطانہ مہر کے اس اہم کام کا اندازہ ہے، جب کبھی معاصر شعراء پر کوئی تحقیقی کام ہوتا ہے اور ان کے کوائف درکار ہوتے ہیں تو سلطانہ مہر کے سلسلہ "سخن ور" سے

ضرور رجوع کیا جاتا ہے۔

وطن سے دور۔۔۔۔ امریکہ کی فضاؤں میں رہ کر بھی وہ اپنے سلسلۂ تہذیب سے ہم رشتہ ہیں۔ سلطانہ مہر بڑی ہمت اور جگر کاوی سے "سنجیدہ علمی کاموں" میں منہمک ہیں۔ ان کی علمی و تحقیقی کاوشوں کو بجا طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی پاکستان اور بیرونِ پاکستان ایسے شعراء اور شاعرات ہوں گے، جن کا تذکرہ بھی ضروری ہے اور جو سلطانہ مہر سے رابطے میں نہ آسکے ہوں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ سلسلہ "سخن ور" کی یہ جلد آخری نہیں بلکہ آئندہ جلدوں کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی اور سلطانہ مہر اسی تندہی اور دلچسپی سے اپنے ہی کام کو آگے بڑھاتی رہیں گی۔ میں ان کی ادبی سرگرمیوں کا ہمیشہ دل سے معترف رہا ہوں۔ میری دعا ہے کہ وہ صحت اور سلامتی کے ساتھ ادب اور تہذیب کی اسی طرح خدمت کرتی رہیں۔

سحر انصاری

Prof. Sahar Ansari
Department of Urdu
University of Karachi
Karachi, Pakistan

مجھے انتظار رہے گا......!

سلطانہ مہر

رہتا سخن سے نام قیامت تک ہے ذوق
اولاد سے تو بس یہی دو پشت چار پشت

کسی نے سچ کہا ہے کہ "دانائی میں توانائی ہوتی ہے" "سخن ور حصہ سوم" میں کتنے ہی دانش وروں کی محفل سجی ہے۔ ان میں کچھ ٹکڑیوں میں بھی بٹے ہوئے ہیں لیکن اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ سوچ میں اختلاف نہ ہو تو علم کے در بھی وا نہیں ہوتے چنانچہ میرے مرتب کردہ سوالوں کے جواب میں بلاشبہ فکر و دانش کی شاداب بہاروں نے بڑے خوشنما پھول کھلائے ہیں اور آگہی کی مشام جاں کو معطر کیا ہے۔

میں نے سخن ور اول سے لے کر سخن ور سوم تک اسے محض سوانحی کتاب تک محدود نہیں رکھا۔ سوانح کے ساتھ ساتھ میں نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے چند سوالات بھی کئے۔ سخن ور اول کے تو تمام شعراء سے میں نے بالمشافہ گفتگو کی تھی۔ سخن ور دوم میں چند کو چھوڑ کر سب کی خدمت میں سوالنامہ ارسال کردیا تھا۔ حصہ سوم میں دوم سے کچھ مختلف سوالات رکھے۔ یہ سوالات میں نے چند اکابرین کے تنقیدی مضامین سامنے رکھ کر مرتب کئے۔ ان میں سردست میں صرف ایک مضمون کا حوالہ دے سکتی ہوں، جس کی بنیاد پر سوال نمبر6 اور 7 مرتب کئے گئے۔ وہ مضمون محترم ڈاکٹر جمیل جالبی کا ہے جو روزنامہ "جنگ" میں 27 جولائی 1997ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

شعراء و شاعرات کے جواب پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ان سوالات کا جواب کچھ آسان بھی نہ تھا اور جہاں تک میرے علم میں ہے کچھ شعراء نے دوران گفتگو کہا بھی کہ سوالات مشکل ہونے کی بناء پر وہ جواب دینے سے گریز کر گئے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس قسم کے

سوالات مطالعہ کے لئے مہمیز بھی ہوتے ہیں۔ مطالعہ کا چراغ ساتھ ہو تو فکر و دانش رفیق سفر بن جاتے ہیں اور ان کے جلو میں ایک پورا عہد ساتھ چلنے لگتا ہے۔

آج مطالعہ کی کمی کے سبب ہی "حرف" کی حرمت بھی کم ہوئی ہے۔ حرف...... جو روشنائی کا جامہ پہن کر ہمارے لئے چراغ راہ بن جاتے ہیں' میڈیا کا کوئی دوسرا رکن یہ حق ادا نہیں کرتا' چاہے وہ ٹی وی ہو' وی سی آر یا انٹرنیٹ۔ کتاب کا' جرائد کا یا پرنٹ میڈیا کے کسی بھی روپ کا حسن و جمال ہی کچھ اور ہے اور پھر یہ کلیہ "بھی نظرانداز کئے جانے کے لائق نہیں کہ "علم سے محبت انسان کو اور اس کے حوصلوں کو ہمیشہ سدا بہار رکھتی ہے۔"

مجھے سخن ور حصہ سوم کے تعارف لکھنے میں زیادہ لطف یوں بھی آیا کہ بعض شعراء و شاعرات نے فہم و ادراک پر مبنی تفصیلی جواب دیئے ہیں۔ میں نے بھی انہیں "کاٹ چھانٹ کی بد دیانتی" سے گریز کرتے ہوئے اسے اس کے حسن اور سلیقے کے ساتھ آپ تک پہنچائے ہیں۔

"سخن ور حصہ سوم" میں' میں ان تمام شعراء و شاعرات تک نہیں پہنچ سکی' جن کا تذکرہ اس میں شامل ہونا چاہئے تھا۔ اس راہ میں بڑی دشواریاں بھی حائل رہیں۔ کراچی میں میرے قیام کا محدود وقت' کتاب کی ضخامت اور مہنگائی.... بعض اوقات میں بد دل بھی ہوئی مگر جو حوصلہ ہارے' وہ سلطانہ مہر تو نہ ہوتی چنانچہ زخمی قدم' نامہربانیوں کے وار سے لرزاں تن اور بے قرار و فریاد کناں جذبوں کو ہی معاون بنا کر میں آگے بڑھتی رہی۔ میں سرخرو ہوں اور "سخن ور حصہ سوم" کے ساتھ آپ کے سامنے میں بھی ہوں اور میری سعی ء کامیاب بھی۔

یہ میرا وعدہ تھا جو پورا ہوا۔ 1996ء میں جب میں سخن ور دوم' پر کام کر رہی تھی محترم ڈاکٹر جمیل جالبی نے فرمایا تھا کہ اس میں' میں پاکستانی شعراء کو بھی شامل کروں مگر سخن ور دوم کی ضخامت اس کی متحمل نہ تھی۔ میں نے ان سے اگلی جلد پر کام کرنے کا وعدہ کیا اور پھر جیسے ہی مہلت ملی' میں اپنے شہر کراچی چلی آئی کہ یہاں میرے احباب کے روشن روشن چہرے مجھے خوش آمدید کہتے ہوئے میرے معاون بنے۔ میں طفیل اختر (مدیر ماہنامہ "مسکراہٹ" لاہور) کا بطور خاص شکریہ ادا کرنا چاہوں گی' جنہوں نے لاہور اور گرد و نواح کے شعراء و شاعرات کا تعارف خاصی صبر آزما کاوشوں کے بعد فراہم کر کے مجھے بھجوائے۔ لاہور کے جاوید آفتاب کی بھی شکر گزار ہوں۔

میں تہہ دل سے ممنون ہوں' محترم احمد ندیم قاسمی' محترم ضمیر جعفری' محترم ڈاکٹر حنیف فوق' محترم حمایت علی شاعر' محترم پروفیسر سحر انصاری اور محترم ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی' کہ جنہوں نے اپنی محبتیں عنایت کر کے بلاشبہ میرے حوصلے بھی بڑھا دیئے اور میرے قلم کو

حیات نو بھی عطا کی۔ دراصل یہ ان سب کی محبت ہی تھی اور ہے کہ جس نے مجھے اپنی نظروں میں بھی اتنا بلند قامت بنا دیا ہے کہ آسمانوں کو چھو لینے کو جی کرتا ہے۔ سو مجھے میرے بزرگ، میرے احباب اور میرے چھوٹوں کے پیار سے ہم کنار اور اس خوشی میں سرشار رہنے دیجئے اور آپ "سخن ور حصہ سوم" کا مطالعہ کیجئے۔ آپ نے اس کتاب کو کیسا پایا مجھے انتظار رہے گا، آپ کی رائے کا، آپ کے مشوروں کا۔

زندگی رہی تو پھر ملیں گے انہی صفحات پر (انشاء اللہ)

سلطانہ مہر

Sultana Mehr
16514 Jarsy Street Granada Hills
CA 91344 U.S.A
Ph:(818) 831-0279

سوالنامہ

1- اپنا پورا نام، تخلص، تاریخ و جائے پیدائش، حصول تعلیم و ملازمت کی تفصیل اور مختصر سوانح لکھیے۔

2- شاعری کے علاوہ ادب کی اور کونسی صنف سے وابستگی ہے؟ شاعری کے کس مکتبہ فکر سے آپ کی شاعری متاثر ہے؟ کن جرائد میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا ہے؟ اپنے مجموعہ کلام اور دیگر تخلیقات کی تفصیل لکھیے۔

3- اپنی زندگی کے چند اہم اور دلچسپ واقعات ضرور لکھیے

4- اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے، آپ اس کے مستقبل کے بارے میں کس حد تک پرامید ہیں؟

5- شاعری میں کس صنف کو اظہار خیال کے لئے بہتر سمجھتے ہیں، نثری نظم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آج کے دور میں مشاعرے ادب کی تخلیق میں معاون ہیں یا تخلیقی نشستیں زیادہ بہتر کردار ادا کرسکتی ہیں؟

6- کہا جارہا ہے کہ دور حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے اور قاری سے اس کا رشتہ کمزور پڑگیا ہے چنانچہ آج کا ادب ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے۔ آپ کیا کہیں گے؟

7- سینئر ادیبوں کا کہنا ہے کہ آج ہم مغرب کے رجحانات اور اس کے ادب کی پیروی کرکے وہاں کے ادبی فیشن اپنے ملک میں درآمد کررہے ہیں جبکہ ہمیں مغرب سے تکنیک ضرور سیکھنا چاہئے لیکن مسائل، حسیت اور احساس و شعور ہمارے اپنے ہونا چاہئیں کیونکہ بیرونی فیشن کی پیروی سے اچھا ادب تخلیق نہیں ہوسکتا۔ آپ اپنی قیمتی رائے کا اظہار کیجئے۔

ازراہ خلوص تمام سوالوں کے جواب لکھیں تاکہ آپ کے نکتہ ء نظر کی بہترین ترجمانی ہوسکے۔

کیا گزرتی ہے بھری دنیا میں تنہا شخص پر
ایک لمحے کے لیے خود سے بچھڑ کر سوچنا

(اعزاز احمد آذر)
12/12/97

Ezaz Ahmad Azir
120/A, Zinat Block
Allama Iqbal Town
Lahore, Pakistan

اعزاز احمد آذر

لاہور

اعزاز احمد کا کلام پڑھ کر مجھے کہنا پڑا کہ وہ ایک واضح کمٹ منٹ کے شاعر ہیں۔ غزل میں ان کے تجربات ہمارے دل پر دستک دیتے ہیں اور پھر ہمیں مضطرب بھی کر دیتے ہیں۔ ان کی غزل میں مقصدیت کی پکار بھی ہے اور اپنے اندر کے دکھ کا اظہار بھی۔ کہتے ہیں۔۔۔

وہ ساری خوشیاں جو اس نے چاہیں اٹھا کے جھولی میں اپنی رکھ لیں
ہمارے حصے میں عذر آئے' جواز' آئے ' اصول آئے

آذر نے اردو شاعری کے ان جدید رجحانات سے اپنے کلام کو بچا رکھا ہے کہ جن کے سہارے علامات اور ابہام سے ایسا ادب تخلیق کیا جا رہا ہے جو بے معنی ہے اور غلط طرز فکر کو جنم دے رہا ہے۔ آذر جو بھی کہتے ہیں کھل کر کہتے ہیں۔

اعزاز احمد آذر 25/ دسمبر 1942ء کو بٹالہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے لاہور سے ایم اے اردو' ایم اے پنجابی اور ایم اے سیاسات کے علاوہ ایجوکیشن اور قانون کی ڈگریاں حاصل کیں۔ کچھ عرصہ شعبہ تدریس سے اور کچھ عرصہ وکالت سے منسلک رہنے کے بعد 1974ء میں وزارت اطلاعات و نشریات کے ذیلی محکمے پاکستان نیشنل سینٹر میں بطور ریزیڈنٹ ڈائریکٹر ملازمت اختیار کی اور تاحال بحیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل اسی محکمہ سے وابستہ ہیں۔

آذر کہتے ہیں کہ میرا کلام پڑھ کر میرے قاری یا ناقد فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس مکتب فکر سے میری وابستگی ہے۔ تاہم میری شاعری کا مرکزی حوالہ انسانی اور ذہنی رشتے ہیں۔

ان کا کلام تمام اہم جرائد میں شائع ہوتا ہے۔ تاثراتی تنقید اور تحقیق سے بھی شغف ہے۔ ان کے مضامین اور مقالات کا ایک مجموعہ "ہم سخن فہم ہیں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ انہوں نے میر تقی میر سے خود اپنے یعنی اعزاز احمد آذر تک 225 شعراء کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ (ہر شاعر کی دو غزلیں) جو "منتخب یادگار غزلیں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ علاوہ اس کے ان کے اردو کلام کا مجموعہ دھیان کی سیڑھیاں (نظمیں غزلیں) اور "محبت مشغلہ تھی" (نظمیں) پنجابی مجموعہ کلام "موسم سی برساتاں دا" (نظمیں غزلیں) اور بچوں کے لئے نظمیں اور گیت "تتلی پھول اور چاند" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

آذر اپنی شاعری کے حوالے سے رومانویت اور محبت کے صنم تراش بھی ہیں مگر قوت ارادی کے حوالے سے چٹان جیسے مسائل سے ٹکرا کر اسے پاش پاش کرنا بھی جانتے ہیں۔ اپنے اسی عزم کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے لاء کا امتحان دینا تھا۔ ان برسوں میں اوسط" نتیجہ 6/7 فیصد رہتا تھا چنانچہ یہ سوچ کر کہ جہاں سو میں سے 93 لوگ فیل ہو جاتے ہیں، میں امتحان دے کر کیا تیر مار لوں گا۔ داخلہ فیس بھجوانے کی آخری تاریخ جوں جوں قریب آتی جا رہی تھی۔ یہ سوچ پختہ تر ہوتی جا رہی تھی کہ مجھے امتحان نہیں دینا چاہئے مگر ساتھ یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ گھر والوں کو کیا جواز پیش کروں گا۔ ہر لمحہ یہی سوچ حاوی رہتی کہ 93 فیل سات پاس۔ کیوں امتحان دیا جائے۔ آخری شب جب اگلی صبح فیس داخلہ جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی میری پریشانی، تذبذب اور ذہنی کشمکش اپنے عروج پر تھی۔ نیند کا دور دور نام و نشان نہ تھا۔ کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ رات کا شاید پچھلا پہر تھا کہ جیسے ذہن میں بجلی کا کوندا لپکا۔ ایک آواز دل کے نہ جانے کون سے گوشے سے ابھری۔ "ارے خدا کے بندے تو جب بھی سوچتا ہے خود کو 93 لوگوں میں شمار کر کے سوچتا ہے۔ آخر ان سات لوگوں میں خود کو کیوں شمار نہیں کرتا جو پاس ہوتے ہیں۔ اگلے ہی لمحے یوں لگا جیسے میری ساری توانائیاں واپس میرے جسم میں آگئی ہیں۔ پتہ نہیں کب آنکھ لگی، جو نیند آگئی کمال پر سکون تھی۔ اگلی صبح جاگا تو طبیعت کا عجیب رنگ تھا۔ کالج جا کے فیس داخلہ جمع کروائی پھر امتحان بھی دے دیا اور بہت اعلیٰ سیکنڈ کلاس میں قانون کا امتحان پاس کر لیا۔

آذر پر شعریوں بھی وارد ہوتے ہیں۔ کہہ رہے تھے..... "میرے والد صاحب 1982ء میں بستر مرگ پر تھے۔ ہسپتال میں میرا زیادہ وقت انہی کے پاس بسر ہوتا تھا۔ کچھ ان کو بھی میرے قریب رہنے سے زیادہ اطمینان رہتا تھا۔ ہم سب بھائیوں کا زیادہ تر وقت جاگتے ہوئے گزرتا تھا۔ رات کو عموماً" میں اپنی کرسی والد صاحب کے بیڈ کے ساتھ بالکل جوڑ کے رکھتا تھا کہ اگر کبھی میری آنکھ لگ بھی جائے تو ذرا سی حرکت سے فوراً" کھل بھی جائے۔ ایک رات ان کی طبیعت قدرے بہتر تھی رات کا پچھلا پہر تھا۔ وہ چت لیٹے تھے۔ پاؤں اس انداز میں سمیٹے تھے

کہ دونوں گھٹنے اوپر کو اٹھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب انہیں اونگھ آجاتی تو دایاں گھٹنا باہر کو جھکنے لگتا۔ یوں ایک جھٹکا سا لگتا اور وہ نیند سے چونک جاتے۔ میں نے نوٹ کیا کہ یوں وہ خاصے بے سکون ہو رہے تھے۔ مجھے معاً ایک ترکیب سوجھی' میں نے تھوڑا سا آگے جھک کر اپنا سر ان کے اس گھٹنے کے نیچے ٹکا دیا۔ پھر نہ مجھے خبر ہے' نہ انہیں پتہ کہ باقی ماندہ رات کب اور کیسے بسر ہوئی۔ میں نے شعوری طور پر محسوس کیا کہ میری اس رات کی وہ نیند ایسی سکون بخش تھی کہ جس پر یہ مصرعہ ہو گیا۔

رات یوں سویا ہوں جیسے عمر بھر سویا نہ تھا

آذر اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو زبان میں وسعت و اثر پذیری کا جو رجحان پایا جاتا ہے اور اس زبان میں دوسری زبانوں کے لفظ اپنے اندر سمو لینے کی جو بے پناہ فطری صلاحیت پائی جاتی ہے' اس کے پیش نظر مجھے تو اس کا مستقبل بہت محفوظ بلکہ روشن تر دکھائی دیتا ہے۔

آذر نظم بھی کہتے ہیں ور غزل بھی مگر نثری نظم کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں میں نے پوچھا کہ دور حاضر کے ادب کے لئے کہا جا رہا ہے کہ وہ بے اثر بنتا جا رہا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ بولے ضروری تو نہیں کہ ہر وہ بات جو کہی جا رہی ہے' اس کا سنجیدگی سے ہی نوٹس لیا جائے۔ کسی غیر ضروری بات کو غیر اہم جان کر نظر انداز کر دینا بھی ایک طرح سے "جواب دینے" کے مترادف ہی ہوتا ہے۔ ادب کل کا ہو یا آج کا....... اگر "ادب" ہے تو بے اثر ہو ہی نہیں سکتا۔

ہمارے اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ آپ نے مغرب سے تکنیک حاصل کرنے کی گنجائش اپنے سوال میں خود ہی نکال لی ہے..... سوال یہ ہے کہ ہم اردو غزل کی تکنیک مغرب سے کیسے سیکھیں گے۔ یہ تو صنف سخن ہی ان مغرب والوں کی نہیں ہے..... دوسری بات یہ کہ تخلیقی ادب میں فیشن پرستی کی گنجائش موجود ہی نہیں ہے۔ بطور فیشن کسی ادبی حوالے سے کسی رجحان کا اختیار کرنا کوئی ادبی خدمت نہیں ہے۔ "سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر" کو وسیع تر تناظر میں پیش نظر رکھنا ہی اپنی شناخت کا وسیلہ ہو سکتا ہے۔

در آمد شدہ ادبی فیشن لمحاتی قسم کی چیز تو ہو سکتے ہیں' دائمی اہمیت نہ کبھی ان چیزوں کو حاصل ہوئی ہے نہ ہو سکے گی۔ یہ ایک طویل بحث طلب بات ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال دیکھئے "سانیٹ" جو اردو شاعری میں در آمد کی گئی۔ کچھ لوگوں نے سانیٹ لکھی مگر بطور سانیٹ نہیں بلکہ بطور جدید نظم اس کو قبولیت بھی ملی اور مقبولیت بھی۔ بہر حال اصل اور یجنل اور خالص چیز کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

عکس فن

یہ چیزیں گم نہ ہو جائیں.........

تمہارے ریشمی آنچل میں کچھ باتیں لپیٹی تھیں
تمہارے پرس کے اس چھوٹے خانے میں مری سرگوشیوں نے گھر بنایا تھا
وہ سرما کی شبیں
گاڑی میں جو سنسان سڑکوں پر گزاری تھیں
وہ تم نے اپنی مٹھی میں سمیٹی تھیں
تمہارے گھر میں
ٹیلی فون والی میز کے نیچے
مرے ہاتھوں کی پوروں کا وہ اک رقص حیات آمیز رکھا تھا
وہ جس نے سلسلہ سانسوں کا خاصا تیز رکھا تھا
تمہارے ہاسٹل کے گیٹ کی الٹی طرف
گیراج تھا
اس میں
تمہارے لمس کے رنگین لمحے چھوڑ آیا تھا
بلاؤز کی ہکوں کے عین نیچے
کچھ نشاں چاہت کے رکھے تھے
بہت ممکن ہے یہ چیزیں تمہارے واسطے معمول کی بیکار چیزیں ہوں
مگر ان ساری چیزوں کی
کسی ان دیکھی ڈوری میں
مرے جیون کے سارے قیمتی لمحے بندھے ہیں، دھیان میں رکھنا
ذرا امکان میں رکھنا
تمہاری بے طرح مصروفیت کی بھیڑ میں
میرے یہ لمحے بھی نہ کھو جائیں
یہ چیزیں گم نہ ہو جائیں

؎ میری آبائی زمینوں پہ مرے بھائی رہے
میں تو بس میرؔ یا غالبؔ کی زمینوں میں رہا

مجید اختر
لاس اینجلس
۸ر نومبر ۹۶ء

Majeed Akhter
19625 Jacob Ave.
Cerritos CA 90703
U.S.A

مجید اختر
لاس اینجلس

مجید اختر کی شاعری کی عمر کچھ زیادہ نہیں لیکن ان کے کلام میں فکر کی تازگی اور امیجری کی حسن کاری نمایاں ہے۔ وہ لفظوں سے تصویریں اور تصویروں سے منظر بنانے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ان کا خاندانی نام عبدالمجید ہے اور قلمی نام مجید اختر۔ 1950ء میں کراچی میں پیدا ہوئے اور جامعہ کراچی سے ہی 1972ء میں اکنامکس میں ماسٹرز کی ڈگری لی۔ ابتدائی ملازمت یو بی ایل کراچی میں کی۔ اسی زمانے میں انہیں بینک کی جانب سے دبئی بھیج دیا گیا۔ مجید اختر کو یوں بھی سیاحت کا شوق ہے۔ پھر ملازمت اور کاروبار کے سلسلے میں خلیج، تھائی لینڈ، مشرقی افریقہ اور تائیوان میں گھومے اور وہاں کے کلچر اور زبان کو سمجھا۔ 1992ء سے لاس اینجلس میں مقیم ہیں لیکن کاروباری سلسلے میں اب بھی سفر درپیش ہوتا ہے۔ یہ سفر مجید کے کام بھی بہت آیا۔ دوران سفر کے تجربات نے ان کی شاعری اور فکر پر بھی خوشگوار اثرات مرتب کیے۔

مجید اختر کو شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری کی صنف سے بھی دلچسپی ہے۔ افسانے لکھیں یا نہ لکھیں مگر گفتگو میں تیکھے تیکھے افسانوی جملے ضرور استعمال کرتے ہیں۔ سنجیدہ شاعری کی طرف مائل نہ ہوتے تو مزاح گو ہوتے، اس کی گواہی وہ احباب دیں گے جو مجید اختر سے قریب ہیں اور قربتوں میں، ان کی فقرہ بازیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ کس مکتبہ ء فکر سے ان کی شاعری متاثر ہے تو بولے کہ ہر مکتبہ ء فکر کے اچھے شاعروں سے متاثر ہوں۔ لیجئے جھگڑا ہی ختم۔ کون اختلافات کو جنم دے، ہوا دے۔ اچھا ہوا مجید جلد ہی سیانے ہوگئے ورنہ ادبی تنازعات تو بڑے بڑوں کو لے ڈوبے ہیں۔

ہمارا اگلا سوال اردو کے مستقبل کے متعلق تھا۔ مجید اختر یورپ اور امریکہ میں اردو زبان کے مستقبل سے مایوس ہیں اور بات کسی حد تک درست بھی ہے۔ اپنے ملک پاکستان میں اگر لوگ اردو زبان کے مستقبل سے بہت پرامید نہیں تو بدیس میں اس زبان کا پرسان حال کوئی کیوں ہو گا۔

مجید اختر غزل بھی کہتے ہیں اور نظم سے بھی انہیں لگاؤ ہے۔ مگر نثری نظم کا میدان ان کے لئے کوئی دلچسپی پیدا نہیں کر سکا۔ ان کا کلام ہندوپاک کے معیاری جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ جیسے تخلیق، اوراق، فنون، انشاء، شاعر اور لاس اینجلس کے "پاکستان لنک" میں۔ مجید اختر نے ادھر کوئی تین سال قبل "ادبی سنگت" کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے، جس کے تحت انہوں نے کئی کامیاب مشاعرے منعقد کرائے۔ ادھر اپنی ذاتی مصروفیات کے باعث وہ عملی طور پر اتنے سرگرم نہیں لیکن یقین رکھتے ہیں کہ مشاعروں اور ادبی نشستوں سے شعراء اور ادب کی بھی خدمت ہوتی ہے۔ ویسے بھی مشاعرے ہماری تہذیب کا ایک خوبصورت حصہ ہیں۔ ان سے ہماری ذہنی تربیت بھی ہوتی ہے اور بلاشبہ بقول مجید وہ احباب قابل ستائش ہیں، جو خود زحمتیں اٹھا کر ان محفلوں کا اہتمام کرتے ہیں۔

ہمارے اگلے اس سوال کے جواب میں کہ دور حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے۔ مجید کہتے ہیں کہ علم کا تعلق عمل سے کٹ جائے تو منافقت کو راہ ملتی ہے۔ ویسے ادب کا تعلق عمل سے کٹنا کچھ ایسی عجیب بات بھی نہیں کیونکہ میرے نزدیک ادب کا عمل سے براہ راست تعلق بھی نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اردو ادب کا تعلق قاری سے تشویشناک حد تک کٹ گیا ہے۔ مجید اس سے بھی متفق نہیں کہ آج ہم مغرب کے رجحانات اور اس کے ادب کی پیروی کر کے وہاں کے ادبی فیشن اپنے ملک میں درآمد کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بیرونی حسیات سے ہمارا ادب براہ راست متاثر نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے باہر سے تکنیک لی ہے اور حسیات ہماری اپنی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ہائیکو کی مثال بالکل سامنے کی بات ہے۔

مجید سے ہم نے کہا کہ اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ سنایئے تو سنجیدہ ہو کر بولے کہ "دنیا اپنے رویے میں زیادہ سے زیادہ سخت گیر ہوتی جا رہی ہے۔ واقعات کی دلچسپی کا تو مجھے علم نہیں ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہر آنے والا لمحہ اپنے دامن میں زیادہ خطرے چھپائے ہوتا ہے اور پیش آنے والا ہر واقعہ زیادہ دل دکھانے والا ہوتا ہے۔

عکسِ فن

نظم

مجید اختر

عجیب سی اک یگانگت کا حسین منظر
جو ہم ہمیشہ ہی دیکھتے ہیں
کہ صبح تڑکے، تمام کاریں
ہر اک فری وے پہ ایک رخ میں،
رواں دواں ہیں

بجا کہ سمت سفر معین
مگر ذرا غور سے جو دیکھیں
تو ایک رستے پہ 'ایک رخ پر
تمام کاریں جو گامزن ہیں
ہر اک کی منزل جدا جدا ہے

میں سوچتا ہوں
دیار مغرب کے راستوں پہ رواں دواں
ان تمام کاروں کو
میرے پیارے وطن سے کتنی مماثلت ہے
کہ جب سفر میں تھے 'ایک تھے ہم
اور ایک رستے پہ 'ایک رخ پر
یگانگت سے رواں دواں تھے
اور آج، ہم پر بھی یہ کھلا ہے
کہ سب کی منزل جدا جدا ہے!

بے سہارا ہے آج جو اختر
وہ تو اپنے ہی مکان میں ہے
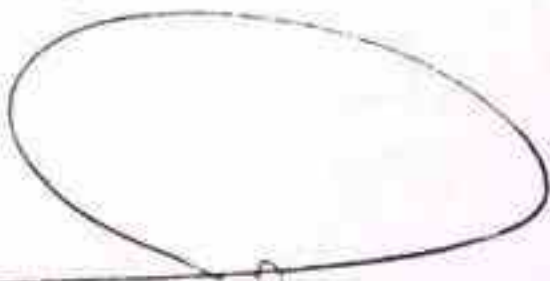
Humayun Akhter
46/1, 8 Commercil St
Phase- IV
Defence Housing Authority
Karachi, Pakistan

سید ہمایوں اختر

کراچی

ہمایوں اختر کی شاعری کے بارے میں صدر بزم نشور افضال صدیقی لکھتے ہیں کہ "فکر و احساس کے نہاں خانوں میں ہر جیتا جاگتا انسان ایک خانہ شاعری کے لئے بھی رکھتا ہے۔ چاہے مظاہر فطرت کے رنگ و آہنگ کی فطری شاعری ہو یا صدیوں کے سفر میں مہذب انسانوں نے اسے رقص، موسیقی، مصوری اور لفظ و بیاں کی سخن طرازی کے روپ سروپ میں ظاہر کیا ہو۔ بہر کیف یہ احساس جمال اور انبساط حسن و محبت کا کرشمہ ہے، جسے شاعری کی ارتقائی صورتوں نے عصر حاضر تک پہنچایا ہے۔ ہمایوں اختر کی شاعری کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔"

خود ہمایوں کا اپنے بارے میں کہنا ہے کہ "شاعری کو میں نے شروع میں صرف ایک مشغلہ کے طور پر اپنایا لیکن بعد میں احساس ہوا کہ اس میں طبیعت اور ماحول کا بڑا دخل ہے اور اس کے بغیر شاعری ممکن نہیں۔ میری اوائل شاعری میں، سنجیدگی سے زیادہ جذباتیت نمایاں تھی لیکن مطالعہ کی گہرائی کے ساتھ ساتھ جذباتیت کم اور سنجیدگی زیادہ نمایاں ہونے لگی۔ شاعری میں جہاں میرے اپنے ملک کے گرد و پیش کا اثر پڑا، وہاں بیرون ملک قیام کے دوران وہاں کے اثرات بھی میری شاعری میں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ رومانیت کا عنصر میری شاعری کے درمیانی دور میں بہت ملتا ہے، جس کی وجہ میری فطرت میں شاعرانہ مزاج کا وارد ہونا ہے۔ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت طریقے سے بیان کرنا ہی شاعری ہے۔ مجھے ہر اچھی اور خوبصورت چیز خوبصورت لگتی ہے مگر بدصورت یا خراب چیز کو بدصورت نہیں کہتا، اس لئے کہ میں ہر چیز کو مثبت انداز سے دیکھنے کا قائل ہوں۔"

میرا انداز فن انوکھا، نہ مجھ کو زعم سخن رہا ہے
یہ بانکپن میرے شعر و فن میں، ترے لبوں کی امانتیں ہیں

صدر شعبہء اردو جامعہ کراچی کے پروفیسر سحر انصاری نے بہت پیاری بات لکھی ہے کہ "ہمایوں کی شاعری ایک رخی نہیں۔ جب وہ ایک حساس فرد کی حیثیت سے اردگرد کی دنیا کو دیکھتے ہیں تو انہیں کشتیاں شیشے کی اور بادبان پتھر کے نظر آتے ہیں۔ دریچے پھول کے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ریت کے گھروندوں پر بھی پتھر کے سائبان ہیں۔ نزاکت احساس کو جب اس نوع کی پتھریلی صداقتوں کا سامنا ہو تو ایسی ہی شاعری معرض تخلیق میں آتی ہے، جیسی ہمایوں اختر کے مجموعے "ساگر جیسی آنکھیں" میں ہے۔"

ہمایوں ابتداء میں ساحر لدھیانوی، جذبی اور مجاز سے متاثر رہے ہیں۔ ان شعراء کا بڑا کلام انہیں ازبر تھا۔ ممکن ہے کہ ہمایوں کے کلام میں ان شعراء کی جھلک ملے۔ غزلوں میں انہیں جگر اور نظموں میں جوش بے حد پسند ہیں۔ دور جدید کے شعراء میں احمد ندیم قاسمی کے کلام کو سراہتے ہیں۔ ہمایوں اختر کا کلام فنون، سیپ، جام نو، الشجاع، رابطہ، جنگ اور اخبار جہاں کے علاوہ ہندوستان کے شمع اور بیسویں صدی دہلی میں بھی شائع ہوتا رہتا ہے۔

ریڈیو پر ان کی غزلیں اور قومی نغمے نسیم شاہین، کوکب جہاں اور ظفر علی نے گائی ہیں۔

ملازمت کے سلسلے میں اکثر نقل مکانی کرتے رہے ہیں، جس کی وجہ سے ہمایوں کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا، جو ایک تہائی بچ گیا، وہ اب ان کے مجموعے میں شامل ہے۔

میں نے ہمایوں اختر سے پوچھا کہ کیا آج ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے؟ جواب میں انہوں نے تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "آج نہ صرف ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے بلکہ آج کا ادب واقعی ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے اور اس کی وجہ اور ہے کہ ہمارے معاشرے میں ادب تخلیق کرنے والے خود تضاد کا شکار ہیں۔ جو باتیں ان کی اپنی تحریروں میں ہوتی ہیں، وہ خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ جو بھی سچائی ہمارے معاشرے کی ادب میں بطور تحریر بیان کی جاتی ہے، لکھنے والا اس کی مختلف سمت چلتا دکھائی دیتا ہے۔ قول اور فکر کا یہ تضاد سوائے منافقت کے اور کچھ نہیں۔ ادب ہو یا شاعر لکھتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کا اثر قاری پر وہ اثر نہیں ڈالتا جو ہونا چاہئے۔ وجہ یہ ہے کہ آج کا قاری صرف ادب کو پڑھتا ہی نہیں ہے بلکہ سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ادیب یا ادب تخلیق کرنے والا ایک دوہری شخصیت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے تو وہ ذہن میں مختلف تاثر قائم کرتا ہے اور اس کا اطلاق ادب کے علاوہ ہماری زندگی کے دوسروں شعبوں پر ہوتا ہے۔ جیسے سیاست چونکہ ہر دور میں ادب سیاست اور سماجی حالات سے متاثر رہا ہے۔ اس لئے آج بھی وہی صورتحال سامنے ہے۔"

سید ہمایوں اختر اپریل 1941ء میں بہار کے شہر پٹنہ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ لکھنے کا آغاز سولہ سال کی عمر سے کیا۔ پہلے بچوں کی نظمیں لکھیں پھر کچھ عرصہ بعد کراچی کے روزنامہ ''انجام'' میں بچوں کا صفحہ ترتیب دیتے رہے۔ ایک سال بعد مختلف اخبارات میں سب ایڈیٹر کے طور پر کام کرنے لگے۔ مگر جب دیکھا کہ صحافت میں برسوں قلم گھسنے کے بعد نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہتا ہے تو صحافت چھوڑ کر بینک میں نوکری کرلی۔ (اور میرے خیال میں ہمایوں نے اپنی زندگی میں یہی ایک عقل کا کام کیا) یوں وہ ایم اے اکنامکس ہو کر بینک سے وابستہ ہوگئے۔ آج وہ نیشنل بینک آف پاکستان میں سینئر وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔

زندگی کی جدوجہد میں ہمایوں نے بھرپور حصہ لیا۔ ملازمت انہیں طشتری میں رکھی نہیں مل گئی۔ کامرس میں گریجویشن کے بعد دو سال فارغ رہے۔ ادھر ادھر کی ملازمت، تعلیم کا حصول اور شاعری۔ یوں تین محاذوں پر لڑتے رہے۔ للذا شاعری صرف مشغلہ بنی رہی۔ ملازمت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے شاعری بہت کم کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھنے کی رفتار سست رہی۔ اب جاکر ان کا ایک مجموعہ ء کلام ''ساگر جیسی آنکھیں'' سامنے آیا ہے، جس میں جمیل الدین عالی لکھتے ہیں کہ ''ہمایوں اختر نے آج کے ہجوم میں بھی اپنی شناخت قائم رکھی ہے۔'' شعر ملاحظہ ہو۔۔

مجھ کو اس کی برہمی کا اتنا اندازہ نہ تھا
میرے جیسا شخص تھا وہ کوئی شہزادہ نہ تھا

حق تو شہزادوں کو بھی نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے جیسے ایک شخص پر لفظ کی سنگ باری کریں مگر ''لیس باس'' کا دور پہلے بھی رہا اور آج بھی ہے اور مزاج شناسی کا ہنر کرنا بھی آسان نہیں مگر ہمایوں نے تعلیم صرف حاصل نہیں کی، اسے برتا بھی یوں ان کی شاعری کی رفتار سست رہی مگر انہوں نے نقد و میزان کی پرواہ کئے بغیر ادب کے ایک گوشے میں شاعری کا دیا جلائے رکھا۔ ان کے بارے میں شکیل عادل زادہ کہتے ہیں کہ ''اس نے اس شہر ناہنجار میں زندگی سازی کی مہم جوئی کے باوجود شاعری کی شائستگی کے لئے وقت چرالیا۔''

زبردستی کی شاعری ہمایوں اختر کا مزاج نہیں مگر صرف شاعری ہی ان کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس لئے ادب کی اسی صنف پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ شاعری میں کسی خاص مکتبہ ء فکر سے متاثر نہیں، جو بات ان کے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہے، اسے سہل انداز میں بیان کردیتے ہیں۔ خود کہتے ہیں۔۔

عکسِ فن

غزل

ہم زمانے بھر میں جن کو ہم سفر کہتے رہے
لوگ ایسے ہم سخن کو کم نظر کہتے رہے

جن کو کہنے سے گریزاں ہیں لبوں کی جنبشیں
ہم وہی باتیں بہ انداز دگر کہتے رہے

جن سے عریاں ہوگئی ہیں جسم و جاں کی نکہتیں
دیکھنے والے انہیں داغ جگر کہتے رہے

ہم چلے ہیں پھر بڑے انداز سے اس راہ پر
لوگ جن راہوں کو اکثر پرخطر کہتے رہے

جس کے جھونکوں نے مٹا ڈالیں چمن کی رونقیں
کہنے والے کیوں اسے باد سحر کہتے رہے

ہم کو اندازہ ہے اپنی کامیابی کا مگر
یہ تو ان کا ظرف ہے جو بے ہنر کہتے رہے

ہم نے فسانے دیدۂ تر میں رقم کیے
پہونچا جہاں جہاں دلِ مضطر لیے ہوئے

سلطانہ ذاکر ادا نقوی
۲۳- اکتوبر ۱۹۹۷ء

Sultana Ada Naqvi
5210 Cutter Lane
E1 Sobrante, CA-94803
U.S.A

سلطانہ ذاکر ادا نقوی

سان فرانسسکو

سلطانہ ذاکر ادا نقوی کا کلام میں گاہے گاہے "پاکستان لنک" میں پڑھتی رہتی تھی۔ "پاکستان لنک" لاس اینجلس سے شائع ہونے والا انگریزی ہفت روزہ ہے۔ مگر اس میں اردو کے بھی تقریباً" بارہ یا سولہ صفحات شائع ہوتے ہیں۔ اس انگریزی ہفت روزہ کی ابتدا فیض رحمان نے کی تھی اور اپنی دن رات کی کڑی محنت سے اسے مقبول بنادیا۔ پھر فیض کے والد محترم رحمان صدیقی جب پاکستان سے اپنے دوسرے صاحبزادگان کے ساتھ آئے تو اردو صفحات کی ابتدا ہوئی اور آج یہ بڑا کامیاب ہفت روزہ کہلاتا ہے۔

گفتگو ہو رہی تھی سلطانہ ذاکر ادا کی جو یکم ستمبر 1929ء میں رام پور میں پیدا ہوئیں۔ پورا نام مصطفیٰ سلطانہ ہے۔ شادی کے بعد ذاکر کا اضافہ ہوا۔ ادا ان کا تخلص ہے۔ انہوں نے کہیں سے بی اے، ایم اے کی ڈگری نہیں لی لیکن اس زمانے کی گھریلو تعلیم حاصل کرنے والے لوگ آج کے بی اے، ایم اے سے بہتر تعلیم یافتہ ہیں کیونکہ انہیں ہر ہر قدم پر تعلیم کا استعمال سکھایا جاتا تھا۔ اس تعلیم کے نقوش زندگی کے ہر پہلو پر ثبت ہوجاتے تھے۔ سلطانہ بتاتی ہیں کہ ان کی والدہ صاحبہ مرحومہ نے انہیں اردو فارسی اور عربی پڑھائی۔ بیت بازی کے ذریعے ان میں اردو شاعری کا شوق پیدا کیا۔ بچپن سے ہی انہیں لاتعداد اشعار ازبر ہونا شروع ہوگئے۔ سوز خوانی کی مشق ان کے والد مرحوم خورشید علی مرزا صاحب کراتے تھے۔ کبھی کبھی رام پور کے سوز خواں ہادی علی چچا آجاتے تھے۔ اکثر شام میں چچا نواب علی مرزا اور ماموں سوز خواں عابد صاحب آکر روزمرہ سبق دہراتے۔ بیت بازی کے لئے والدہ پہلا شعر دیتیں۔۔۔

میم منم میم، زلف زنجیر خانہ الف بے

بے دو ہزار، لام، میم اور تین ہزار تے

اس کے بعد جوابی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ والدہ اپنے بچپن کے قصے سناتیں کہ کس طرح وہ ٹھیکری سے زمین کے کچے فرش پر لکھتیں اور نانا مرحوم کے آنے سے پہلے فرش پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے جھاڑو لگادی جاتی جبکہ رام پور میں مرد شاعر حضرات بہت تھے۔ سحر رام پوری، صابر اور خود نواب رام پور اور ان کی بیگم جو عصمت تخلص کرتی تھیں۔ رام پور اس وقت ایک خود مختار ریاست تھی۔ سلطانہ کے دادا مرحوم محمد علی خان عرف ننھے مرزا جنہیں خان بہادری کا خطاب ملا تھا معہ عزیز و اقارب رام پور آکر بس گئے تھے۔ کچھ اقارب آگرہ، دہلی اور مراد آباد جا کر بس گئے۔ ان کی ننھیال بھی رام پور آکر بس گئی۔ نواب رضا علی خان مرحوم کے زمانے سے اسکول و کالج کا قیام عمل میں آیا۔ 1934ء میں ان سے نو سال بڑی بہن کی شادی سید اعجاز حسین ضامن سے ہوئی، جو خاموش فلموں کے کہانی نویس تھے۔ بہن کی شادی کے بعد رام پور کی رضا لائبریری سے سلطانہ کو بھی مطالعہ کے لئے کتابیں ملنے لگیں۔ یہیں سے انہوں نے غالب کے خطوط، فسانہ لندن، کلام اقبال قصہ چہار درویش اور ہزار داستان پڑھ کر دنیا کی سیر کی۔ کتابیں پہلے والدہ پڑھتی تھیں پھر انہیں ملتی تھیں۔ شعراء میں میر انیس، دبیر، رباب لکھنؤی اور فضل لکھنؤی کو پڑھا۔ 1944ء میں ڈاکٹر میجر امتیاز حسن نقوی کے صاحبزادہ کیپٹن ذاکر حسین (مرحوم) سے شادی ہوئی۔ میجر امتیاز نواب رام پور کے خاص ڈاکٹر تھے۔ سلطانہ کے والد نواب صاحب کے ہاں منصرم امام باڑہ تھے۔ سلطانہ بتاتی ہیں کہ رضا لائبریری ایشیاء میں نمبر 2 کہلاتی تھی۔ اس لائبریری میں ہر زبان کی کتاب ترجمہ کر کے رکھوائی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ادب کے شائقین فیض یاب ہوتے تھے۔ سلطانہ نے بتایا کہ رام پور میں ہر سال ایک بڑا مشاعرہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں میوزک کانفرنس اور نمائش بھی ہوتی تھی۔ مشاعرے کی نظامت ضامن صاحب کرتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے پردے کی سخت پابندی میں، جوش ملیح آبادی کی ایک جھلک دیکھی تھی۔

شادی کے بعد سلطانہ نے اپنی والدہ کی سکھائی گئی ہنر مندی سے سسرالیوں کا دل جیت لیا۔ پابندیاں نرم ہوئیں۔ شادی کے دو ماہ بعد شوہر مڈ ایسٹ چلے گئے۔ جنگ جاری تھی۔ 46ء میں آرمی واپس آئی اور پھر میاں کے تبادلے ہوتے رہے۔ تقسیم کے بعد یہ پاکستان آگئیں۔ یہاں کراچی کے ڈائجسٹ "آنچل" اور "نئے افق" میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ ہلال نقوی کے سہ ماہی رسالہ میں بھی ان کا کلام شائع ہوا ہے۔ تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب "معراج وفا" شائع ہوئی، جس کا دوسرا حصہ بھی جلد مکمل ہو جائے گا۔ سفر نامہ اور کلام کا مجموعہ بھی مرتب کر رہی ہیں۔ کہتی ہیں انیس، مونس اور دبیر کو پڑھ کر ہی فکر میں پختگی آئی اور رشتے، غم، ہجرت، مشکل اور صبر کے معانی سمجھ میں آئے۔ غالب اور اقبال

نے زندگی برتنے کا ہنر دیا۔ استادی کا شرف دو سال کے لئے جناب ضامن مرحوم ہی سے حاصل ہوا۔

سلطانہ کا کہنا ہے کہ آزاد شاعری میں خیالات کا اظہار آسانی سے ہو سکتا ہے لیکن خود انہیں غزل کی صنف زیادہ پسند ہے۔ کہتی ہیں آج کے دور میں مشاعرے اور تخلیقی نشستیں دونوں ہی ضروری ہیں۔ ان سے ادب کی ترویج میں مدد ملتی ہے۔ اب جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے کہ یہ مغربی ممالک میں پھلے پھولے گی تو یہ توقع عبث ہے کیونکہ گھر جو بچے کی پہلی درس گاہ ہے یہاں ڈھائی تین سال کی عمر سے بچہ اپنا وقت ٹیچرز کے ساتھ گزارتا ہے۔ ماں باپ روزگار کے حصول میں مصروف ہوتے ہیں۔ بچے اسکول میں انگریزی بولتے ہیں۔ والدین گھر میں ان کے ساتھ انگریزی بولنے میں خوشی اور فخر محسوس کرتے ہیں اور یہ بھی سوچتے ہیں کہ بچے پر اردو کا اضافی بوجھ کیوں لادا جائے۔ اردو زبان انہیں کیا دے جائے گی؟ یہ ان کے مستقبل کی کامیابی اور روزگار کی ضامن نہیں۔

سلطانہ کہتی ہیں کہ "وقت کے ساتھ حالات میں تبدیلی آتی ہے۔ مغربی رجحانات سے متاثر ہو کر لکھنے والے ممکن ہے سوچ رہے ہوں کہ مغربی رجحانات کے بغیر ادب میں کامیابی ممکن نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں اپنی جڑوں سے کٹ کر نہیں رہنا چاہئے۔ اردو کے نفاذ کے لئے بھی ہمیں کوشش کرنی چاہئے تاکہ ہم تمام پاکستانی ایک آواز ہو کر امریکہ کے اسکولوں تک اپنا یہ پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ہم اپنے بچوں کے لئے اسکولوں میں ایک پیریڈ "اردو زبان" کا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کامیاب نہ ہوں۔ سفر ہے شرط، مسافر نواز بہترے۔ سو آیئے ہم اپنی جدوجہد کا آغاز کریں۔ کامیابی اللہ تعالیٰ ضرور عنایت کرے گا۔"
(آمین)

عکس فن

غزل

سلطانہ ذاکر ادا نقوی

ہم نے سمجھا تھا جنہیں دوست' وہ دشمن نکلے
اور جانا جنہیں ہمدم' وہی بدظن نکلے

ایسے حالات نے کھینچا تھا میرے گرد حصار
چشم ماضی کو جو کھولا بہت روزن نکلے

جو ہر ایک لمحہ رہے ساتھ مرے' میری طرح
وہ قریب رگ جاں بھی' تہہ دامن نکلے

رنج و غم جس کو سناتے رہے' اپنے دل کے
وہی بے درد مسیحا' بد باطن نکلے

لوٹ کے جاچکے جو' سارے خزینے میرے
جو نگہبان بنے تھے' وہی رہزن نکلے

بجلیاں کوند رہی ہیں' کہیں گلشن کے قریں
برق' جن پر تھی گری' سارے نشیمن نکلے

روشنی دور سے راہوں میں جو دیکھی تھی ادا
جب قریں آئے وفاؤں کے وہ مدفن نکلے

کون کس کی راہ میں حائل ہوا
بھیڑ میں یہ فیصلہ مشکل ہوا

Prof. Afaq Siddiqui
R-113, Sec A-16,
Bafarzone, North Karachi,
Karachi - 75850, Pakistan

محمد آفاق صدیقی

کراچی

آفاق صدیقی ایک منحنی سی مرنجان مرنج شخصیت کا نام نہیں ــــ بلکہ ایک انجمن کا نام ہے، ایک تہذیب کا اور ایک علمی ادارے کا کہ جو پچھلے پچاس برسوں پر محیط ہے۔ یعنی نصف صدی کا قصہ ہے۔ اس سال یعنی 1997ء میں پاکستان کی گولڈن جوبلی منائی جارہی ہے کہ ہمارے پیارے پاکستان نے اپنے وجود کی آزادی کے پچاس سال پورے کر لئے۔ اسی طرح آفاق صدیقی کی ادبی و علمی خدمات کی بھی گولڈن جوبلی کا سال ہے۔ چنانچہ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے بزم نشور نے 1997ء میں "جشن آفاق" منایا۔ جشن آفاق کے موقع پر شائع ہونے والے مجلہ کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ آفاق صدیقی، جنہیں "نشان اعتراف" دیا گیا، وہ تو مقبول ہیں ہی لیکن بزم نشور کے اراکین کی بے لوث خدمات کی وجہ سے اس کی بھی ایک مستند ساکھ ہے۔ پھر نیاز مندان کراچی کی جانب سے آفاق صدیقی کی خدمات کے اعتراف کے طور پر بزم کے سیکریٹری جنرل جناب رونق حیات اور پاکستان امریکن کلچرل سینٹر کی ڈائریکٹر کلچر محترمہ اسماء احمد کے تعاون سے ایک دھنک رنگ شام منائی گئی۔ اس موقع پر شائع کئے گئے مجلے میں آفاق صدیقی کی سوانح کو محفوظ کیا گیا ہے۔

میری آفاق صدیقی سے پہلی ملاقات مارچ 1965ء میں ہوئی تھی۔ جب انہوں نے مجھے سکھر میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں مدعو کیا تھا۔ یہ پاکستان میں 'میرا پہلا مشاعرہ تھا۔ پھر آفاق صاحب سے گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ 65ء میں میں نے انہیں جتنا صابر و شاکر اور شائستہ دیکھا تھا، 97ء میں بھی انہیں ویسا ہی پایا۔

ان کا پورا نام محمد آفاق صدیقی ہے۔ ضلع فرخ آباد ان کا آبائی وطن ہے۔ ایم اے،

ایم۔ او۔ ایل اور بی ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ سکھر، میرپور خاص اور کراچی کے ہائی اسکول اور پھر کالجوں میں درس و تدریس کے شعبے سے پچھلے پچاس برسوں سے وابستہ ہیں۔ شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری، تحقیق اور تنقید سے وابستگی ہے۔ ان کی شاعری ترقی پسند مکتب فکر سے متاثر رہی مگر کلاسیکی روایات اور اپنی تہذیبی اور ثقافتی قدریں انہیں بہرطور عزیز ہیں۔ اس لئے انہوں نے اندھی تقلید سے ہمیشہ گریز کیا۔ چنانچہ میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا آج ہم مغرب کے رجحانات اور اس کے ادب کی پیروی کر کے وہاں کے ادبی فیشن اپنے ملک میں در آمد کر رہے ہیں؟ آفاق نے کہا کہ یہ بات کہتے ہوئے ہمارے اکابرین ادب کو تنگ نظری اور کوتاہ بینی کا شکار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ دنیا اب ایک "گلوبل ویلج" کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ رجحانات چاہے مغربی ہوں یا مشرقی ان کی پیروی میں کوئی مضائقہ نہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ رجحانات و میلانات مثبت ہوں اور ہماری تہذیبی و ثقافتی روایات سے ان کا تصادم نہ ہو۔ اگر صرف ادبی فیشن کو جدت و ندرت سمجھ کر قبول کرلیا جائے اور اسے در آمد کر کے ہم اپنی اصل پونجی سے بے نیاز ہو جائیں تو خرابی کی بات ہے۔ بلاشبہ ہمیں مغرب سے ہنرمندانہ عناصر اپنانے میں فراخ دل ہونا چاہئے لیکن اپنے مسائل، اپنے معاشرتی و معاشی تقاضوں اور ماحول سے روگردانی روا نہیں اور بیرونی فیشن کی پیروی اگر سوچ سمجھ کر فکر و فن کی اعلیٰ قدروں کو برقرار رکھتے ہوئے کی جائے تو اچھا ادب بھی تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کسی بھی بیرونی فیشن کو اپنانے سے پہلے اپنے ادبی سرمایہ کو نظر میں رکھنا اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ شعور و آگہی کی روشنی میں بیرونی فیشن کی نوعیت، اس کے اثرات، اس کی قدر و قیمت اور اپنے ادب میں اس کی نشوونما کے امکانات پر غور و خوض کرلینا بھی ضروری ہے کیونکہ ادب میں بھیڑ چال سے کام نہیں چلتا۔

آفاق صدیقی اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مہذب دنیا میں اسے ماہرین کے اندازوں اور تجزیوں کے مطابق تمام ترقی یافتہ عالمی زبانوں میں اولیت کا درجہ حاصل ہوگا۔ (اردو زندہ باد) کارساز حقیقی ان تمام احباب کے حوصلوں میں اضافہ کرے جو اردو زبان و ادب کی خدمات کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح مشاعرے بھی ہمیشہ سے تخلیق ادب میں معاون رہے ہیں۔ اب تو مشاعرے ساری دنیا میں مقبول ہیں اور اس مقبولیت نے نئے تخلیق کاروں کے ذوق و شوق کو بڑھایا ہے۔ یوں چھوٹے پیمانے پر بھی تخلیقی نشستوں کی بھی بڑی اہمیت و افادیت ہے۔ البتہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ادب کی تخلیق کے سلسلے میں زیادہ بہتر کردار کس کا ہے کیونکہ تخلیق ادب کے محرکات مشاعروں اور نشستوں سے ماوراء بھی ہوتے ہیں۔

آفاق کو اظہار خیال کے لئے غزل کا میدان پسند ہے کیونکہ ایک ہی شعر میں بڑی خوش

اسلوبی سے وہ تاثر پیدا کیا جا سکتا ہے جو کوزے میں دریا کا سماں دکھائے۔ ہاں مگر اس کے لئے بڑی خوش سلیقگی سے "جگر خون" کرنے کی ضرورت ہے۔

نثری نظم کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ تجربے تو ہوتے رہے ہیں مگر نثری نظم کے میدان میں ابھی تک کوئی عہد آفریں شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے پوچھا کہ دور حاضر میں کہا جا رہا ہے کہ ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے اور قاری سے اس کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ آفاق بولے کہ نہیں۔ یہ سوچ درست نہیں۔ ادب کا تعلق عمل سے ہرگز کٹ نہیں سکتا اگر ایسا ہوتا تو شعر و ادب کے تمام سوتے خشک ہونے لگتے جبکہ صورتحال یہ ہے کہ ہر صنف ادب میں نئے نئے تخلیقی تجربے ہو رہے ہیں۔ ہاں یہ درست کہ ادب اور قاری کا رشتہ یقیناً" پہلے جیسا نہیں لیکن یہ کہنا کہ " ادب ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے" درست نہیں۔ اثر آفرینی کا ایک بڑا ثبوت برقی ذرائع ابلاغ اور خصوصاً" ٹیلی ویژن سے ملتا ہے۔ یوں سنجیدہ حلقوں میں مطبوعہ ادب بھی پڑھا جاتا ہے۔

اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات یاد کرتے ہوئے آفاق کہنے لگے کہ ویسے تو کئی واقعات ہیں مگر ادبی حیثیت سے کہوں تو یہ میرے بچپن کی بات ہے کہ "میں نے ایک دن والد صاحب کے پاس ایک بہت ہی ڈراؤنی سی شکل و صورت اور گھنے گھنے لمبے بال بکھرائے ہوئے، سیاہ ڈاڑھی مونچھوں والے ایک شخص کو دیکھا تو الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ پھر جب اسی شخص کو مشاعرے میں بڑی من موہنی آواز کا جادو جگاتے دیکھا اور ان کا کلام سنا تو ایسا لگا جیسے وہ شخص انتہائی پر کشش ہو۔ جی ہاں وہ حضرت جگر مراد آبادی تھے، جن کے اشعار کی مسحور کن کیفیت نے مجھے شعر و شاعری کی جانب راغب کیا۔"

آفاق کی زبانی جگر صاحب مرحوم کی آواز کے متعلق دلربا الفاظ سن کر مجھے قتیل شفائی کا یہ شعر یاد آگیا۔

اس ایک شخص میں تھیں دلربائیاں کیا کیا
ہزار لوگ ملیں گے مگر کہاں وہ شخص!

میں تو جگر مرحوم کو کبھی کسی مشاعرے میں نہ سن سکی لیکن اس شہر کراچی میں ایک محترم شخصیت ہے۔ نام ہے لطف اللہ خان صاحب۔ وہ خود ادب کے قیدی ہیں، اس لئے شعراء اور دیگر مقتدر ہستیوں کی آوازوں کو انہوں نے قید کر رکھا ہے اور انہیں ایک نادر لائبریری میں آڈیو کیسٹوں میں سجا رکھا ہے۔ یقیناً" ان میں جگر صاحب کی بھی پر سوز آواز ہوگی۔

آفاق صدیقی کے اب تک پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔

1- بڑھائے جا ابھی قدم (قومی اور ملی نغمے)

2- صاحب سراپا (مجموعہ کلام)
3- کوثر و تسنیم (حمد، نعت، منقبت)
4- سرلطیف (گیت)
5- ریزہ ء جاں (مجموعہ ء کلام)

عکس فن

غزل

دشواریوں کو اور بھی دشوار دیکھ کر
حیرت زدہ ہوں وقت کی رفتار دیکھ کر

جھوٹی مسرتوں کے خریدار دیکھ کر
دم گھٹ رہا ہے گرمی ء بازار دیکھ کر

یہ کیا خبر تھی شعلہ فشاں ہے تری گلی
ہم آگئے تھے سایہ ء دیوار دیکھ کر

کیسے کہوں کہ خواب میں عالم تھا خواب کا
کھولی تھی آنکھ صبح کے آثار دیکھ کر

اپنا خلوص عشق بھی مشکوک ہوگیا
ہر بوالہوس کو تیرا طلبگار دیکھ کر

ان جلوتوں میں میری طرف پیار سے نہ دیکھ
جلتے ہیں تیرے حاشیہ بردار دیکھ کر

آفاق ان سے داد وفا اور کیا ملے
ہیں مجھ پہ خندہ زن مرے غم خوار دیکھ کر

سپنے ہرن کی چوکڑی سکھ پونم کی اک رات
سپنے کس کے میت ہوئے ہیں اُس کا کتنا ساتھ

اسد محمد خان
۲۰/ دسمبر ۹۷

Asad Mohd. Khan
A8-F, Sector X-6
Gulsan-e- Maymar
Karachi, Pakistan

اسد محمد خان

کراچی

عجیب مست مولا آدمی ہے یہ اسد محمد خان۔ ذرا بھی تو دنیا داری نہیں اس میں۔ اس وقت میرے سامنے اسد کی دو کتابیں رکھی ہیں۔ "برج خموشاں" (افسانوں کا مجموعہ) اور "رکے ہوئے ساون" (گیتوں کا مجموعہ) اور دونوں میں کسی پر بڑے ادیب یا شاعر کے دو لفظ بھی نہیں لکھے ہوئے۔ لگتا ہے اسد کو اس کی ضرورت بھی نہیں کہ وہ دنیا داری کی حدوں سے آگے نکل چکے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کو تو ہمیں خود ڈھونڈ نکالنا ہو گا۔ وہ نہ بھی ملیں تو کھوجنا ہو گا۔ ان تک پہنچنا ہو گا کہ ان کا لکھا ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ اسد کی شاعری میں گیتوں کا جو حصہ ہے' وہ دیگر شعراء کے ہاں کم کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ایک نگار صہبائی مجھے ملے' جنھوں نے گیتوں کو زندگی بخشی اور ان کے روپ رنگ میں اضافہ کیا۔ ان کا تعارف بھی اس کتاب میں انشاء اللہ شامل ہو گا۔ اس وقت تو ہم اسد محمد خان کی انجمن میں ہیں اور ان سے گفتگو سے پہلے کچھ ان کے بارے میں' میں عرض کردوں۔

اسد محمد خان کے اجداد کا تعلق درہ ء خیبر کے قرب میں واقع علاقہ تیراہ سے تھا۔ وہ 1703ء میں مالوہ ہندوستان میں آئے۔ پہلی پٹھان ریاست بھوپال کی بنیاد رکھی۔ یہ ریاست برصغیر کی تقسیم تک قائم تھی۔ اسد کے پاس ان کے خاندان کا 21 واسطوں کا شجرہ موجود ہے۔ ان کے جد اعلیٰ ارباب محمود خان اور کرزئی سلطان محمود غزنوی کے سالاروں میں سے تھے۔ ان کے نانا کے والد نواب یار محمد خان شوکت' اسد اللہ خان غالب کے بالواسطہ شاگرد تھے۔ یہ یار محمد خان نواب فوجدار محمد خان کے بیٹے تھے' جن کے اثاثے میں دیوان غالب کا وہ قلمی نسخہ ہے جسے "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسد کی پرنانی حسن آرا بیگم جو نمکین تخلص

کرتی تھیں اور مکہ والی بی بی کے نام سے مشہور تھیں' آج کے معیارات سے بھی اچھی خاصی شاعرہ تھیں۔ اس دور کے گلدستوں میں ان کا کلام چھپتا تھا۔ اس شاندار پس منظر کے باوجود اسد نے اپنی پہچان خود بنائی۔

اسد محمد خان 26 ستمبر1932ء کو بھوپال کے آبائی مکان میں پیدا ہوئے۔ شاہ جہانی ماڈل ہائی اسکول بھوپال سے میٹرک کیا۔ جے جے اسکول آف آرٹ کا فری ہینڈ ڈرائنگ کا انٹرمیڈیٹ سرٹیفکیٹ کیا۔ حمیدیہ کالج بھوپال سے انٹر سائنس میں پڑھا اور درمیان میں 1950ء میں پاکستان آگئے۔ یہاں مختلف کالجز اور جامعہ کراچی سے ایم اے (انگریزی) کا پہلا سال مکمل کیا مگر کچھ ناسازی حالات کی وجہ سے امتحان نہ دیا۔ ایل ایل بی بھی نامکمل رہ گیا۔ دوران تعلیم چار اساتذہ کی تعلیم اور تربیت کی ان کی شخصیت پر گہری چھاپ ہے۔ ایک مولوی وقار الحق مرحوم' جنھوں نے پہلی کلاس میں سکھایا کہ جھوٹ نہ بولا جائے اور کم زور کو بے وجہ نہ دبایا جائے۔ دوسرے دیبی پرشاد مرحوم (کہا جاتا ہے کہ مرنے سے دو سال قبل انہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا) جنھوں نے ذاتی صفائی ستھرائی کی تعلیم پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ "سڑک پر کھانا پینا بھلے لوگوں کو زیب نہیں دیتا" تیسرے پروفیسر مولوی عبدالخالق مرحوم جو مفتی اور جید عالم تھے۔ انہوں نے اسد کو اردو سکھائی اور اسد کی ادبی صلاحیتوں کو پرکھتے ہوئے ان کے والد سے کہا کہ بچے کو رسالہ نگار' لگوا دو اور طلسم ہوشربا کی سب جلدیں پڑھنے دو۔ چوتھے استاد پروفیسر حسنین کاظمی صاحب ہیں۔ ان کا ٹی وی پروگرام "تفہیم القرآن" بے شمار اہل وطن کے لئے بصیرت و علم کا خزینہ ہے۔ انہوں نے بھی بہت کچھ سکھایا مگر اسد کہتے ہیں کہ دو باتوں کی ایسی تعلیم کی' جن سے چھوٹوں اور ہم چشموں میں میرا اعتبار قائم ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنے چھوٹوں پر کس طرح شفقت کی جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ معلوم نہ ہو تو کس طرح "بے خوفی کے ساتھ" "مجھے نہیں معلوم" کہا جاتا ہے اور پھر معلوم کرنے کی تگ و دو کی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا پیراگراف ہی اسد کی زندگی کے یادگار واقعات اور سرمایہء حیات بھی ہیں۔ یہ اسد کے اساتذہ کی دین ہے کہ آج اسد محمد خان اردو ادب اور اپنے معاشرے کی ایک معتبر شخصیت ہیں۔ زندگی کی جدوجہد میں بھی انہوں نے بھرپور حصہ لیا۔ بحیثیت کمرشل آرٹسٹ کلرک ریلوے میں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر' انگریزی کے استاد' ریڈیو میں نیوز ریڈر اور ٹرانسلیٹر اور کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ٹریفک ڈپارٹمنٹ میں خدمات انجام دینے کے بعد 3/ ستمبر 1992ء کو باعزت ریٹائر ہوئے۔ برسوں ٹیلی ویژن' ریڈیو اور فکشن کے رسائل کے لئے سیدھی سرل کہانیاں لکھ کر روزی کمائی۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی یہی ذریعہء روزگار ہے۔ اللہ نے سبھی نعمتوں سے نوازا ہے۔ نیک اور ہمدرد شریک حیات اور فرمانبردار اولاد

سب اپنے گھروں میں آباد ہیں۔
ادب کے میدان میں اسد کا اب تک کا سرمایہ ان کی بالترتیب کتابیں کھڑکی بھر آسمان (نظمیں کہانیاں) برج خموشاں (کہانیاں) رکے ہوئے ساون (گیت) درج ذیل E-Mail پر بھی دستیاب ہیں۔ (Fazlee. Tarique. Khi. SDNPK. UNDP ORG) چوتھی کتاب "غصے کی نئی فصل" (کہانیاں) رسالہ "آج" کے اجمل کمال نے چھاپی ہے جو درج ذیل E-Mail اور Internet پر موجود ہیں۔ AAJ QBIR 4Nl, ERUM.PK
E-MAIL:-
INTERNET:- HTTP: // WWW. PAK DATA . COM / AAJ اس کے علاوہ اردو زبان کا پہلا جریدہ "آج" بھی موجود ہے۔ اردو کی ترویج کے لئے فورٹ ولیم کالج کے بعد یہ دوسرا اہم قدم ہے۔
اسد کسی طے شدہ مکتبہء فکر سے وابستہ نہیں۔ متقدمین سے لے کر نو عمر ادیبوں شاعروں کو پڑھتے ہیں اور ان سے بھی سیکھنے کی امنگ رکھتے ہیں۔ آزاد لکھنوی اور عظمت اللہ خان کو لکھتا دیکھ کر گیت لکھے۔ بنگال کی معروف بحروں میں بھی گیت لکھے اور آزاد و نثری نظم کے انداز میں بھی۔
کہتے ہیں.... "مصوری کی تربیت کے دوران میں نے یہ سیکھا ہے اور میرا ایمان ہے کہ ہر مضمون اپنے میڈیم کا فیصلہ خود کرتا ہے۔ اس لئے اپنی مصوری کے زمانے میں، میں نے واٹر کلر میں سینری Oil Colours میں اسٹل لائف اور پورٹریٹ پینٹ کی۔ Crayon اور انک میں اسکیچ اور Caricature بنائے۔ پنسل سے Browsing کرتا رہا۔ یعنی سبجکٹ کی مناسبت سے اوزار بدلتا رہا۔ میری لکھت کا بھی یہی حال ہے۔ جب "باسودے کی مریم" کا احوال سنانا تھا تو جمی ہوئی کردار نگاری سے کام لے کر رواں بیانیے میں کہانی لکھی۔ سال 66 یا 67 کے دوران آج کی زبان میں Ecology پر یعنی ماحولیات کے تحفظ میں کہانی لکھی۔ عنوان "سوروں کے حق میں ایک کہانی" تو اس کا انداز مجرد اور Symbolic تھا۔
میں اولڈ ٹائمر Rudyard Kipling کو بھی اسی چاہت سے پڑھتا اور ترجمہ کرتا ہوں، جس سے ہم عصر ادیب Julien Barnes کو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہومر کے رمزیہ بیانیے سے لے کر فرانز کافکا کے گہرے علامتی رمزیہ اظہار تک سبھی کچھ آج کے اور ہر دور کے قاری کے لئے ہے۔ سب سے بہرہ مند ہونا ہر پڑھنے والے کا حق ہے۔ میرے خیال سے ادب میں حلال و حرام Kosher اور Taboo کی پابندی ظالمانہ بات ہوگی۔ جس طرح کوئی لکھنا چاہتا ہے، اسے لکھنے دیا جائے۔ کوئی بھی باشعور آدمی (پورنوگرافی سمیت) جو بھی پڑھنا چاہتا ہے اسے پڑھنے دیا جائے تو عین نوازش ہوگی۔ اسد کا کلام رسالے "نقوش" لاہور کے سوا ہر ادبی

پرچے میں شائع ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں بہت پرامید اور پرجوش ہوں کیونکہ اس میں پریم چند' عزیز احمد' منٹو' راجندر سنگھ بیدی' قرۃ العین حیدر ور نیر مسعود اور یوسفی وغیرہ جیسے نثر لکھنے والے پیدا ہوئے اور میر' غالب' نظیر' انیس' اقبال' فیض' فراق اور مدنی جیسے شاعر پیدا ہوئے۔ میں اس لئے بھی پرامید ہوں کہ اس بختاور زبان میں خود بھی کہانی لکھ کر زندہ رہنے کا جتن کر رہا ہوں۔ (یہ خود غرضانہ امنگ نہ ہو تو کوئی لکھنے والا ایک سطر بھی نہ لکھے' کوئی شاعر ایک مصرعہ بھی نہ کہے)

مگر عزیزو! ہمیں ابھی بہت فاصلہ طے کرنا ہے۔ سخت Localized مقامی اصناف سخن کا کولھو پیلتے ہوئے' جلسوں مشاعروں کی ضرورت پوری کرنے کو کہے گئے کلام سے بلند ہو کر ہمیں ادب و شعر میں کچھ بڑا کام کرنا ہو گا' اس لئے کہ سامنے ہومر کی رزمیہ داستانیں اور الف لیلہ اور کالی داس کے ناٹک' شیکسپیئر کی زندہ تمثیلیں موجود ہیں اور مشرق و مغرب کی معتبر زبانوں کے معرکتہ الارا کام ہیں۔ فرانسیسی' اطالوی' جرمن' فارسی' بنگلہ اور انگریزی جیسی زبانوں کے بے مثال خزینے موجود ہیں۔ ہم اپنی اردو زبان کی (ایک ہاتھ کی) انگلیوں پر گنی جانے والی ناولوں' چند افسانوں اور چند سولافانی اشعار کے ساتھ زبانوں کی برادری میں تقریباً "تہی دامن تو نہیں کھڑے ہونا چاہیں گے"۔

نثری نظم کے بارے میں اسد کہتے ہیں کہ شاعری کی ہر صنف اظہار خیال کے لئے بہترین ہے۔ نثری نظم اگر اچھی شاعری اور Content میں Rich ہے تو لاریب وہ بیان کا ایک موثر ذریعہ ہے اور وہ مستقبل کا میڈیم ہے۔ ورنہ ان سات کروڑ سے زیادہ اردو غزلوں کی طرح جو رام بابو سکسینہ کی پیدائش سے بھی چار سو برس پہلے سے آج کے دن تک ہر شہر اور قصبے کے ہر محلے میں کہی گئیں اور کہی جا رہی ہیں۔ یہ چند ہزار بے حیثیت نثری نظمیں بھی فالتو ہو جائیں گی اور آج نہیں تو کل قابل دست اندازی پولیس ٹھہریں گی۔

دیگر یہ کہ زندہ اور متحرک تحریر (نثر ہو یا نظم) مشاعرے اور جلسے میں پڑھی جائے یا مختصر نشستوں میں سامعین کے سپرد کی جائے یا لکھ کے مٹکے میں یا صندوق میں ڈال دی جائے اور سو برس بعد برآمد ہو تو بھی جائز اور مباح ہے۔ تحریر کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ سانس لیتی ہو' مردہ بچہ (Still Birth) نہ ہو۔

میرے اگلے سوال کے جواب میں اسد نے کہا کہ ادب زندگی سے بے تعلق یا بے رشتہ نہیں ہوا۔ ہاں ہمارے ہاں کم پڑھا جا رہا ہے کیونکہ ہماری خواندگی کی شرح برابر گر رہی ہے۔ مجید لاہوری مرحوم کے زمانے میں خواندگی 26 فیصد تھی۔ (ناخواندہ) آبادی کے اضافے نے یہ شرح اور بھی گرا دی۔ خدا جانے اب 18 فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں یا اس سے بھی کم۔ پڑھے لکھوں میں بھی اخبار اور ڈائجسٹ کتنے پڑھتے ہوں گے اور خالص ادب کتنوں کا ذوق ہو گا مگر

دنیا میں اور ہمسائے ہندوستان تک میں ایسا نہیں ہے۔ اردو کی کتاب 500 اور ہندی کم سے کم 5 ہزار چھپتی ہے۔ سندھی کی کتاب کم سے کم دو ہزار اور ہندی کی کم سے کم 5 ہزار۔ ادب کی اثر انگیزی کا یہ ہے کہ بوسنیا ہرزیگووینا کے شہریوں کو طاقتور سفاک اسلحہ گیروں نے بے تحاشا قتل کیا۔ دنیا بھر کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں نے اس سفاکی، اس ابتلا کو ریکارڈ کرتے ہوئے جلتے ہوئے شہروں میں جاکر احتجاج کیا اور مظلوموں سے اپنی وابستگی کا اعلان کیا۔ اس کا اثر ہوا۔ دیر سے سہی مگر قاتلوں کا محاسبہ ہو رہا ہے۔ ایک کم آمیز پرنس انسانوں کو بارود کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے بڑی دردمندی سے تحریک چلا رہی تھی اور اہم زبانوں کے اہم لوگ، ادیب، شاعر، موسیقار اس اچھے کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ عرض یہ ہے کہ ہم اردو والے شاید اتنے فعال نہ ہوں مگر دنیا ادب اور شعر سے تعمیر کا کام بھی لے رہی ہے اور یہاں ادب کی افادیت زیر بحث آتی ہے تو ضروری نہیں کہ ادب سے کوئی کام بھی لیا جائے۔ یہ خداوند کی طرح قائم بالذات ہے۔ اپنا مقصود آپ ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ یہ زندگی کو جو سفلی بھی ہے اور علوی بھی ہے بیان کرتا اور اجالتا ہے۔ اس سے کہیں بھی بے تعلق نہیں ہوتا۔

□ "ہمارے سینئرز کا خیال ہے کہ ...." میں نے پوچھنا چاہا تو اسد میری بات کاٹ کر بولے۔ معذرت چاہتا ہوں مگر مجھے سینئر اور جونیئر کی ترکیب سے اختلاف ہے۔ یہ قصبئے کی چوپال نہیں ہے، جو ہر قضیے میں سفید سر کی لاج رکھی جائے۔ دیگر یہ کہ کیا ہر بوڑھا آدمی لازماً "دانش مند ہوتا ہے؟

مغرب کے رجحانات کے بارے میں عرض ہے کہ مشرق ہو یا مغرب جہاں کچھ ٹھیک ٹھاک ہو رہا ہوگا اور جن کا جادو سر چڑھ کے بول رہا ہوگا، ان نیک بختوں کی پیروی تو ادبدا کے کی جائے گی۔ آدمی اپنی تاریخ میں اسی طرح Behave کرتا آیا ہے۔

جب ہند پر وسطی ایشیاء اور ایران والوں کا تسلط تھا اور سرکاری زبان فارسی تھی تو ہمارے شاعروں اور لکھنے والوں نے غزل اور قصیدے میں اظہار کی راہ ڈھونڈی۔ عوام کی زبان فارسی نہ ہوتے ہوئے بھی کل تک حضرت علامہ نے "پیروی ءفارس" میں فارسی زبان کے شعر لکھے۔ ہماری شاعری نے فارسی Idiom اور ممنوزم کو اپنایا۔ غزل میں ہم نے محبوب کو مرد بنا کے رکھا۔ یہ اس زمین کی روایت میں نہیں تھا، جہاں ہم بسے ہوئے تھے، جہاں پدماوت لکھی گئی تھی، جہاں کالی داس کے ناٹک اور امارو، تلسی اور میرابائی کے گیت لکھے گئے تھے۔ سوچئے ہم نے ہند کی سرزمین سے ایسا کیا لیا؟ ہم نے شاعری کا مروجہ فیشن درآمد کیا۔ ہم نے لکھا ہے سبزہ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا۔ لڑکوں وڑکوں سے یہ شغف ہند کی چیز نہیں تھی۔ تو عرض یہ کرنا ہے درآمدات کا کام پرانا ہے۔ ہماری غزل کی شاعری کے پھول

اور پرند تک در آمد کئے ہوئے ہیں۔ بلبل نہیں جناب! ہمارا پرند تو پپیہا اور کوئل ہے۔ گلاب ایران سے آیا تھا ہمارا پھول گیندا ہے۔ اس لئے اگر آج کچھ لوگ مغربی فیشن میں ادب میں کچی پکی در آمدات کر رہے ہیں تو بھی بھگتیں گے۔ انہی کے دیدے گھٹنوں کے آگے آئے گا۔ ویسے میرے خیال میں کسی سے بھی سیکھنا خوب ہے۔ اسکیمو لوگوں سے بھی سیکھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ کرہ ارض اتنی تنگ، چھوٹی سی جگہ ہے۔ یہ تو ہوگا اور دوستو! یہ زمین تو اب اور بھی سکڑتی جا رہی ہے..... میرا حوالہ Internet ہے۔

اسد محمد خان نے بڑے خوبصورت اور من موہن گیت لکھے ہیں۔ ان میں ایسی زبان استعمال کی ہے کہ گنگناؤ تو سارے وجود میں مٹھاس گھل جاتی ہے۔ انہوں نے عالمی ادب سے کوئی تین سو نظموں اور سو سے زیادہ نثری تحریروں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اسد محمد خان کو ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے حکومت پاکستان نے تو کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا نہ ہی کسی اور ادبی ادارے نے مگر یہ کیا کم ہے کہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں اردو ادب کی ایک طالبہ نے اسد محمد خان فن اور شخصیت کے عنوان سے 1992ء میں ایم اے کے لئے ایک تھیسس پیش کیا۔ یہ مقالہ یونیورسٹی سے اب کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔

ہندوستان کی جن دو تین درجن یونیورسٹیوں نے خود کو جامعہ ملیہ کے اردو ایم اے فائنل کے کورس سے Affiliate کیا ہے، ان میں 26 یا 27 سال سے پڑھائی جانے والی نصابی کتاب "نئی نظم کا سفر" میں ان کی ایک نظم شامل ہے۔ (مولف خلیل الرحمان)

محمد عمر میمن صاحب نے (U.S.A) Penguin کے لئے ان کی ایک کہانی "مئی دادا" کو انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ اوکسفوڈ یونیورسٹی پریس نے پچاس سالہ جشن آزادی پر پاکستان کی علاقائی اور قومی زبانوں کی کہانیوں کا ایک انتخاب Fires in an autumn garden کے نام سے کیا ہے، جس میں اسد کی ایک کہانی کا ترجمہ شامل ہے۔ شملہ کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانسڈ اسٹڈیز نے ان کی ایک کہانی "برج خموشاں" کا انگریزی ترجمہ چار برس پہلے شائع کیا تھا۔ اس طرح انگریزی کے علاوہ فرنچ اور جرمن میں بھی ان کی بعض تحریروں کے تراجم شائع ہوئے ہیں۔ ہندی، گجراتی، سندھی، مراٹھی زبانوں کے تراجم اس کے علاوہ ہیں۔

عکسِ فن

گیت

مرے بچھڑے میت ملا دو
مجھے اپنی ڈگر لگا دو

تم بھئے جگت کے گوالےؐ
تم بھئے امر اجیالےؐ

مری آن بان کے
دوجے دھیان کے

سارے بندھن ٹوٹے
مرے سارے بندھن ٹوٹے

مجھے اپنی اور بلا لو
مجھے اپنا داس بنا لو

تم بھئے جگت کے گوالےؐ
تم بھئے امر اجیالےؐ

اسلم کولسری

299 ۔ اپر مال لاہور

M. Aslam Koolsri
Markazi Urdu Board,
299 Uper Mall,
Lahore, Pakistan

محمد اسلم کولسری

لاہور

محیط میں کئی صدیوں پہ ہوگیا اسلم
کہ ریزہ ریزہ کیا ساعت سفر نے مجھے

بظاہر یہ شعر بس ایک شعر ہے مگر یہی تو ہے کہ بظاہر بھی یہ شعر بس ایک شعر نہیں معانی و مضامین سے بھرپور ایک کتاب کی مانند ہے اور ایسے کئی اشعار ہیں کہ جو نظروں سے اوجھل ہیں اور اس کے خالق کو اوجھل کئے ہوئے ہیں کیونکہ اس نے شعر تو کہا مگر شہرت کی خواہش نہیں کی، شاعری ہی کو محض ذریعہ عزت نہیں بنایا اور چپکے چپکے اپنے ذمے کے فرائض ادا کرتا چلا گیا۔ خاموشی سے زبان و ادب کی خدمت میں لگ گیا اور یوں ایک طویل سفر کر کے بھی تھکا نہیں۔ آج بھی جہاد میں مصروف ہے۔

یہ شخص جو واقعی ایک چھوٹا موٹا ادارہ بھی ہے اسلم کولسری ہے۔ یہ اس کا قلمی نام ہے۔ یکم اگست 1946ء کو پنجاب کی تحصیل و ضلع اوکاڑہ کے شہر کولسو میں پیدا ہونے والے محمد اسلم نے ابتداء ہی سے زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ تحصیل و ضلع ساہیوال سے ایف اے اور ملتان بورڈ سے بی اے پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اردو میں ایم اے کیا۔ میٹرک کے بعد ساری تعلیم دوران ملازمت پرائیویٹ طور پر حاصل کی۔ یہی اسلم کولسری کا کمال ہے کہ محترم احسان دانش (مرحوم) کی طرح دوران تعلیم 1962ء سے 1964ء تک اوکاڑہ کی ستلج کاٹن ملز اور ملتان کی ممتاز آئل ملز میں مزدوری کی۔ پھر اوکاڑہ کے جامعہ مدینہ پرائمری اسکول میں پڑھایا۔ اوکاڑہ کی عرفان فارمیسی میں سپروائزر رہے۔ ثاقب

کاٹن انڈسٹریز میں مینجری کی۔ 1983ء سے 1987ء تک روزنامہ مشرق لاہور میں سب ایڈیٹر رہے اور پھر 1987ء سے تاحال لاہور کے اردو سائنس بورڈ سے بحیثیت ریسرچ آفیسر وابستہ ہیں۔ دوران صحافت بچوں کے مشرق میگزین میں ناولٹ اور بچوں کے لئے کہانیاں لکھیں۔ دو کامیاب ڈرامے ''آنکھ کھل گئی'' اور ''ابھی نہیں تو کبھی نہیں'' لاہور کے الحمرا ہال میں اسٹیج کئے۔

اسلم کسی خاص مکتب فکر سے متاثر نہیں۔ ان کا کلام نئی قدریں' اوراق' سیپ' الفاظ وغیرہ میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اب تک ان کے کلام کے مجموعے نخل جاں' کاش' ویرانہ' نیند' جیون' برسات اور پنجابی کلام کا مجموعہ پنچھی شائع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے ناولٹ میں زخمی گلاب' انوکھے شکاری' چاند کے آس پاس اور کھنڈر میں چراغ' شائع ہو چکے ہیں۔

مشاعروں اور تخلیقی نشستوں کے انعقاد کی موافقت میں ہیں اور کہتے ہیں کہ دونوں کا اپنا اپنا کردار ہے۔ نثری نظم انہیں زیادہ متوجہ نہیں کرتی۔ ان کا اپنا رجحان غزل کی طرف زیادہ ہے۔

اردو زبان کے مستقبل سے اسلم کافی حد تک پر امید ہیں گو کہ اپنی ہی سرزمین پاکستان میں اردو کا یہ حال ہے کہ اسلم کا شعر اس پر بڑی حد تک صادق آسکتا ہے۔

کچھ احترام کیا ہے ' کچھ انتقام لیا
حنوط کرکے مرے حلقہ ء اثر نے مجھے

اونچے طبقے میں والدین بچوں کے ساتھ اردو بولنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ان کے بچے ابتداء ہی سے کانوینٹ اور انگریزی میڈیم اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ ملک کی سرکاری زبان اردو ہونے کے باوجود تمام کام انگریزی میں انجام پاتا ہے اور زمانے میں پنپنے کی یہ باتیں نامناسب ہونے کے باوجود شکر ہے خدا کا کہ ایک غیبی ہاتھ کے تعاون سے پنپ بھی رہے ہیں۔

اسلم کا کہنا ہے کہ واقعی آج ہمارے قاری کا رشتہ ادب سے ٹوٹ رہا ہے۔ کمزور ہو رہا ہے لیکن سینئر ادیبوں کی اس رائے سے پورا اتفاق کرتے ہیں کہ بیرونی فیشن کی پیروی سے اچھا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا' لہٰذا ہمیں مغرب سے تکنیک تو ضرور سیکھنا چاہئے لیکن مسائل' حسیت اور احساس و شعور ہمارے اپنے ہونا چاہئیں۔

عکسِ فن

غزل

جب میں اپنے گاؤں سے باہر نکلا تھا
ہر رستے نے میرا رستہ روکا تھا

مجھ کو یاد ہے جب اس گھر میں آگ لگی
اوپر سے بادل کا ٹکڑا گزرا تھا

شام ہوئی اور سورج نے اک ہچکی لی
بس پھر کیا تھا، کوسوں تک سناٹا تھا

میں نے اپنے سارے آنسو بخش دیئے
بچے نے تو ایک ہی پیسہ مانگا تھا

شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

لوگوں نے جس وقت ستارے بانٹ لئے
اسلم اک جگنو کے پیچھے بھاگا تھا

غلط ہے یہ کہ غمِ تیرگی سے ڈرتا ہوں
مگر میں جھوٹی سحر کی خوشی سے ڈرتا ہوں
کہیں فریب کے راہبر نہ لوٹ لیں تجھ کو
مرے حبیب تیری سادگی سے ڈرتا ہوں

محمد اشرف

M. Ashraf Shaheen
45/1, Street-9
Khayaban -e- Shamsheer, Phase-5,
Defence Housing Authority
Karachi, Pakistan

محمد اشرف شاہین

کراچی

ادب ذریعہ ہے زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا۔ ایک ادیب کا کمال فن یہی ہے کہ وہ اپنے افکار کو الفاظ کے نئے نئے رشتوں کی سحر کاری سے اس طرح مزین کرے کہ اس کا قاری اس سحر میں کھو جائے اور اس طرح وہ افکار احساسات کو جلا اور حیات کو تابندگی بخشیں۔ وہی ادب جاوداں بھی ہوتا ہے، جو زندگی کی راہوں کو روشن کردے اور حیات افروزی کا پیغامبر بنے۔

محمد اشرف شاہین نے اس نکتے کو پالیا تھا چنانچہ خاموشی سے مطالعہ کرتے رہے اور اپنے احساسات کے اظہار کے لئے شعر کہتے رہے۔ اس ضرورت سے بے نیاز کہ وہ باقاعدہ ذریعۂ شہرت بھی بنیں۔

محمد اشرف 10 جولائی 1944ء کو ضلع پنجاب کے شہر خوشاب میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خوشاب میں حاصل کی۔ جوہر آباد کے گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے۔ گورنمنٹ کالج جوہر آباد کی اسٹوڈنٹ یونین کے جنرل سیکریٹری اور پھر یونین کے صدر بھی رہے۔ کالج کی کرکٹ ٹیم کے تین سال کیپٹن رہے۔ آل پاکستان انٹر کالجیٹ مباحثوں اور مشاعروں میں بھرپور حصہ لیا اور کئی انعامات حاصل کئے۔ 1965ء میں پاکستان کے بہترین ڈبیٹر قرار پائے اور جوہر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ 1966ء میں پنجاب یونیورسٹی اور نیشنل کالج یونین کے سیکریٹری جنرل منتخب ہوئے اور یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف بھرپور تحریک چلائی۔

عملی زندگی کا آغاز یونائیٹڈ بینک میں آفیسر کی حیثیت سے کیا۔ تقریباً پندرہ سال تک

بینک میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر کام کیا۔ 1982ء میں بینک کے نائب صدر کے عہدے سے اپنے پرانے دوستوں کے کہنے پر استعفیٰ دیا اور پروگریسو فوٹو گرافکز پرائیویٹ لمیٹڈ میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی اور تاحال اسی کمپنی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

اشرف شاہین شاعری کے علاوہ ناول' افسانے' تاریخی اور مذہبی کتابوں کے مطالعے سے شغف رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں شاعری اظہار خیال کے لئے زیادہ موزوں صنف ہے اور نظم اس کا بڑا موثر ذریعہ۔ نثری نظم بھی انہیں پسند ہے اور کہتے ہیں کہ اس میدان میں بعض لوگوں نے اچھے تجربے کئے ہیں۔

اشرف مشاعروں کو ہماری تہذیبی روایت بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مشاعرے اب بھی اس ناسازگار دور میں بھی ایک عام سامع کو ادب کے مطالعہ کا ذوق و شوق دیتے ہیں۔ تخلیقی نشستیں اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے ایک ادیب و شاعر کے ذہن کو جلا ملتی ہے۔

اردو کے مستقبل سے اشرف مایوس نہیں۔ کہتے ہیں یہ میٹھی زبان ایک خودرو پودے کی طرح اپنے آپ پھلی پھولی ہے اور اس طرح وہ نئی نسل کو بھی اپنی طرف متوجہ کرے گی۔ لیکن ہمیں اس زبان کا حق ادا کرنے کے لئے اپنی اپنی جگہ کام کرنا چاہئے تاکہ اس میں وسعت پیدا ہو۔ صاحب حیثیت ادارے کتابیں خرید کر احباب اور لائبریریوں کو دیں اور لوگوں میں پڑھنے کا ذوق و شوق پیدا کریں کہ یہ کام بھی ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک آج قاری کا رشتہ ادب سے مضبوط ہے یا ٹوٹتا جا رہا ہے۔ اشرف کا جواب ہے کہ آج بھی دنیا کے کسی بھی حصے میں اگر اچھا ادب تخلیق ہوتا ہے تو اسے اچھے قاری میسر آجاتے ہیں۔ البتہ اب صرف وہی ادب اپنی طرف متوجہ کرا سکے گا' جو جاندار ہوگا۔ اسی طرح اچھی اور خوبصورت بات دنیا کے کسی زبان کے ادب میں ہو' اس سے استفادہ کرنا چاہئے۔ البتہ بیرونی فیشن کی اندھی تقلید سے بچنا بھی ضروری ہے۔

اشرف شاہین کی زندگی میں یوں تو کئی یادگار حادثے واقع ہوئے ہیں اور واقعات نے انہیں متاثر کیا ہے مگر ایک واقعہ' جس نے انہیں زندگی کی راہوں میں روشنی دکھائی' وہ اسے بھولتے نہیں' اپنے آپ دہراتے ہیں اور یاد رکھے ہوئے ہیں۔

کہتے ہیں یہ 1972ء کی بات ہے۔ میں مشتاق احمد یوسفی صاحب کے گھر گیا تھا۔ یوسفی صاحب جہاں ایک نابغہء روزگار ادیب ہیں' وہیں ایک معروف بینکار بھی ہیں۔ بی سی سی آئی لندن کے سینئر ایگزیکٹو رہے۔ یو بی ایل اور الائیڈ بینک آف پاکستان کے صدر رہ چکے ہیں اور بینکنگ کونسل کے چیئرمین بھی۔ ان کے گھر کے ڈرائنگ روم کے ایک پردے پر میں نے پیوند لگا دیکھا تو ان کی توجہ دلائی۔ جواب میں وہ بولے کہ ہمیں ہر پانچ سال بعد پردے بدلنے کی سہولت حاصل ہے اور ابھی پانچ سال ہوئے نہیں۔ میں حیرت زدہ رہ گیا کہ ان کی ایک

جنبش ابرو پر قیمتی سے قیمتی پردے حاضر کئے جا سکتے ہیں مگر یہ ان کی ایمانداری کی شان تھی۔ میں بے حد متاثر ہوا۔ میں ان کے ساتھ یو بی ایل میں کام کر چکا تھا' ان کی ایسی کئی اداؤں نے مجھے اس حد تک متاثر کیا تھا کہ ان کی راہ کی تقلید میرے لئے باعث فخر بن گئی ہے۔

پھر ہوا یوں کہ اب ادھر کچھ دن قبل مجھے پھر ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا اور میں نے یوسفی صاحب کو وہ پردے والی بات یاد دلائی تو ہنس کر بولے۔ "میاں اشرف تم جس صوفے پر بیٹھے ہو' یہ بھی بیس سال پرانا ہے اور چونکہ کام دے رہا ہے تو ہمیں بھی اس سے کوئی شکایت نہیں کہ اسے اٹھا باہر پھینکیں۔"

یہ واقعہ سنا کر اشرف صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ بتایئے ایسے شخص کے لئے کس دل میں نیک خواہشات جنم نہیں لیں گی۔ اس کرپشن کے دور میں یوسفی صاحب اور ان جیسے چند اور ہیں کہ ہمارے پاکستان کی آبرو منور ہے اور رہے گی۔

عکسِ فن

غزل

اس مرتبہ بہار کے موسم کو کیا ہوا
ہر پھول ہے مرقعِ حیرت بنا ہوا

یہ اور بات ہے کہ زمانہ شفق کہے
صیاد کا ہے خون سے دامن بھرا ہوا

زلفوں کی بو لبوں کی گلابی ہنسی کے پھول
تم ہو کہ سامنے ہے گلستاں کھلا ہوا

اس کے لئے چمن کا ہر اک پھول ہے عزیز
جس باغباں کا دل ہو محبت بنا ہوا

اہلِ جنوں کا حکم ہے فصلِ بہار میں
اب کے رہے نہ ایک بھی دامن سلا ہوا

اے باغباں چمن کو فریبِ سکوں نہ دے
خاموشیٔ فضا میں ہے طوفاں رکا ہوا

ہمدم ستم ظریفیٔ گلچیں نہ پوچھئے
وہ پھول توڑتا ہے جو دیکھا کھلا ہوا

پھر آج بولنے پہ ہزاروں ہیں بندشیں
پھر آج ہے خیال پہ پہرا لگا ہوا

دل ہے تو زندگی سے اندھیرے جدا کرو
یارو چراغ رکھتے ہو لیکن بجھا ہوا

اشرف تغیراتِ زمانہ کا رنگ دیکھ
رہزن تھا کل جو آج وہی رہنما ہوا

اب علاجِ غمِ دل کوئی نہیں کر سکتا

ہم ہمیشہ کیلئے ہو گئے بیمار ترے

محمد کمال اظہر

2-2-95

(کویت)

Kamal Azhar
P.O. Box 17160
72452 Khalidiya
Kuwait

محمد کمال اظہر
کویت

ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان کے پبلسٹی مینیجر جناب سید رحمان علی سے کوئی آٹھ سال بعد ملاقات ہوئی۔ ان سے ان کے کمرے میں ملاقات نہ ہوتی تو پہچاننا دشوار ہوتا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو مسکرا کر بولے۔ "میں جانتا ہوں آپ ملک چھوڑ کر چلی گئیں لیکن آپ کے پڑھنے والے آپ کو نہیں بھولے۔" شمس وارثی صاحب دوران گفتگو ان سے پوچھ ہی بیٹھے۔ رحمان صاحب آپ باریش کب سے ہوئے؟ رحمان صاحب مسکرائے اور جو واقعاتی پس منظر انہوں نے بتایا وہ دل میں کھب جانے والا تھا۔ جو لوگ روضہ ء رسول کی زیارت کر آئے ہیں' وہ اس دل گداز واقعے سے یقیناً" متاثر ہوں گے۔ ورنہ اوروں کے لئے تو سر سے گزر جانے والی بات ہوگی۔

رحمان صاحب کہہ رہے تھے یوں تو میں حج بھی کر آیا۔ پھر عمرہ بھی کیا لیکن سنت رسولؐ کی تکمیل نہ کی یعنی داڑھی نہ رکھی۔ پھر جب چار پانچ سال قبل دوبارہ حضورؐ کے روضہ ء مبارک پر پہنچا تو ان کی جالیوں کے قریب سیکوریٹی کی پولیس نہ تھی۔ میرا جی چاہا کہ فرط عقیدت سے جالی کا بوسہ لے کر اپنی پیاس بجھالوں۔ دیکھا تو جالیوں کے قریب سادہ لباس میں ایک عربی پولیس افسر دو تین پاکستانی حضرات کو جالیوں تک پہنچنے سے روک رہا تھا۔ وہ ان سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہہ رہا تھا۔ "آپ بتائیں کہ جس کے پاس آپ آئے ہیں ان کو خوشی دینا چاہیں گے یا دکھ۔" وہ پاکستانی بولے "خوشی"۔ تب پولیس افسر نے ان کے کلین شیو چہروں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ کیا آپ کے میزبان حضورؐ آپ کو اس صورت میں دیکھ کر خوش ہوں گے۔ کیا آپ انؐ کے کہنے پر عمل کر کے انؐ کے حضور جا رہے ہیں؟

رحمان صاحب نے کہا کہ میں لرز کر رہ گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ پولیس افسر مجھ سے ہی یہ بات کہہ رہا ہو۔ بس تب ہی خدا کو مجھے توفیق دینی تھی اور میں نے حضورؐ کی سنت کی پیروی شروع کردی۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد کئی شعراء حضرات کا ذکر آیا جو در کعبہ کا طواف کر کے اللہ کے محبوبؐ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کر آئے ہیں مگر سنت رسولؐ کے تکمیل کی طرف شاید ان کا دھیان نہیں گیا۔

کویت کے محمد کمال اظہر نے بھی ادبی حوالے سے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ادب سے عمل کا تعلق کٹ جانے کی ایک بڑی وجہ اسلامی اصولوں سے انحراف ہے۔ گو ہم معاشی کشمکش کا بھی شکار ہیں، جس کی وجہ سے بے راہ روی بڑھ گئی ہے۔ کرپشن کا دور دورہ ہے۔ صبر و قناعت ہم میں نہیں۔ لوگوں میں بے حسی بڑھ گئی ہے۔ ادبی کساد بازاری اور گروہ بندی نے پڑھے لکھے طبقے کو بھی کرپشن کی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ انہوں نے بتایا گذشتہ سال حیدر آباد سندھ میں ایک ادبی تنظیم "ادراک" نے ایک نشست کا اہتمام کیا۔ صدارت محمد کمال اظہر نے کی تھی۔ اس محفل میں ڈاکٹر حسن منظر نے اپنا مقالہ "بلیو فلموں کے اثرات" پڑھا، اس میں منظر نے اپنے تجربات اور مریضوں کے حالات اور ان کی رہنمائی و علاج کی تجاویز بھی پیش کی تھیں مگر ہوا کیا، اس کے لئے ہمیں باقاعدہ منظم ہو کر مہم چلانی ہوگی، تب ہی ہم ہمارے نئی نسل کو راہ راست پر چلا سکیں گے۔

محمد کمال اپنا تخلص اظہر کرتے ہیں۔ 5 ستمبر 1944ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک گورنمنٹ اسکول جیل روڈ میں پڑھا۔ 1962ء میں اسلامیہ کالج کراچی سے بی۔ اے کیا۔ ریڈیو پاکستان کی کمرشل سروس سے بھی اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ پھر ایوان تجارت میں 62ء سے 67ء تک مینجر ایڈورٹائزرنگ اینڈ پبلک ریلیشنز رہے۔ 1967ء سے کویت میں ہیں۔ 73ء سے اب تک یونیورسٹی آف کویت سے اسسٹنٹ مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔

انہیں شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کا کلام کویت کے اردو اخبارات کے علاوہ روبی اور بیسویں صدی دہلی میں بھی چھپتا ہے۔ "یاران وطن" میں مزاحیہ قطعات لکھتے ہیں۔ پہلا مجموعہ جو نعتوں پر مشتمل تھا "حسن عقیدت" کے نام سے اور دوسرا غزلوں نظموں کا مجموعہ "دو آتشہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ زیر طبع کتابوں میں "سہ آتشہ" اور طنز و مزاح کا مجموعہ "کمالیات" ہے۔ ولی دکنی سے لے کر غالب اور پھر مخمور اور بے خود تک ایک خاص قسم کے ماحول سے متاثر ہیں۔ روایتی اثرات کو قبول کرتے ہوئے جدیدیت اور موجودہ دور کی کشمکش کو بھی اپنے کلام میں اجاگر کیا ہے۔

اظہر نے غزل، نظم اور ہزل تمام اصناف میں اظہار خیال کیا ہے۔ نعتیں بھی کہتے ہیں۔

کویت میں ادارہ منہاج القرآن کے مرکز پر منعقدہ دینی محافل میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں اور یہی محفلیں نعتیں کہنے کی محرک بنتی ہیں۔ ان کی ہزل گوئی پر انہیں "کویت کے دلاور فگار" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اظہر نثری نظم کے حامی نہیں ہیں' انہیں پروین شاکر کی بھی بعض نظموں پر اعتراض ہے۔ کہتے ہیں یہ تحریک ان ذہنوں کی پیداوار ہے جو شاعری کی الف بے سے بھی واقف نہیں۔ اشعار کی موزونیت' اوزان' بحور' قوافی اور ردیفوں کی آئینہ دار شاعری ہی صحیح معنوں میں شاعری ہے' چاہے وہ غزل ہو' آزاد نظم یا کوئی اور صنف' اس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ اردو کے مستقبل سے اظہر مایوس نہیں ہیں کیونکہ اردو کی جاذبیت اور شیرینی نے اسے دنیا کی تیسری بڑی زبان کا درجہ دیا ہے۔ یہ زبان دنیا کے ہر خطے میں بولی جاتی ہے۔

اظہر کہتے ہیں۔۔۔۔ مشاعرے اور ادبی نشستیں دونوں ہی ادب کی فلاح میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ ادیب جو بات اپنے پورے مقالے میں کہتا ہے' شاعر چند شعروں میں وہ پیغام لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔

ادب سے قاری کا رشتہ جڑا ہوا ہے آج کا ادیب' شاعر اور طنز و مزاح نگار معاشرے کے ناسوروں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ریڈیو' ٹی وی بڑے موثر انداز میں درس دیتے ہیں لیکن لوگ سنتے ہیں اور روایتی بے حسی کا شکار ہوتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ مغرب کے رجحانات کی پیروی اور ادبی فیشن ایسا زہر ہے جو آہستہ آہستہ ہمارے ادب پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ہمیں مغربی ادب کی پیروی کی قطعی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے ہماری تاریخ اور اسلاف کے کارنامے اور سب سے بڑھ کر حضورؐ کی زندگی ہمارے لئے شمع ہدایت ہے۔ مغربی رجحانات کا ہمارے معاشرے پر یہ رد عمل ہوا جبکہ جرائم اور لوٹ مار کی خبروں سے اخبارات بھرے ہوئے ملتے ہیں اور ہماری نسلیں خراب ہو رہی ہیں۔

عکسِ فن

غزل

آپ کی ذہنی خباثت کا مجھے اندازہ ہے
آپ سے کی جو محبت اس کا یہ خمیازہ ہے

گزری باتیں یاد مجھ کو آ رہی ہیں آج بھی
فکر مری آج بھی کل کی طرح سے تازہ ہے

ہم سمجھ نہیں پائے ذہن اس کا کیا تھا
دوستی کا دعویٰ تھا دشمنوں کے جیسا تھا

سیم و زر کے بدلے میں بیچتا ہر شے کو
مقصد حیات اس کا جو بھی کچھ تھا پیسا تھا

○

لمحہ خوشیوں کا کوئی یاد نہیں
سب ہیں ناشاد کوئی شاد نہیں

بھائی کو بھائی سے لڑا دینا
اس سے بڑھ کر کوئی فساد نہیں

جاؤ تم کو معاف کر ڈالا
اپنے دل میں کوئی عناد نہیں

ملا جو زخم مجھے راہِ طلب میں
وہ کفارہ ہے خمیازہ نہیں ہے

اقبال مجیدی

Iqbal Majeedi
R-273, Sect .14-B
Off. Sharea Mobarak Monghyri,
Shadman Town, North Karachi
Karachi, Pakistan

اقبال مجیدی

کراچی

جناب مبارک مونگیری (مرحوم) دنیائے شاعری کا ایک معتبر نام ہیں۔ اقبال مجیدی نے اسی معتبر ہستی کے سایہء عاطفت میں نہ صرف زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھا بلکہ شاعری کے میدان میں بھی رہنمائی حاصل کی مگروہ "پدرم سلطان بود" پر یقین نہیں رکھتے' اس لئے اپنا ایک الگ مقام بنایا۔ اقبال کو اپنے ابو جان سے زندگی گزارنے کا سلیقہ تو آگیا مگر پی آر بنانے کا گر نہیں آیا۔ اس لئے بھی کہ مبارک مونگیری خود بھی اس "تکڑم" سے ناواقف تھے۔ مگر اقبال نے اپنے علم' اپنے مشاہدے اور تجربے سے جو سیکھا' وہ آفاقی ہے۔

اقبال نے اپنے وطن سے محبت سیکھی' اپنی مٹی سے پیار کرنا سیکھا اور محنت کی عظمت کو ہمیشہ سلام کیا لیکن اس محنت کے صلے سے اپنے ملک کے عوام کو محروم دیکھ کر اس کا سر شرمندگی سے بارہا جھک جھک بھی گیا۔ ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اقبال مجھے بتارہے تھے۔

"میں 1994ء میں آسٹریلیا کے وکٹوریہ اسٹیٹ میں IFBWW کی انجینئرنگ سیمینار میں واحد پاکستانی نمائندہ کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ سیمینار میں دنیا کے چالیس ممالک کے نمائندے شریک تھے۔ سیمینار میں ہر ملک کے نمائندوں نے (Country Report) پیش کی۔ کنٹری رپورٹ میں ہر نمائندہ نے تعلیمی تناسب (Ratio) پیش کیا۔ تقریباً" ہر ملک کے نمائندے نے 90 فیصد سے لے کر سو فیصد ایجوکیشن کی نشاندہی کی۔ جب میری باری آئی تو میں نے کنٹری رپورٹ پیش کی۔ جان بوجھ کر میں نے تعلیمی پوزیشن بتانے سے گریز کرنے کی کوشش کی لیکن شرکاء سیمینار نے تعلیمی تناسب جاننا چاہا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے مجھے

بے حد شرمسار کیا۔ میں سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ کاش ہمارے ملک میں بھی تعلیمی تناسب نوے فیصد ہوتا۔

اسی طرح 1997ء میں ملائشیا کے سیمینار میں پاکستانی نمائندہ کی حیثیت سے میں شریک ہوا۔ اس دس روزہ سیمینار کا اہتمام IFBWW جنیوا نے کیا تھا۔ یہ سیمینار "بے روزگاری" (Un Employment) کے موضوع پر تھا' جس میں بیس ممالک کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ بیشتر ممالک کے نمائندے نے سو فیصد ایمپلائمنٹ سے نوے فیصد ایمپلائمنٹ رپورٹ پیش کی۔ ان ممالک میں ملائشیا واحد ملک مجھے نظر آیا' جہاں سو فیصد ایمپلائمنٹ ہے۔ لیکن اپنا ملک ایسا ہے' جہاں پچاس فیصد ملازمیت کی گنجائش بڑی مشکل سے نظر آتی ہے جبکہ ملائشیا ان ممالک میں سے ایک ہے جو پاکستان کے دس سال کے بعد آزاد ہوا ہے مگر ترقی میں کہیں زیادہ ہے۔"

اقبال مجیدی 10 جون 1955ء کے دن چاٹگام سابق مشرقی پاکستان حالیہ بنگلہ دیش) میں پیدا ہوئے۔ 1978ء میں کراچی سے سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ لیا۔ 1988ء میں جامعہ کراچی سے اردو میں ایم اے کیا۔ ان دنوں اے سی ای پرائیویٹ لمیٹڈ میں ایک اچھے عہدے پر اپنی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔

1970ء سے شاعری کا آغاز کیا۔ انہیں صحافت سے بھی دلچسپی ہے۔ چنانچہ مضمون نگاری اور انٹرویو نویسی میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ روشن خیال شعراء سے متاثر ہیں۔ ابتدا ہی سے مظلوموں کی حمایت کا درس لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جابجا مظلوموں کی حمایت کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ان کا کلام ماہنامہ صریر' ارتکاز' طلوع افکار' کراچی' شام و سحر لاہور آج کل' شمع فلمی ستارے دہلی اور جنگ' امن اور نوائے وقت میں شائع ہوتا ہے۔

اقبال مجیدی نثری نظم کے حق میں نہیں۔ ادب کے فروغ کے لئے مشاعروں پر تخلیقی و تنقیدی نشستوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنے اظہار کے لئے غزل کو بہتر صنف سخن سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں اظہار کا دائرہ وسیع ہے۔

اردو کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ "یہ دنیا کی چوتھی نہیں بلکہ تیسری بڑی زبان ہے۔ میں اردو کے مستقبل سے بہت زیادہ پرامید ہوں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں اردو کی آبیاری بڑی تیزی سے مشاعرہ' رسائل اور جرائد کی اشاعت کی صورت میں ہو رہی ہے۔ امریکہ' برطانیہ' کینیڈا متحدہ امارات وغیرہ میں مشاعرے اور مذاکرے بھی اردو کے فروغ میں حصہ لے رہے ہیں۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ دور حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے۔ عہد حاضر میں ہر شاعر و ادیب کسی نہ کسی حوالے سے دور حاضر کی نمائندگی عملی طور پر کر رہا

ہے، جس کی زندہ مثال کچھ یوں ہے کہ دور حاضر میں معاشی ناہمواری، اقتصادی بدحالی ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے والا شاعر و ادیب ہی ایک موثر طبقہ ہے نہ ہی قاری کا ادب سے رشتہ ٹوٹتا جارہا ہے۔ آج کے ادب ہی نے قاری کو معاشی ناہمواری اور معاشرے میں پھیلی ہوئی ناانصافیوں سے آگاہ کیا ہے اور اس کے سیاسی و سماجی شعور کو بیدار کیا ہے، لہٰذا یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ موجودہ ادب بے اثر ہے۔

آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے اقبال مجیدی سنجیدگی سے بولے۔ "ہر شاعر و ادیب اپنی ایک رائے رکھتا ہے، لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ اس کی رائے سے دوسرا متفق ہو۔ اگر اچھا ادب مغرب میں تخلیق کیا جارہا ہے تو اس سے اثر ضرور قبول کیا جانا چاہئے، لہٰذا ہمارے سینئر ادیبوں کا یہ کہنا کہ مغربی رجحانات ہمارے ادب پر غالب ہیں۔ ایک حد تک درست بھی ہے مگر قابل اعتراض بھی کیونکہ آج مغربی ادب کو بطور فیشن نہیں اپنایا جارہا ہے بلکہ مغربی ادب کو اپنے رنگ میں ڈھالا جارہا ہے، ویسے بھی ہر اچھی چیز کی پیروی سے ایک زندہ ادب تخلیق ہوتا ہے اور مغربی تکنیک کو مشرقی پیرائے اظہار میں ڈھالنا کیا کمال فن کی دلیل نہیں؟"

اقبال مجیدی کے کلام کا مجموعہ "ذات" 1996ء میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ "تمازت کا سفر" اور "آسٹریلیا کا سفرنامہ" زیر طبع ہے۔

عکس فن

"دیئے کے اندر"

اس منڈیر پر اکثر
اک دیا سا جلتا ہے
لو امید کی دل میں
یوں لگائے بیٹھا ہوں
حسرتوں سے تکتا ہوں
اور دیے کی لہروں میں
میں کہ ڈوب جاتا ہوں
حسرت تمنا اب

یہ سوال کرتی ہے
کون ہے تمہارا وہ
کیا تمہارا رشتہ ہے
میں جواب کیا دیتا
تیرگی کی بستی میں
اک دیا سا جلتا ہے
اس دیے کے اندر تو
اک خیال پلتا ہے

کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے جیسے ہر لمحہ
کسی کی کھوج میں نکلا ہوا ستارہ ہے!
یہ شش جہات ہیں، بے شمار آنکھیں ہیں
یہ کائنات کوئی مستقل نظارا ہے
ہم اُس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں، یہ تو برحق ہے
پس پردہ وہ بھی مگر منتظر ہمارا ہے!!

امجد اسلام امجد

Amjad Islam Amjad
B-9, G.O.R, 3-Shadman
Lahore, Pakistan

امجد اسلام امجد

لاہور

غالب کو جب بھی پڑھا کسی کا یہ مصرعہ بے ساختہ زبان پر آیا۔۔ ؎

ہم تمہیں چاہیں' ہائے نہ چاہیں کیونکر!

اور جب کسی اہل قلم سے ملاقات ہو جائے تب تو غالب مجسم ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ ان اہل قلم کا ہی کمال تو ہے کہ ان کا لکھا ایک جملہ' ایک مصرعہ' ایک بول انسان کے وجود کے گرد آگہی کی روشنی کا ہالہ بنا دیتا ہے تب اپنی ذات کا عرفان ہوتا ہے۔ اسرار کے در کھلتے ہیں اور ایک انجانی اور لافانی مہک اور خوشبو کا غبار چاروں اطراف پھیل جاتا ہے۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ کتنے ہی اہل علم کے روشن روشن مسکراتے چہرے ذہن کی اسکرین پر اجاگر ہوئے' جب امجد اسلام امجدؔ سے جامعہ کراچی میں یوم غالب کی تقریب میں ملاقات ہوئی۔ علم کا دریا بہانے والے جب بولتے ہیں تو جی چاہتا ہے خسروؔ جی اٹھیں' میرؔ پھر سے جنم لے لیں اور یہ دنیا امن کی پیغامبر بن جائے۔

زاہد حسن جو خود کو امجد کا شاگرد بتاتے ہیں' لکھتے ہیں کہ "دنیا کی ساری قومیں' سارے سماج' اپنے شاعروں' صورت گروں اور فنکاروں کے مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنی تہذیب' اپنی معاشرت' اپنی ثقافت اور اپنی اقدار میں اپنا خون جگر شامل کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ مستقبل کی کوکھ میں جھانکنے کا گر جانتے ہیں۔ امجد اسلام امجد کا شمار بھی ایسے ہی فنکاروں میں کیا جاتا ہے۔"

امجد اپنے بارے میں شاید اتنا نہ جانتے ہوں' جتنا ان کے دوست اور احباب امجد کی تہہ

در تہہ شخصیت اور مزاج سے واقف ہیں۔ ان میں سینئرز بھی ہیں اور جونیئرز بھی۔ محمد اجمل نیازی بھی اس کہکشاں کا ایک ستارہ ہیں جو چاند سے دور بھی ہے اور بہت قریب بھی۔ لکھتے ہیں۔۔۔ "امجد ایک ایسا فنکار آدمی ہے جو اپنی حدود و قیود اپنے زمان و مکان' اپنے برے بھلے اپنے دوست دشمن' اپنے امکانات و کمالات سے واقف ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں' جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کو جانتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ زندگی میں اس کی زندگی کتنی ہے' کہاں کہاں ہے' اسے کیسے بڑھایا جائے' کس کس میں بانٹا جائے' تعلقات کے دائرے کو کتنا وسیع کرنا ہے' کس جگہ تنگ کرنا ہے' وہ یہ سارا علم سیکھ چکا ہے۔ وہ یہ بھی سیکھ چکا ہے کہ لاعلمی کس جگہ علم سے زیادہ طاقتور اور مفید ہوتی ہے اور اس سے کس طرح کام لینا ہے۔ وہ اپنے لکھے ہوئے لفظ کے پردے اور بے پردگی سے بھی واقف ہے۔ بہت واقف آدمی ہے مگر لفظ کو کبھی زیادہ دیر اپنے پاس نہیں رکھتا۔ وہ اس گر سے بھی واقف ہے کہ لفظ سے سارے کام لئے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے سارے کام لفظ کے ذریعے کرنا چاہتا ہے بلکہ کر گزرنا چاہتا ہے۔ لفظوں کو امجد اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے جتنا اپنے جسم میں لہو۔ وہ لفظ میں لہو جیسی افادیت اور زندگی پیدا کرنا جانتا ہے۔ امجد کا خیال ہے کہ دنیا میں آدمی جتنے ذرائع سے جو کچھ حاصل کرلیتے ہیں' وہ سب کچھ لفظ کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ امجد سے پہلوں کا خیال اور عمل بھی تھا۔ بعد والوں کا بھی ہوگا لیکن یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ لفظ سے کام لینے کے کئی رنگ ہیں' کئی ڈھنگ ہیں۔ یہ پتنگ بھی ہے۔ آدمی پتنگیں لوٹتے لوٹتے گر بھی پڑتا ہے۔ امجد گرنے والوں میں سے نہیں معرکے سر کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔"

4/ اگست 1944ء کو لاہور میں پیدا ہونے والے امجد نے اب تک بلاشبہ کئی معرکے سر کئے ہیں۔ مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور سے میٹرک اور اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور سے بی۔ اے کیا۔ اردو مضمون میں وہ معرکہ کیا کہ وظیفہ حاصل کیا۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے اردو میں ایم۔ اے فرسٹ کلاس دوسری پوزیشن لے کر معرکہ مارا۔ 1968ء سے 1975ء تک ایم اے او کالج لاہور کے شعبہء اردو میں استاد رہے۔ 1975ء سے 1979ء تک پنجاب آرٹس کونسل کے آن ڈیپوٹیشن ڈپٹی ڈائریکٹر رہے۔ 1979ء سے 1997ء تک گورنمنٹ ایم۔ اے او کالج لاہور میں اردو کے ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے اور 25 مارچ 1997ء سے تاحال ڈیپوٹیشن پر اردو سائنس بورڈ سے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔

امجد کی مختلف اصناف میں اب تک 32 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ 9 ٹی وی سیریل' 12 طویل دورانیے کے ڈرامے اور 50 سے زیادہ انفرادی کھیل ٹی وی کے لئے لکھ چکے ہیں۔ 27 سے زیادہ تصانیف ہیں' جن میں امجد کے گیت' نظمیں' غزلیں' نیگرو شاعری کے تراجم'

فلسطینی مزاحمتی شاعری کے منظوم تراجم' ٹی وی ڈرامے' سیریل' کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید و انتخاب' سفرنامے اور اخباری کالم بھی شامل ہیں۔ 1996ء میں "فن و شخصیت" کے عنوان سے ان پر ایک ضخیم مجلہ شائع کیا گیا ہے۔ ایک درجن کے قریب مزید کتابیں زیر طبع ہیں اور روزنامہ جنگ میں کالم بھی لکھ رہے ہیں۔

امجد تقریباً" پوری دنیا گھوم چکے ہیں۔ بے شمار اعزازات اور ایوارڈ حاصل کئے ہیں' جن میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی۔ خصوصی صدارتی ایوارڈ برائے ڈرامہ وارث' ہجرہ ایوارڈ' رائٹرز گلڈ ایوارڈ اور 12 گریجویٹ ایوارڈ شامل ہیں۔

شاعری کے علاوہ انہوں نے ڈرامہ' کالم' سفرنامہ' تراجم اور تنقید کی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شاعری کے انگریزی تراجم پر مشتمل ایک کتاب "In the last days of autumn" کے نام سے 1991ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ تراجم کینیڈا میں ہوئے۔ مترجمین ڈاکٹر بیدار بخت اور لیزلی لیوائن ہیں۔

ابتدا میں امجد کا شعری اور فکری رجحان ترقی پسندانہ سوچ کا حامل رہا ہے اگرچہ عام طور پر ان کی شاعری کو جدید Love Poetry یا محبت کی شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے جو بہت حد تک درست بھی ہے لیکن ان کا مکتب فکر ترقی پسندانہ سوچ ہی سے متعلق ہے۔ اصناف سخن میں آزاد نظم ان کی پسندیدہ ترین صنف اظہار ہے۔

امجد کا کلام پاک و ہند کے ہر معتبر ادبی رسالے میں گذشتہ تقریباً" 30 برس سے شائع ہو رہا ہے۔ پاکستان میں ان کا بیشتر کلام احمد ندیم قاسمی صاحب کے رسالے "فنون" میں شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ نقوش' نیا دور' تخلیقی ادب' افکار' اقدار اور معاصر میں مسلسل چھپتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں "سوغات' شب خون اور شاعر میں زیادہ چیزیں چھپی ہیں۔

امجد کہتے ہیں..... "میری زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات بہت سے ہیں مثلاً" یہی بات اپنی جگہ پر بہت اہم ہے کہ میں اپنی تعلیمی زندگی کے دوران کرکٹ کا کھلاڑی تھا اور اسی میدان میں نام پیدا کرنا چاہتا تھا مگر آگے چل کر میری پہچان شاعری اور ڈرامہ بنے۔

ٹی وی سیریل "وارث" سے میری بہت یادیں وابستہ ہیں۔ چند برس پہلے جب میں ادیبوں کے وفد کے ساتھ عوامی جمہوریہ چین گیا تو وہاں مجھے وارث کا چینی زبان میں ڈب کیا ہوا پورا سیٹ پیش کیا گیا' جس کے ساتھ چینی زبان میں وارث کا کتابی باتصویر ترجمہ بھی شامل تھا۔ یہ ڈرامہ کچھ وقت تک پونا انسٹی ٹیوٹ (بھارت) کے سلیبس میں بھی شامل رہا اور اس پر مجھے خصوصی صدارتی ایوارڈ کے علاوہ بہت سارے انعامات بھی ملے۔

1987ء میں مجھے تمغہء حسن کارکردگی حکومت پاکستان کی طرف سے ملا جو اپنی جگہ پر ایک بہت اہم واقعہ ہے۔ اب تک 80 سے زیادہ ایوارڈ مل چکے ہیں۔ میری تین کتابوں "عکس

(رائٹرز گلڈ ایوارڈ 1976ء) فشار (ہجرہ ایوارڈ 1983ء) اور "نئے پرانے" پر (کے ای س ایوارڈ 1992ء) بھی انعامات کے طور پر مل چکے ہیں۔"

اردو کے مستقبل کے سلسلے میں گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا..... "میرے خیال میں اردو کا مستقبل بہت روشن ہے۔ خود میں دنیا کے 16 ممالک میں اردو ہی کے حوالے سے آیا گیا ہوں۔"

نثری نظم کو امجد ذاتی طور پر پسند نہیں کرتے لیکن جو لوگ یہ لکھ رہے ہیں' ان کے لئے امجد کا کہنا ہے کہ میں ان کی آزادیء اظہار کا احترام کرتا ہوں۔

امجد کا کہنا ہے کہ مشاعرے اور ادبی نشستیں شاعری کے فروغ میں بہت معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ ضرورت صرف ان کے انداز کو جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ہے۔

امجد اس بات سے متفق ہیں کہ آج ادب سے قاری کا رشتہ کمزور پڑگیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "یہ بات جزوی طور پر درست ہے کیونکہ اخلاقی اقدار کی جگہ معاشی اقدار نے لے لی ہے اور اس کے زیر اثر جہاں اور رشتے تبدیل ہوئے ہیں' وہاں ادیب اور قاری کا رشتہ بھی یقیناً" متاثر ہے۔

آخری سوال کے جواب میں امجد اپنے سینئرز کے خیالات سے متفق ہوتے ہوئے کہتے ہیں..... "میرے خیال میں سینئر ادیبوں کا کہنا بالکل بجا ہے۔ ہمیں اندھی تقلید سے گریز کرنا چاہئے۔"

عکسِ فن

غزل

کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
وہ شخص ایسا گیا' پھر نظر نہیں آیا

وفا کے دشت میں رستہ نہیں ملا کوئی
سوائے گردِ سفر' ہم سفر نہیں آیا

کسی چراغ نے پوچھی نہیں' خبر میری
کوئی بھی پھول مرے نام پر نہیں آیا

چلو کہ کوچہ ء قاتل سے ہم ہی ہو آئیں
کہ نخلِ دار پہ کب سے ثمر نہیں آیا

پلٹ کے آنے لگے شام کے پرندے بھی
ہمارا صبح کا بھولا مگر نہیں آیا

خدا کے خوف سے جو دل لرزتے رہتے ہیں
انہیں کبھی بھی زمانے سے ڈر نہیں آیا

کدھر کو جاتے ہیں رستے' یہ راز کیسے کھلے
جہاں میں کوئی بھی بارِ دگر نہیں آیا

یہ کیسی بات کہی شام کے ستارے نے
کہ چین دل کو مرے' رات بھر نہیں آیا

ہمیں یقین ہے امجد نہیں وہ وعدہ خلاف
یہ عمر کیسے کٹے گی' اگر نہیں آیا

وقت کی کائی جم تو گئی ہے یاد کی گہری جھیلوں پر
لہر کوئی تھرّا جاتی ہے تیز ہوا چل جانے سے

Imdad Nizami
G.P.O. Box 433
Quetta, Pakistan

امداد نظامی

کوئٹہ

امداد نظامی کہتے ہیں ان کی روداد حیات کے خلاصے کا ترجمان انہی کا یہ شعر ہے۔

کیا اٹھاتے زندگی کے ناز بس یوں نبھ گئی
اس نے جس صورت سے چاہا ہم بسر کرتے رہے

مگر بات اس شعر تک تو محدود نہیں۔ امداد نظامی کی زندگی کے دوسرے رخ کا ترجمان مولانا حالی کا یہ شعر ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرو بیاں

اسی شعر کی تصویر امداد کی نصف بہتر سلطانہ یاسمین نظامی کا وہ کارنامہ ہے جو کوئٹہ میں "ہنر مرکز" کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اس تربیتی ادارہ نے گذشتہ نو سال کے دوران 1500 سو سے زائد خواتین اور لڑکیوں کو مفید ہنر سکھا کر ہنرمند اور باوقار روزگار کمانے کے قابل بنایا۔ اس ادارے کی تربیت یافتہ یہ ہنرمند خواتین اور بچیاں مجموعی طور پر 13 ملین روپے سالانہ کی اوسط آمدنی حاصل کر رہی ہیں۔ ان میں سے کئی خواتین نے ذاتی تربیتی ادارے بھی قائم کرلئے ہیں۔ چھ لڑکیوں کو سرکاری اور نیم سرکاری محکموں میں انسٹرکٹر کے طور پر ملازمتیں مل چکی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ہنر مرکز کا یہ تربیتی پروگرام ہر قسم کی سرکاری اور نجی مالی امداد کے بغیر "اپنی مدد آپ" کے اصول پر جاری ہے اور مزید خواتین اس

سے مستفید ہو رہی ہیں۔

امداد بتا رہے تھے کہ سلطانہ یا سمین نظامی نے نہ صرف اس ادارے کے ذریعے معاشرہ کی بے لوث خدمت کی ہے بلکہ امداد کے ساتھ اپنے گھروندے کی تعمیر میں بھی پورے خلوص سے حصہ لیا۔ امداد کی شادی یاسمین کے ساتھ 1970ء میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد بھی اتنی سعادت مند عطا کی جو اپنی لیاقت' ذہانت' شائستگی اور بعض غیر معمولی صلاحیتوں کی بناء پر ماں باپ کے لئے سرمایہ ء فخر ثابت ہوئے ہیں اور وطن عزیز کے لئے ایک مفید شہری بھی۔

1994ء میں کسی ظاہری سبب کے بغیر ہی امداد شدید عارضہ ء قلب میں مبتلا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جرات' استقامت اور ایمان و اعتماد کی بناء پر خطرناک علالت کا سامنا مکمل بے خوفی اور اعتماد سے کیا۔ ان کی تقویت کی بنیاد بھی توکل اور ایمان تھا اور ہے اور یہی چیزیں انہیں کٹھن مراحل سے آسانی سے گزار دیتی ہیں۔

امداد نظامی سیلف میڈ (Self Made) آدمی ہیں۔ اپنے بارے میں تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ میرا نام تو امداد نظامی ہے اور تخلص نظامی جو میں کبھی کبھی استعمال کرتا ہوں۔ 14/ اگست 1935ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوا۔ تعلیم ڈیرہ غازی خان' لاہور اور کراچی میں حاصل کی۔ 45 سال قبل 1953ء میں جبکہ طالب علمی کا دوسرا مرحلہ شروع ہو رہا تھا' میرا صحافت اور نشریات سے تعلق پیدا ہوا۔

دس سال تک فری لانسنگ جاری رہنے کے بعد 1063ء میں مکمل اور باقاعدہ عامل صحافی کی حیثیت سے روزنامہ "انجام" کراچی سے پیشہ ورانہ زندگی کا دوسرا اہم دور شروع کیا "انجام" کے علاوہ ہفت روزہ "اخبار خواتین" روزنامہ "مشرق" اور روزنامہ "جنگ" میں خدمات انجام دیں۔ متعدد ذاتی جرائد بھی جاری کیے۔ کوئٹہ میں روزنامہ "زمانہ" کی ادارت کی ذمہ داریاں پوری کیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ گذشتہ 31 سال سے ٹیلی ویژن سے بھی کمپئر اور رائٹر کی حیثیت سے وابستہ ہوں۔ اپنا ذاتی جریدہ ماہنامہ "خانم" بھی شائع کر رہا ہوں۔

شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید اور ایک خاص سطح پر فکشن سے بھی امداد کا تعلق ہے۔ اقبال اور غالب کے فکر و فن پر خاص طور سے کام کیا ہے۔ ادب و شعر کے کسی مخصوص مکتب فکر سے نہ تو تعلق ہے نہ بطور خاص متاثر ہیں۔ ان کے نظام فکر میں مکاتب فکر کو نہیں اہل قلم اور ان کے کام کو اہمیت حاصل ہے۔ ہر تخلیق کار کا احترام کرتے ہیں لیکن تقلید کسی کی نہیں کرتے۔ کلام اور مضامین کراچی' لاہور' کوئٹہ اور سرحد پار کے مختلف جرائد و رسائل' اکیڈمی ادبیات کے سہ ماہی جریدہ "ادبیات" اور برصغیر میں شائع ہونے والے انتخاب شعر پر مشتمل مجموعوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ان کی نظم و غزل کا مجموعہ "زرسنگ"

ترتیب پا چکا ہے اور جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔ "سورج تھا سو ڈوب گیا" یہ ہائیکو کے مجموعہ کا نام ہے' یہ بھی اشاعت کے لئے تیار ہے۔ بچوں کے لئے لکھے جانے والے گیتوں اور نغموں کا مجموعہ "آؤ مل کر گائیں" اشاعت کے لئے مرتب ہو چکا ہے۔

مطبوعہ کتب میں کوئی شعری مجموعہ نظم و غزل کے حوالے سے شامل نہیں۔ البتہ یہ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ کشمیر ایک تاریخی جائزہ' ہمارے تعصبات' تحریک پاکستان اور بلوچستان' بلوچستان بنیادی حقائق اور تاریخ صحافت بلوچستان میں (دونوں انگریزی میں) خوش دل (ایک قدیم سرائیکی شاعر کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ) فرید رنگ فرید انگ خواجہ 'غلام فرید رحمت اللہ علیہ کے کلام کا منظوم ترجمہ خواجہ صاحب کی شخصیت' فکر اور محاسن کلام پر سیر حاصل مضامین کے ساتھ۔ عین النعیم صلی اللہ علیہ و سلم حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے اسمائے گرامی پر مسدس' برصغیر میں نعت گوئی کے جامعہ جائزہ کے ساتھ۔ بلندیوں کا سفر (گولڈن جوبلی کے حوالے سے 50 سال کا اقتصادی' سیاسی' سماجی جائزہ) طباعت کے لئے تیار مسودے علم خزینہ (27 مختلف علوم کے بارے میں بنیادی معلومات) اردو کے شاہکار ناول (23 اہم ناولوں پر تنقیدی مضامین) اقبال "کولمبس (اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر مضامین)۔ ریمیا (ایک تمثیلی ناول) گروگ کہانی (پولینڈ کے ایک پر اسرار شخص کی کہانی' اس کہانی کے اجزا طویل جدوجہد کے ذریعے جمع کئے گئے) انجام بخیر (روسی کمیونزم کے عروج و زوال کی مستند داستاں ہلکے طنزیہ و مزاحیہ پیرائے میں) بیگی (سات طویل مختصر کہانیوں کا مجموعہ) آئینہ کیوں نہ دوں (اہم سیاسی' سماجی مسائل پر تجزیاتی مضامین) موج ہوئی آوارہ (منظوم ڈرامہ) کھیم کرن تا مونا باؤ (جنگ ستمبر 1965ء کے بارے میں) اور بہت سے دوسرے مسودے' جن میں اردو کے علاوہ انگریزی' سرائیکی اور فارسی کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ کلاسیکی' فارسی شعراء کا تذکرہ بھی اور یادوں پر مشتمل ایک کتاب کچھ یادیں بھولی بسری سی کچھ قصے روشن لوگوں کے کے بلوچستان کے اہل قلم کے بارے میں کتاب برف کی کلیاں بھی تیار ہے۔

نظامی نے کہا ایک بے حد اہم کتاب ہے "آبگینہ دل' ہارٹ اٹیک اور اس کے بعد اسے عالمی عظمت کے حامل ماہرین امراض قلب نے مریضوں' ان کے تیمار داروں' نوجوان ڈاکٹروں اور میڈیکل کالجوں کے طلباء کے لئے یکساں اہمیت و افادیت کی حامل کتاب قرار دیا ہے۔ لاہور کا ایک بڑا اشاعتی ادارہ اسے شائع کر رہا ہے۔ یہ کتاب میں نے ان دنوں تحریر کی' جب میں خود بیماری دل میں مبتلا تھا اور آپریشن کے انتظار میں تھا۔ ماہرین نے اسے اردو میں عام آدمی کی رہنمائی کے لئے امراض قلب پر پہلی اہم کتاب قرار دیا ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ایڈیشن بھی "You and Your Heart" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

اپنی اس خوش بختی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی رحمت سے مجھے اور میری

اہلیہ کو حرم کعبہ اور حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ جلال و جمال کی ان بارگاہوں میں جو دن رات گزرے وہ ہماری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ بن گئے ہیں۔"

اردو کے لئے انہوں نے کہا.... اردو' دنیا کی 33 ہزار تسلیم شدہ زبانوں اور بولیوں میں چوتھی نہیں تیسری بڑی زبان ہے۔ اس کی یہ عظمت' اس کی داخلی توانائی اور انجذاب کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر ہے۔ اردو کا مستقبل نہایت تابناک ہے۔

امداد نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ کہتے ہیں.... غزل اردو کی سب سے توانا اور سب سے حسین صنف ہے' جو زندگی کے تمام موضوعات کو سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور دوسری تمام اصناف کے مقابلے میں زیادہ اثر آفریں ہے۔ نثری نظم نام کی کسی شے کو "شاعری" کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا' میرے نزدیک یہ ذہنی آوارگی کی ایک قسم ہے۔ مشاعرے تخلیق ادب میں معاون ثابت ہوں یا نہ ہوں ہماری تہذیب کی ایک حسین قدر کی حیثیت سے ان کو زندہ رہنا چاہئے۔ ان کی افادیت سے انکار مناسب نہیں البتہ مختصر ادبی و شعری نشستیں' جن میں بے تکلفانہ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہے' فروغ ادب میں زیادہ موثر کردار ادا کرتی ہیں۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا.... "یہ نکتہ ء نظر درست نہیں ہے۔ آج کا شاعر اور اس کے شب و روز ماضی کے شاعر سے یکسر مختلف ہیں۔ آج کا شاعر ماضی کے خود مرکزیت کے شکار شعراء سے یکسر مختلف ایک عملی انسان ہے اور کار زار زندگی میں دوسرے تمام انسانوں کی طرح فعال اور سرگرم جہاد ہے۔ اسی طرح ادب نے بھی اپنی بنیادی اقدار کا تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ جدید زندگی کے جدید ترین تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔ قاری سے ادب کا رشتہ منقطع نہیں ہوا۔ ایسا ہوتا تو پوری دنیا میں ادبی کتب کی اشاعت کا سلسلہ جاری نہ رہتا۔ کچھ فرق پڑا ہے تو صرف اس بناء پر کہ ابلاغ کے بعض دوسرے ذرائع بھی انسانی ذہن کی آبیاری اور فکر و شعور' علم و آگہی اور ادراک و شعور کے فروغ کے لئے سامنے آچکے ہیں۔ اس کے باوجود ادبی کتب اور ادبی جرائد اب بھی بھاری تعداد میں شائع ہو رہے ہیں اور پڑھے جا رہے ہیں۔ البتہ ایک شکایت مجھے بھی ہے۔ لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس مرض میں مبتلا ہو گئی ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کرنے سے زیادہ اپنی کتابیں شائع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بازار میں آنے والی کتابوں میں زیادہ تعداد ایسی کتابوں کی ہے' جو قاری کے ذوق ادب' فکر و احساس اور وجدان سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ کم کاوش اور جلد بازی سے صاحب کتاب بننے اور زیادہ سے زیادہ کتابوں کا مصنف کہلوانے کا یہ وبائی عارضہ ختم ہونا چاہئے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اب کتابیں بہت مہنگی

ہو گئی ہیں' اس کا سبب ٹیکس لگانے والوں کی بے تدبیری ہے۔ کتابیں کم سے کم لاگت میں شائع ہونی چاہئیں تاکہ ہر طبقے کے لوگ اپنے ذوق اور پسند کے مطابق انہیں خرید سکیں۔"

آخری سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے.... "سینئر ادیبوں کے کسی خیال پر تنقید کرنا مناسب نہیں۔ تاہم ایک حقیقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے۔ ابلاغ کے جدید ترین' تیز ترین اور موثر ترین وسائل نے انسانی معاشروں میں حائل فاصلے کم کردیئے ہیں اور قربتیں بڑھا دی ہیں۔ ایسے حالات میں پورے کرہ ءارض کے انسانوں کا پورے کرہ ءارض کے حالات' واقعات' حادثات' سانحات سے فوری طور پر باخبر اور متاثر ہونا عین فطری ہے۔ ادب اور اس کے رجحانات کا معاملہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ بھی ایک فطری عمل ہے لیکن اسے فطری انداز میں آگے بڑھنا چاہئے۔ مسئلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جبکہ کچھ لوگ اپنے آپ کو زیادہ ادب شناس اور زیادہ بین الاقوامی ظاہر کرنے کے لئے مغرب کے بعض بڑے اہل قلم' شعراء اور مفکرین کے نام دوہراتے رہتے ہیں حالانکہ ان کو کھنگالا جائے تو ان غیر ملکی تخلیق کاروں کے کام اور خصوصیات کے سلسلے میں وہ محض خالی لفافے ثابت ہوتے ہیں۔ اس فیشن زدگی کو کسی بھی دور میں پسند نہیں کیا گیا لیکن مشرق و مغرب کے افکار و رجحانات سے باخبر رہنا اور اپنے تخلیقی عمل میں ان سے استفادہ کرنا ایک صحت مند روایت ہے۔ البتہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی جڑیں' اپنی زمین میں مضبوطی سے پیوست رکھتے ہوئے برگ و بار کی نئی دنیا آباد کریں۔ اسی سے وہ اعلیٰ ادب تخلیق ہوگا' جس کی اساس ہماری اپنی ہوگی اور اس میں آب و رنگ پوری دنیا کے دکھائی دیں گے۔"

عکس فن

غزل

کانٹوں ہی میں کچھ ظرف سماعت نظر آئے
گلشن میں کہیں تو مری روداد سنی جائے

اس کارگہ شیشہ میں آئینہ ہوں میں بھی
چہرہ نہیں کوئی تو کوئی سنگ ہی آئے

گلگشت کا اب ذوق نہ کچھ قدر بہاراں
اک عمر سے ہوں زخموں کا گلزار سجائے

منزل کا ہے امکاں نہ کوئی ختم سفر کا
اس آبلہ پائی کو کوئی نام دیا جائے

اس وادی کہسار میں پتھر ہی نہیں ہیں
ہے اور بہت کچھ بھی مگر کیسے نظر آئے

ہاں تیز بہت تیز ہے اب گردش حالات!
اس دل کا کروں کیا کہ جو چل پائے نہ رک پائے

تانبے سی زمیں اور سوا نیزے پہ سورج
تقدیر نے یوں حشر کے آثار دکھائے

اک گرد مسافت تھی کہ چہروں سے نہ اتری
ویسے تو یہاں ہم نے کئی شہر بسائے

امداد نظامی نہ سخن ور تھے نہ شاعر
کچھ زخم امانت تھے کسی کی وہی لے آئے

لباسِ وحشت اپنا مل رہا ہے صحنِ گلشن میں
وہ پھوٹا گُل سے دامن وہ کلی سے آستیں نکلی
ثاقب انجان

Saqib Anjan
E-7, Five Star Luxuary Apartments
Block-14, Gulshan-e-Iqbal
Karachi-75300, Pakistan

ثاقب انجان

کراچی

یحییٰ ہاشم باوانی یوں تو گجراتی زبان کے ادیب ہیں لیکن کمال کی اردو لکھتے ہیں۔ "ڈان گجراتی" سے وابستہ تھے۔ انہوں نے ایک میمن اور گجراتی زبان بولنے والے لیکن اردو میں شاعری کرنے والے شاعر ثاقب انجان کا تعارف لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ "کچھ لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ گجرات کاٹھیاواڑ میں رہائش پذیر میمن اور دیگر برادری کے لوگ قبل از قیام پاکستان اردو سے ناآشنا تھے یا حصول آزادی کے بعد اردو سے متعارف ہوئے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کاٹھیاواڑ میں میمن برادری کے لوگ اپنے گھروں میں میمنی زبان جو سندھی زبان کی ایک شاخ ہے' بول چال میں استعمال کرتے تھے۔ (میری معلومات کے مطابق میمنی ایک بولی ہے کیونکہ اس کا کوئی رسم الخط نہیں۔ اس میں سندھی' گجراتی ماڑواڑی اور پنجابی زبان کے بہت سارے الفاظ جمع ہیں) لیکن ان کے تعلیمی اداروں میں گجراتی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی نصاب میں شامل تھی۔ اس وقت بھی گجرات (ہندوستان) میں ایک سو پچاس ایسے تعلیمی ادارے ہیں' جہاں 32 ہزار طالب علم اردو زبان سیکھ رہے ہیں اور پاکستان میں بھی صرف میمن برادری کے ایک سو سے زائد اسکولوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک محقق محترم قاضی احمد میاں جوناگڑھی "مضامین اختر" میں لکھتے ہیں کہ آج سے تقریباً دو سو اکیس برس پہلے دھوراجی کے رہنے والے عبداللہ بن واعظ نے قصہ لیلیٰ مجنوں دکنی اردو زبان میں لکھا تھا' جس کا آخری شعر یہ ہے۔" ؎

شروع کیا قصہ گونڈل کے اندر
اور اسے پورا کیا دھوراجی بھیتر

محمد ثاقب انجان اسی دھوراجی (کاٹھیاواڑیا سوراشٹر ہندوستان) میں 14 جولائی 1927 کو پیدا ہوئے۔ مسلم مڈل اسکول دھوراجی' انجمن ہائی اسکول ناگپور اور وردھا یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ ثاقب گجراتی کے ساتھ ساتھ ہندی اردو اور سنسکرت بھی جانتے ہیں۔ بچپن سے ہی اردو کے دلدادہ تھے۔ 13 سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کئے اور رفتہ رفتہ ان کی محنت اور لگن نے انہیں اس مقام پر پہنچا دیا کہ اردو زبان کے معتبر شعراء میں ان کا شمار کیا جانے لگا ہے۔ مشہور محقق اور نقاد جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری ثاقب انجان کے مجموعہ کلام "حدیث غم" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"عموماً شاعری ہی میرے مطالعہ کا محور رہی ہے۔ میں نے نعت' مرثیہ' سلام سبھی کچھ توجہ سے پڑھنے کی کوشش کی ہے اور شاید اسی لئے "میرانیس حیات اور شاعری" اور "اردو کی نعتیہ شاعری" نامی کتابیں بھی میری فہرست مطبوعات میں شامل ہوئیں لیکن آپ نے جس بحر میں داستان کرب و بلا کو نظم کردیا ہے' وہ دریائے فرات بن گئی ہے۔ اس بحر کو اس طور پر اردو شعراء نے کم ہی استعمال کیا ہے۔ آپ نے بحر رجز کو نہ تو **مثمن** سالم استعمال کیا نہ مسدس بلکہ مثنیٰ استعمال کیا یعنی ہر مصرعے میں دوبار **متفعلن** رکھا۔ سبحان اللہ۔ آپ نے برمحل بحر رجز کا استعمال کیا اور **متفعلن متفعلن** کے چھوٹے چھوٹے مصرعوں سے نظم میں ایسے غضب کا اثر پیدا کیا کہ میں یہ خط کھینچنے اور داد جلد سے جلد دینے پر مجبور ہو گیا۔"

ثاقب انجان نے میر' غالب' نظیر اکبر آبادی اور ابن انشاء پر ادبی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں کیونکہ بقول ان کے آج کے ادیب اور شعراء بڑی جانفشانی سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔

صنف سخن میں غزل کے میدان میں اظہار کو ترجیح دیتے ہیں۔ نثری نظم کے لئے کہتے ہیں جیسے نمکین حلوہ حالانکہ حلوے کی خاصیت شیرینی ہے۔ مشاعروں کی بجائے تخلیقی نشستوں کو ادب کی نشوونما کے لئے بہتر سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ آج بھی اچھا ادب قاری کو متاثر کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے' لہٰذا ادب سے قاری کا رشتہ جڑا ہوا ہے اور نہ ہی ادب آج ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے۔

اپنی زندگی کا یادگار واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا کہ 1946ء میں ہندوستان کے شہر ناگپور میں آل انڈیا مشاعرے میں پہلی بار میں نے شرکت کی۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا' جس میں بھارت کے بہت سے شعراء موجود تھے۔ میرے ایک مطلع پر محترم جگر مراد آبادی نے دل کھول کر داد دی یوں میرے حوصلوں کو پر لگ گئے۔ وہ مطلع یہ تھا۔

ہے کائنات کی ہر چیز آدمی کے لئے
"یہ آدمی بھی تو ہوگا مگر کسی کے لئے"

ثاقب انجان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، حدیث غم اور ریگ ساحل۔ "ریگ ساحل" کا دوسرا ایڈیشن بھی آچکا ہے۔ انہوں نے غزل، نظم، گیت، رباعیات، ماہیا، ہائیکو اور سلام و منقبت میں طبع آزمائی کی ہے۔ خصوصی دعوت پر اسکاٹ لینڈ (برطانیہ) کے مشاعروں میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے، جہاں انہیں "پاکستان آرٹ اینڈ لٹریری سرکل" کی جانب سے اردو سے محبت اور منفرد تخلیقات کے اعتراف میں اردو لٹریری ایوارڈ برائے 1996ء دیا گیا۔

زبان اردو کے شیدائی ثاقب انجان، کراچی اور گلاسگو سے ایک ماہنامہ "جدید اردو ادب" کے نام سے شائع کرتے ہیں۔ گلاسگو برطانیہ میں ان کے داماد ڈاکٹر محمد شفیع کوثر بھی شاعر ہیں اور بہت ستھرا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔

ثاقب انجان مست آدمی ہیں۔ شہرت کے پیچھے نہیں بھاگتے لیکن ان کے کلام کی سچائی خود شہرت کو ان کے پیچھے دوڑاتی ہے۔ یہ شعر دیکھئے۔

ہم ریت پہ لکھے ہوئے الفاظ تھے انجان
کتبوں کی طرح تھے نہ کتابوں کی طرح تھے

(ایک پوربی گیت)

دور گگن پہ کس کی چھبی یہ سندرتا دکھلائے
چندر مکھی کوئی بادل میں، جھانکے اور چھپ جائے

نیل گگن پر چھٹکے تارے جھلمل، جھلمل جگنو سارے
دمک رہے ہیں موتی جیسے یا دہکے انگارے

چمک رہے ہیں جیسے ہیرے یا شیشوں پر پارے
نیل گگن ترے تارے ہیں یا چونر کے تارے

کچھ ناسمجھ پڑے یہ مُمھا کون مجھے سمجھائے
دور گگن پہ کس کی چھبی یہ سندرتا دکھلائے

عکس فن

غزل

قطرہ بھی ہوں اور وقت کے دریا سے جدا ہوں
تب دیکھنا جب عشق محمدؐ میں فنا ہوں

کرنیں مجھے چنتی ہیں نہ کرتی ہے زمیں جذب
میں آب گہر آپ کی رحمت سے بنا ہوں

اے ابر کرم تیری توجہ کا ہوں محتاج
اس موسم گلریز میں بھی قحط زدہ ہوں

مجھ پر بھی مرے وہم پہ بھی ضرب خلیلی
آذر کی طرح میں بھی بتوں ہی میں گھرا ہوں

پھر کیوں نہ رکھوں عشق محمدؐ سے امیدیں
دنیا کو بہت دیکھ چکا، دیکھ رہا ہوں

اس در پہ چلو ہم بھی جگا لائیں مقدر
جس در کا یہ اعلان مسلسل ہے کہ وا ہوں

خواہش کی پرستش سے بچا لو مرے آقا
اپنے ہی بنائے ہوئے بت پوج رہا ہوں

ہر لفظ ہے تفسیر دھڑکتے ہوئے دل کی
انجان میں خود نعت کے شعروں میں چھپا ہوں

یہی اندازِ دیانت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

Anwar Masood
403- I-91
Islamabad, Pakistan

انور مسعود

اسلام آباد

مرے سینے کو روشن کر خدایا
تری رحمت کا عاجز پر ہو سایا

عاجز تخلص کرنے والی کرم بی بی واقعی اللہ تعالیٰ کا کرم تھیں۔ 72 سال کی عمر میں تیس سال پہلے یعنی 1967ء میں وفات پانے والی اس خاتون کی بے لوث نیکیاں تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے بی بی عاجز کی ایک نیکی کے بدلے ستر نیکیاں دیتے ہوئے ان کا وصف شعری ان کی تیسری نسل یعنی ان کے نواسے انور مسعود تک منتقل کردیا۔ یہ بھی بی بی عاجز کی نیکیوں کا صلہ تھا کہ "سخن ور حصہ سوم" کے آخری مراحل میں میری انور مسعود سے ملاقات ہو گئی۔ اس ملاقات کے توسط سے ہی بی بی عاجز (مرحومہ) کے روحانی مرتبے سے آشنائی ہوئی۔ یہ واقفیت میرے لئے بھی روحانیت کے جانے کتنے در کھول گئی۔ یہاں بھی میں نے کسب نور کیا چنانچہ انور مسعود کو آپ سے متعارف کرانے سے پہلے میں ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔

انور تخلص کرنے والے 'محمد انور مسعود 8 نومبر 1935ء کو مغربی پنجاب کے شہر گجرات میں پیدا ہوئے۔ والد مرحوم محمد عظیم تصوف سے گہرا میلان رکھتے تھے جبکہ والدہ مرحومہ اقبال بیگم علم وادب سے گہرا شغف رکھتی تھیں۔ نانی بی بی عاجز صاحب دیوان تھیں۔ "گل و گلزار" کے نام سے ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ عمر بھر قرآن کی درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ انور کے تایا جان عبداللطیف افضل اردو اور پنجابی کے بڑے قادر الکلام شاعر تھے اور

ایک عالم دین بھی۔ انور مسعود ڈاکٹر بننا چاہتے تھے مگر مضمون سے مزاج کی ہم آہنگی نہ پاکر زمیندار کالج گجرات سے اول پوزیشن حاصل کر کے بی۔ اے کیا۔ انہیں اسکالر شپ کے ساتھ رول آف آنرز اور سلور میڈل بھی ملا۔ 1962ء میں انہوں نے یونیورسٹی اور نیشنل کالج لاہور سے فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ اس بار بھی پنجاب بھر میں فرسٹ کلاس حاصل کرنے کی وجہ سے گولڈ میڈل لیا۔

ملازمت کا آغاز ڈیرہ غازی خان سے فارسی کے لیکچرار کی حیثیت سے کیا۔ پھر تو ان کے پیر میں جیسے چکر پکڑ گیا۔ مختلف شہروں میں پڑاؤ ڈالا اور آخر میں 30 ستمبر 1996ء کو ریٹائرمنٹ حاصل کی۔ 1976ء میں فارسی کے چالیس اساتذہ کا ایک وفد تحصیل فارسی جدید کے چار ماہ کے کورس کے لئے حکومت پاکستان کی طرف سے ایران بھیجا گیا، جس میں انور مسعود وفد کے سربراہ تھے۔ حکومت ایران نے ان کی کارکردگی کو بے حد سراہا۔

پروفیسر انور مسعود شاعری کے علاوہ تنقیدی اور تحقیقی مقالات بھی لکھتے ہیں۔ "فارسی ادب کے چند گوشے" کے عنوان سے ایک مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے والا ہے۔ 1974ء میں ان کے پنجابی کلام کا مجموعہ "میلہ اکھیاں دا" شائع ہوا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس کے اب تک بارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی کئی نظمیں ایف۔ اے اور بی۔ اے کے نصاب میں شامل ہیں۔ اس کتاب کو پنجاب رائٹرز گلڈ کی طرف سے پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ ان کے مزاحیہ اور طنزیہ قطعات کے مجموعہ "قطعہ کلامی کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ 1996ء کے اواخر میں ان کے مزاحیہ قطعات، غزلیات اور منظومات کا مجموعہ "غنچہ پھر کھلنے لگا" اور پنجابی غزلوں، نظموں پر مشتمل مجموعہ "ہن کی کریئے" شائع ہو کر خاصے مقبول ہوئے ہیں۔ تعارفی مضامین کا مجموعہ "تقریب" کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

1994ء میں عرب امارات کے آرٹس پروموشن بیورو کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر اظہر علی زیدی نے دبئی میں جشن انور مسعود کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر ایک عالمی مشاعرہ منعقد کیا گیا اور یادگاری مجلہ بھی شائع کیا گیا۔ شالیمار ریکارڈنگ کمپنی نے ان کی شاعری پر مشتمل ایک آڈیو اور ایک وڈیو کیسٹ بھی تیار کی ہیں جو پاکستان اور غیر ممالک میں بے حد مقبول ہوئیں۔ انور مسعود کئی عالمی مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ یوں تقریباً پوری دنیا کا دورہ کر چکے ہیں۔ ان کی اہلیہ مسز صدیقہ انور بھی فارسی کی پروفیسر رہ چکی ہیں۔ ان کی بالغ نظری نے زندگی کی بہت سی کٹھن منزلوں کو آسان بنا دیا۔ ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے صاحبزادے محمد عاقب جو چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں، ان کی شادی معروف شاعر امجد اسلام امجد کی صاحبزادی روشین سے ہوئی ہے۔

پروفیسر انور مسعود کہتے ہیں کہ شاعری کے حوالے سے ان کا کسی خاص مکتب فکر سے تعلق نہیں لیکن ان کی اپنی فکری اور تہذیبی روایت سے قائم ہے۔ انور مسعود اکبر اور اقبال کی روایت کے پیرو ہیں۔ ان کا کلام 'فنون' نقوش' نیرنگ خیال' سیارہ' رابطہ وغیرہ میں شائع ہوتا ہے۔

میں نے ادب سے قاری کے رشتے کے حوالے سے ان سے سوال کیا کہ کیا یہ رشتہ ان کی نظر میں اب بھی جڑا ہوا ہے اور نہیں تو کیوں؟ جواب میں انور مسعود بولے...... "سہیلی بوجھ پہیلی" کے رویئے نے عام قاری کو ادب سے لاتعلق کردیا ہے۔ بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ ن۔ م۔ راشد تو شاعروں کا شاعر ہے یعنی عام قارئین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ابہام کی دبیز دھند شعر کی اپیل کو بہت محدود کردیتی ہے۔ ایمائیت شعر کی جان ہے' اسے بلائے جان نہیں بنانا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایمائیت ایسی ہونی چاہئے کہ عوام بھی اس سے لطف اندوز ہوں اور خواص بھی اور یہ بڑا جان لیوا کام ہے۔ صوفی شعرائ نے یہ کام بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ میرے نزدیک شاعری کا مرد منتظر وہ ہوگا جو سب کو ایک ادا سے رضامند کرے گا۔"

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا.... "ہمارا ادب وہی ہے' جس کا سرچشمہ ہمارا اپنا تہذیبی اور فکری شعور ہو۔ اچھی چیز جہاں سے ملے لے لینی چاہئے لیکن اسے اپنے مزاج سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے ورنہ اجنبیت اسے پنپنے نہیں دے گی۔ اخذ و اکتساب میں سب سے زیادہ ضروری چیز اعتدال کی روش ہے۔ وہی غیر ملکی ادبی فیشن ہمیں راس آسکتا ہے' جو ہماری روایت سے سازگار ہو' ورنہ مضحکہ خیز صورت پیدا ہوگی' اس لئے کہ ادب کوئی فیشن شو نہیں ہے۔"

عکس فن

ہم جا رہے ہیں بھائی

باندھی ہوئی ہے کس کر ٹانگے سے چارپائی
ہے ساتھ ساتھ اپنے
اجداد کی نشانی اک مضمحل رضائی
اکیسویں صدی میں ہم جا رہے ہیں بھائی

پہنے ہوئے ہیں تن پر پیراہن ہوائی
کالر نہیں ہے پھر بھی
گردن میں اک پرانی لہرا رہی ہے ٹائی
اکیسویں صدی میں ہم جا رہے ہیں بھائی

رخت سفر ہے اپنا اپنی برہنہ پائی
آنکھوں میں صرف سپنے
ہاتھوں میں ناتواں اور کاسہ گدائی
اکیسویں صدی میں ہم جا رہے ہیں بھائی

مکتب میں مدتوں سے موقوف ہے پڑھائی
کیا گل کھلا رہی ہے
واعظ کی خوش بیانی مسجد میں ہے لڑائی
اکیسویں صدی میں ہم جا رہے ہیں بھائی

بدر، وہ دیوانہ، وہ آشفتہ سر
آپ بھی باتوں میں کس کی آ گئے۔

31/12/97

Syed Sabir Ali Jafery
B-4, Hill Park Aptt.
Memon Co-oprativeHousing Society
Karachi-75350, Pakistan

سید صابر علی جعفری بدر

کراچی

ایک شاعر کی شعری صلاحیتیں قوم کی امانت ہوتی ہیں۔ شاعر اپنے کمٹ منٹ اور دیانت داری سے اپنے فن کے ذریعے زندگی اور معاشرے کو نکھارنے اور سنوارنے کا کام انجام دیتا ہے۔ اس کے کلام میں یہ خوبی تو ہونی ہی چاہئے کہ وہ اپنے قاری کو ساتھ لے کر چلے۔
بدر جعفری کا شمار انہی شعراء میں کیا جاسکتا ہے کہ جنہوں نے اپنے قاری کو مایوس نہیں کیا۔ ان کی غزل کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں۔۔

فصیلیں کھینچئے شہروں کی اونچی
ہوا کا کوئی جھونکا آ نہ جائے

زمیں کا بوجھ ہیں وہ پیڑ یارو
کہ جن کا دور تک سایہ نہ جائے

ان کے تجربات ایک لرزتی دستک سے قاری کے اندر اترتے ہیں اور اسے گردو پیش کی سچی تصویر ایک لطیف طنز کے ساتھ دکھاتے ہیں۔۔

خون سڑکوں پہ آگ گلیوں میں
کتنی رونق ہے اپنے شہروں میں

بدر جعفری مشاعروں کے شاعر نہیں۔ وہ شاعری کے موتی ہلے گلے میں لٹانے کے قائل ہی نہیں۔ وہ تو شعروں کے آبدار موتی کی مالا بنا کر ادب کی دیوی کے چرنوں میں چپکے سے رکھ

آتے ہیں کہ وقت کا مورخ خود اس کو آنک لے گا۔ ان کے ذہنی رشتے ان روشنیوں سے وابستہ ہیں جو جہالت اور لاعلمی کی تاریکی کو چیرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ گو ان کا میدان بینکنگ کا میدان ہے لیکن جب بھی شعر کہتے ہیں اہتمام سے کہتے ہیں اور زبان و بیان کے ستارے ٹانکتے ہیں۔

یوں تو ان کا پورا نام سید صابر علی جعفری ہے مگر مختلف ناموں سے چھپتے رہتے ہیں۔ اردو کے ادبی نوعیت کے مضامین، پروفیشنل مضامین اور انگریزی کے پروفیشنل مضامین صابر بدر جعفری اور کبھی صرف بدر جعفری کے نام سے لکھتے ہیں مگر تخلص بدر کرتے ہیں۔ آج ہم ان ہر دو شخصیات سے ملیں گے جو یہ بیک وقت سید صابر علی جعفری بھی ہیں اور بدر جعفری بھی۔

اپنے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میں 24 دسمبر 1934ء کو بمقام جے پور (راجستھان، بھارت) میں پیدا ہوا۔ 1951ء میں بی۔ کام ادھورا چھوڑ کر پاکستان آ گیا۔ یہاں دن میں ملازمت کی اور رات کو اردو کالج میں پڑھ کے کراچی یونیورسٹی سے بی۔ کام کیا۔ دوران ملازمت ہی LLB اور پھر MBA کیا جس میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اسی دوران ادیب فاضل بھی کیا، جس میں فرسٹ کلاس پوزیشن حاصل کی۔ پیشہ ورانہ امتحانات میں ادارہ بینکاران پاکستان کا ایسوسی ایٹ شپ کا امتحان پاس کر کے پہلے ایسوسی ایٹ اور پھر فیلو منتخب ہوا۔ چارٹرڈ انسٹی ٹیوٹ آف بینکارز لندن کے اسٹیج ٹو (Stage -2) کے بھی کچھ پرچے نکالے۔

بینکنگ کیریئر کا آغاز ایک ہندوستانی بینک سیف بینک (Safe Bank) کی کراچی شاخ سے کیا۔ اس کے بعد مختلف پاکستانی بینکوں سے ہوتا ہوا 94ء میں نیشنل بینک آف پاکستان سے ریٹائر ہوا۔ اس کے بعد کنٹریکٹ پر الائیڈ بینک جوائن کیا، جہاں سے اگست 1997ء میں فارغ ہوا۔ میں تنقیدی اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی لکھتا رہا ہوں جو جنگ لندن، جنگ کراچی، نوائے وقت، جسارت، حریت میں چھپتے رہے ہیں۔ مالیات اور بینکاری کے موضوعات پر بھی اردو اور انگریزی دونوں میں (زیادہ تر انگریزی میں) بہت کچھ لکھتا رہا ہوں جو ملک کے اردو اور انگریزی کے تمام تر روزناموں میں چھپتا رہا ہے۔ روزناموں کے علاوہ اردو کے جریدہ صدائے بینکاران اور انگریزی کے Pakistan and Gulf Economist اور Economic Review میں میرے مضامین تواتر سے چھپتے رہے ہیں۔"

بدر جعفری اردو زبان کے شیدائی ہیں۔ کہتے ہیں۔۔۔۔ اردو دنیا کی ایک اہم زبان ہونے کے باوجود اس وقت ناموافق حالات کی زد میں ہے۔ اپنوں کی سرد مہری، غیروں کی بیگانگی سے زیادہ سنگین ہے۔ اس کے باوجود اس کے مستقبل کو کوئی بڑا خطرہ نہیں ہے۔ دراصل اردو بولنا اور سمجھنا اس قدر آسان ہے اور اسے سننا اتنا شیریں اور دل گداز ہوتا ہے کہ یہ بڑی

آسانی سے ہر دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اردو کا بڑے سے بڑا دشمن بھی اردو غزل سن کر یہی کہتا ہے کہ۔۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اردو کی یہی صفات تمام تر تعصب اور معاندانہ رویوں کے باوجود اردو کے روشن مستقبل کی ضمانت ہیں۔

بدر کو صنف شاعری میں اظہار خیال کے لئے غزل موثر ترین ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ نثری نظم کو انہوں نے کبھی لائق توجہ نہیں سمجھا۔

کہتے ہیں..... "مشاعروں اور تنقیدی نشستوں کا مقابلہ مناسب نہیں ہے۔ دونوں کا دائرہ کار جدا اور افادیت منفرد ہے۔ البتہ طرحی مشاعروں کو رواج دے کے اور تنقیدی نشستوں کے معیار پر توجہ دے کر ہر دور کی افادیت کو مزید موثر کیا جاسکتا ہے۔"

میرے اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کچھ دیر سوچا پھر سنجیدگی سے بولے۔ "یہ بات صحیح بھی ہے اور صحیح نہیں بھی۔ دراصل یہ بات قطعیت کے ساتھ کہنا آسان نہیں ہے کہ ادب نے معاشرتی تقاضوں سے منہ موڑ رکھا ہے یا معاشرہ نازک و لطیف احساسات و جذبات سے دامن کشاں ہے۔ ایک اور پہلو سے بھی اس صورتحال کا جائزہ لیجئے۔ ادب پڑھنے پڑھانے کی چیز ہے جبکہ معاشرے سے پڑھنے کا چلن اٹھ گیا ہے۔ ادب خود کو پڑھوانے پر قادر نہیں ہے۔ البتہ جہاں کہیں اور جتنا کچھ ادب پڑھا جاتا ہے' اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔ سماعت کے ذریعہ ادب کا اثر مشاعروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی غلط نہیں ہے کہ ادب اگر وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو تو اس کی اثر انگریزی مشتبہ ٹھہرتی ہے۔"

بدر جعفری سینئر ادیبوں کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تکنیک کوئی بھی ہو بات اپنی ہی ہونی چاہئے۔ اس کے بغیر ہم اپنے ادب کو اپنا ترجمان نہیں بنا سکتے۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں۔۔

ہم کہ اک دوسرے کے در پے ہیں
خودکشی کر رہے ہیں قسطوں میں

بدر ہم نے بڑی محبت سے
سانپ پالے ہیں آستینوں میں

عکسِ فن

غزل

شفق کیا، لالہ گل کیا، حنا کیا
خود آرائی ہے اور اس کے سوا کیا

رہائی کا تماشا اب بھلا کیا
اسیران قفس میں اب رہا کیا

بہ فیض آشنائی ہم وہاں ہیں
جہاں ناآشنا کیا، آشنا کیا

صبا نے قصے گل کی خلوتوں کے
سنائے ہیں مزے لے لیکے کیا کیا

جو رہرو ہی نہ منزل آشنا ہوں
تو جادہ کیا، جرس کیا، رہنما کیا

چمن والے ہیں خود درپے چمن کے
کسی سے پھر شکایت کیا، گلا کیا

یہ کیسی چپ لگی ہے بدرؔ صاحب
میاں کچھ تو کہو آخر ہوا کیا

ہم گئے تھے انکے آنسو پونچھنے

آنکھ میں دریا لئے لوٹ آئے ہیں

ثروت سلطانہ ثروت

Sarwat Sultan Sarwat
5-C 16/10 Nazimabad
Karachi, Pakistan

ثروت سلطانہ ثروت

کراچی

جاوید وارثی نے لکھا ہے۔ "ثروت کے ہاں زندگی کی شاعری اور شاعری کی زندگی دونوں موجود ہیں۔ زندگی کی شاعری سے مراد ہے ثروت انسانی زندگی کے ہر پہلو پر اپنے مخصوص زاویہ نگاہ کو جذبے اور فکر سے ہم آہنگ کر کے جو منظر نامہ پیش کرتی ہیں' اس میں نہ تو تصنع کو راہ ملتی ہے اور نہ ہی بے کیف حقیقت نگاری کی سفاکی۔ ان کی شاعری لفظوں کے گورکھ دھندوں اور کاری گری سے پاک ہے اور سادگی و پرکاری اور تازہ کاری کی خوبصورت مثال اور اس کے ساتھ ہی انسانی جذبوں کی بے مثال ترجمانی بھی ہے۔

شاعری کی زندگی کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے اب تک جو کچھ کہا ہے' وہ باقی رہنے والا ہے۔ اس میں زندگی کی مکمل علامت موجود ہے۔"

ثروت کے اب تک تین مجموعے آچکے ہیں۔ سوچ کا سفر' سمندر نگاہ میں اور طاقوں میں پڑے خواب جو 1997ء میں شائع ہوا ہے۔ افسانوں کا مجموعہ "بابل نیر بہائے" انٹر اور فرسٹ ایئر کے لئے گائڈ بک اور بی۔ اے ایڈوانس کے لئے تذکرے تبصرے لکھتے ہیں۔ اگلا مجموعہ مقتل جاں اور ہائیکوز کی طباعت کے لئے مواد جمع کر رہی ہیں۔

ثروت سلطانہ ثروت 10 دسمبر 1952ء کو بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ جیکب لائن اسکول سے میٹرک اور کراچی کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد جامعہ کراچی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ گورنمنٹ اکنامکس کالج سے بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ ہیں۔

ثروت کا کلام سیپ' دنیائے ادب' لہجہ' بساط ادب' الفاظ' فروزاں جنگ کراچی و لندن اور نوائے وقت میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ کسی مکتب فکر سے وابستہ نہیں۔ ان کا یقین ہے کہ

جیسے زرخیز زمین میں ایک بیج قوت نمو کے ہاتھوں پھلتا پھولتا ہے' اسی طرح تخلیق کا کرب بھی وہ اظہار نمو ہے۔ جو شاعر سے شعر کہلواتا ہے۔ اپنے اظہار کے لئے غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ ہموار پاتی ہیں۔

نثری نظم کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ "میں بنیادی طور پر خود بھی جدت کو سراہتی ہوں لیکن اکثر یہ بھی سوچتی ہوں کہ نثری نظم کے بعد نثر اور نظم میں حد فاصل کیا رہے گی۔"

اپنے بارے میں ثروت نے کہا کہ "میں نے ارادتاً" شاعر بننے کی کبھی کوشش نہیں کی کیونکہ اس حقیقت سے انحراف کسی طرح ممکن نہیں کہ شاعری وہی ہے جو اکتسابی نہیں لیکن اس ہمسر شتہ حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ شاعر بنانے میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی' وہاں بھی رات دن علم و ادب کے چرچے تھے۔ شعر کہنے لگی مگر خود کو کبھی شاعرہ نہیں سمجھا۔ پہلی بار کالج کے مشاعرے میں غزل پڑھی' جس پر سب چونکے۔ اس مشاعرے کی صدارت جناب نیاز بدایونی کر رہے تھے۔ مشاعرے کے بعد انہوں نے بہت ہمت افزائی کی پھر میں نظمیں اور غزلیں زیادہ اعتماد کے ساتھ کہنے لگی۔

مشاعرے ادب کی ترویج کے لئے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ عام لوگوں میں تحریک پیدا کرتے ہیں۔ تہذیب عطا کرتے ہیں جبکہ نشستیں ایک محدود دائرے میں فیض پہنچاتی ہیں۔"

ثروت کہتی ہیں۔۔۔۔ "اردو زبان کے مستقبل سے ناامید ہونے کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی ایسے حالات ہمارے سامنے ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے تمام علاقائی زبانوں میں مساوی طور پر اردو ترقی اور فروغ پا رہی ہے۔ کون جھٹلا سکتا ہے کہ آئے دن کتنے ہی شعری مجموعے کتنے ہی اخبارات و رسائل کتنے ہی افسانوں کے مجموعے پاکستان کے چپے چپے سے شائع ہو رہے ہیں۔ یہ سب اگلی نسل کے لئے زبان کی ترسیل ہے۔"

ثروت کا خیال ہے کہ شاعر ہو یا افسانہ نگار' سب اپنے گردو پیش سے ہمیشہ متاثر ہوئے اور براہ راست یا بالواسطہ انہوں نے انہی تجربات اور مشاہدات کی ترجمانی کی ہے۔ آج یہ رجحان پورے عروج پر ہے۔ میں تو نہیں سمجھتی کہ ادب سے قاری کا رشتہ کٹ گیا یا ختم ہو گیا ہے۔ تاہم اس میں کوئی کمی آئی ہے تو شاید اس کے اسباب یہی ہیں کہ قیمت کے اعتبار سے کتاب قاری کی دسترس سے دور ہو گئی ہے۔ پھر اس کے علاوہ ہمارے الیکٹرونک میڈیا نے بھی قاری کی نظر میں کتابوں کی ضرورت کسی قدر کم کر دی ہے۔ دراصل خود ذرائع ابلاغ کو تجسس کا یہ انداز قائم رکھنا چاہئے کہ قاری کو کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی رہے۔

آخری سوال کے جواب میں ثروت نے کہا۔۔۔۔ "اردو ادب میں جتنی بھی اصناف نثر و نظم ہیں' ان کی تکنیک مغربی ادب کے حوالے سے ہی وضع کی گئی ہے۔ اب یہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس تکنیک کو اپنے قومی اور معاشرتی انداز میں برتیں تاکہ

بات نئی بھی ہو سچی بھی اور پر اثر بھی۔"
ثروت نے بتایا کہ انہوں نے "مختصر تسلسل" کے نام سے چند نظمیں کہی ہیں۔ انہیں پڑھ کر محترم نیاز بدایونی نے کہا کہ یہ ایک نئی صنف سخن ہے۔ اس حوصلہ افزائی پر وہ اس صنف میں کچھ اور نظمیں کہہ کر اس میں اضافہ کرنا چاہتی ہیں۔ آپ بھی ثروت کی ان نظموں کو ملاحظہ کریں۔

عکس فن

ہائیکو

بچے پاگل ہیں
کہنا کس کا مانیں گے
اڑتے بادل ہیں

تم سے دوری ہے
کہنے کو زندہ ہیں ہم
اک مجبوری ہے

میرا بھی کردار
جیون کو سلجھانے میں
تیرا بھی کردار

خوشیاں تم لے لو
میں ہر غم سہہ سکتی ہوں
تم اپنے غم دو

بند دریچے

اک جذبہء نام کو اخلاص سمجھ کر
کیوں بند دریچوں کی طرف
دیکھ رہی ہوں

خوش گمانی

مجھے تو دیکھو
میں کتنی پاگل ہوں
سچ ہی سمجھی
کہ مجھ کو پھولوں میں تول دو گے!

شکست

دل میں اک کانٹا چبھونا پڑ گیا
ضبط غم کے جتنے دعوے تھے ادھورے رہ گئے
آج پلکوں کو بھگونا پڑ گیا

بچوں کو اس نے چھینا ماں کی گود سے

وہ جس نے کلیوں سے پر زور سے اڑا دیے

ثمر بانو ہاشمی

20-1-98

Samar Bano Hashmi
Al-Samar 45 Shalimar Colony
Bosan Road,
Multan, Pakistan

ثمر بانو ہاشمی

کراچی

کرنال (ہندوستان) میں رہنے والے ڈاکٹر محمد اعلم ہاشمی (مرحوم) کے گھر 1935ء میں ایک بیٹی ثمر بانو پیدا ہوئی۔ وہی ثمر بانو ہاشمی کہتی ہیں۔ ”میرا بچپن کرنال کی پر سکون فضاؤں میں بھائی کے ساتھ لڑکوں کے پسندیدہ کھیلوں میں حصہ لیتے گزرا۔ اب تو یہ کھیل کہیں نظر بھی نہیں آتے جیسے رسہ کشی، دوڑیں، پتنگ کی ڈور پکڑے اونچی اڑان کے مزے لوٹنا اس جسمانی مشقوں کے ساتھ روح کی غذا بھی گھر سے ملتی جب صبح سویرے سر اور ساز کا ملاپ کانوں میں رس گھولتا۔ محلے میں تین اطراف میں عیسائی سکھ اور ہندو آباد تھے۔ ہماری اذان کے بعد ہی ہندو لڑکیاں بھجن گاتیں، سکھ اشلوک پڑھتے اور ہمارے گھر میں قرآن کی تلاوت ہوتی۔

جب ذرا شعور کی آنکھ کھلی اور ہم پر باہر نکلنے کی پابندی لگی تو دیکھا کہ والد صاحب رات رات گئے شعر کہہ رہے ہیں۔ باجی گل ترنم کے ساتھ لہک لہک کر اشعار پڑھ رہی ہیں۔ والد مرحوم کو شاعری کا شوق اپنے جد امجد سے ملا تھا جو سلیس تخلص کرتے تھے۔ کرنال میں ان کی سلام و مرثیے کی کتاب ہم نے اپنے گھر میں دیکھی تھی لیکن پاکستان آمد کے وقت بزرگوں کا یہ اثاثہ ساتھ نہ آسکا۔ شعر، ترنم اور پر سکون پاکیزہ ماحول مجھے خوابوں کی پر اسرار دنیا میں لے جاتے، جہاں چاند کی پر نور کرنیں مجھے اپنے حصار میں محصور کر لیتیں۔ انہی حسین یادوں کے سہارے میں نے بھی ان گنت شعر کہے۔ ترنم کی آمیزش نے ربط اور وزن کا ادراک دیا۔ پھر پاکستان کی تخلیق نے نئے حالات سے دوچار کیا۔ ملتان میں سکونت اختیار کی۔ اب گھر کا وہ پر سکون ماحول خواب بن گیا تھا۔ کئی سالوں کی آزمائش کے بعد اندھیروں سے اجالا پھوٹا۔ ایک ہم سفر ملا کہ شعر اس کی گھٹی میں پڑا تھا...... سو شعر کا سفر آہستہ روی سے جاری رہا۔“

مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ثمر بانو کے شعری سفر کی کاوش "صرف خواب میرے ہیں" کے عنوان سے 1996ء میں سامنے آئی۔ وجہ کیا تھی؟ ثمر کہتی ہیں۔ "سنا ہے کہ برگد کے پیڑ تلے کوئی درخت پنپتا نہیں۔ سو ایک بڑے شاعر کی ہمراہی میں اشعار کو ترتیب دینا اور ایک کتاب کی صورت میں چھپوانا اب سے پہلے ممکن نہ ہوا۔" یہ تو ثمر کہہ رہی ہیں مگر سچ یہ ہے کہ یہاں بھی ایک عورت کی قربانی رنگ لائی ہے۔ عاصی کرنالی پہلے بھی بڑے شاعر تھے۔ اس وقت بھی جب میں نے 1969ء میں روزنامہ جنگ کے خواتین کے صفحات پر "آج کا شاعر" کے عنوان کے تحت جناب عاصی کرنالی کا تعارف چھاپا تھا۔ مگر ثمر بانو کی رفاقت نے انہیں کندن بنانے میں کسر نہ چھوڑی۔ ثمر نے فارسی اور اردو میں ایم اے کیا۔ بی ایڈ کرنے کے بعد درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئیں۔ ساتھ ہی گھر کی ذمہ داریاں نبھائیں اور شریک حیات کی علمی کاوشوں کو اولیت دی۔ خود نثر لکھتی رہیں۔ "دل کی وہی تنہائی" کے عنوان سے ناول تصنیف کیا۔ پھر افسانوں کا مجموعہ "سلسلے درد" کے 1993ء میں شائع ہوا۔ اب شاعری کے مجموعہ کے بعد ایک سفرنامہ زیر ترتیب ہے۔ انہوں نے ملتان میں "حریم فن" کے نام سے ایک بزم بھی قائم کی ہے، جس کا مقصد خواتین میں فروغ ادب ہے۔ کہتی ہیں "غالباً پورے ملک میں خواتین کی یہ واحد ادبی تنظیم ہے جو پچھلے 25 سال سے سرگرم عمل ہے" ثمر بانو اس کی جنرل سیکریٹری ہیں۔

اردو کی شیدائی کی حیثیت سے اردو کا مستقبل روشن ہونے کی پیش گوئی کرتی ہیں کیونکہ اردو کا دامن پھیلا ہوا ہے۔ ہر جگہ اردو بولنے والے مل جاتے ہیں اور پھر مشاعروں اور تخلیقی محفلوں سے بھی اردو شعرو ادب کو فروغ مل رہا ہے۔

ان کے خیال میں نثری نظم ایک تجربہ ہے اور لوگ اس سے گزر رہے ہیں۔ ثمر بانو اظہار کے لئے غزل اور نظم کا میدان منتخب کئے ہوئے ہیں۔

ثمر کہتی ہیں۔ "ہر دور میں ادب کے قاری کم رہے ہیں لیکن ادب کا اپنا ایک اثر ہر عہد میں قائم رہا ہے۔ اسی طرح مغربی ادب نے ہمیں اور ہمارے ادب کو متاثر تو ضرور کیا ہے لیکن احساسات اور شعور تو اب بھی ہمارے داخلی ہیں۔"

ثمر بانو کی زندگی کا ایک اہم موڑ یا اہم واقعہ وہ ہے، جس نے عاصی کرنالی کی زندگی میں بھی ایک تبدیلی پیدا کی اور عاصی صاحب کو ثمر کی صورت میں زندگی کا ثمر ملا۔

عاصی صاحب نے مجھے 1969ء میں اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ ان کی علمی و ادبی ترقی میں ان کی شادی کے اثرات کا بڑا دخل ہے اور یہی اثرات ثمر کی زندگی پر بھی بڑے اثر آفریں نقوش چھوڑ گئے ہیں۔ ہوا یوں کہ ملتان میں عاصی کرنالی کو مشاعروں میں دو چار بار سن کر ثمر ان کی معتقد ہو گئیں اور اپنے افسانے اور کلام بغرض اصلاح بھیجنے لگیں۔ عاصی صاحب نے

ثمر کی تحریر سے ان کے مزاج اور ذوق کی ہم آہنگی کو پورے خلوص سے محسوس کیا۔ یوں دونوں ازدواج کے سنہری روپہلی بندھنوں میں بندھ گئے۔ پھر دونوں نے اکٹھے کتابیں سنبھالیں۔ ساتھ ساتھ امتحانات دیئے۔ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوئے۔ ثمر نے ڈبل ایم اے کیا اور ڈبل محاذ پر زندگی سنوارنے کی لڑائی لڑی۔ عاصی کرنالی صاحب کی سوانح آپ ان کے تذکرے میں پڑھیں گے۔ سردست تو اس خوش و خرم و کامیاب جوڑے کو مبارک باد کہ ایک دوسرے کو ایسی خوش بختی بخشنے کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔

عکس فن

غزل

اک غم نے زندگی کے سلیقے سکھا دیئے
دل پر لگی جو چوٹ تو ہم مسکرا دیئے

آیا نظر جہاں بھی کوئی پیکر خلوص
ہم نے محبتوں کے خزانے لٹا دیئے

جس نے بھی اس سے جا کے کہی میری داستاں
اپنی طرف سے بھی کئی جملے بڑھا دیئے

بچوں کو اس نے چھین لیا ماں کی گود سے
وہ جس نے ٹہنیوں سے پرندے اڑا دیئے

اس عہد میں کمال کا انسان ہے وہی
جس نے بھی چند ٹوٹے ہوئے دل ملا دیئے

آتا نہیں سمجھ میں مزاج ہوا ثمر
مٹی پہ کتنے نقش بنا کر مٹا دیئے

آنکھیں ترے وجود کا ایسا ستون ہیں
جس پر ہر اعتبار کی تعمیر ہو سکے

جاوید آفتاب
[illegible]/2/95

Javed Aftab
G-7, Awami Flates,
Rewaz Garden,
Lahore, Pakistan

جاوید آفتاب

لاہور

اشعار یاد مجھے یاد نہیں رہتے مگر جو شعر دل کو چھو جائے وہ پھر بھولتا بھی نہیں۔ قصری کانپوری (مرحوم) کا ایک شعر مجھے اکثر یاد آتا ہے۔ کس کمال کی بات کہی ہے' ۔ ملاحظہ ہو۔

اگر اندھیرا اگلنے لگے چراغ کی لو
ہوا چراغ بجھانے میں حق بجانب ہے

جاوید آفتاب اسی قصری کانپوری کے شاگرد رشید ہیں اور اگر جم کر ان کا دامن تھامے رہتے تو آج مزید رفعتوں کو چھوتے۔ انہی کے مشورے پر جاوید نے اپنے سو منتخب اشعار کا ایک چھوٹا سا مجموعہ "گلدستہ ءعازم" کے نام سے شائع کیا کیونکہ اس وقت یہ عازم تخلص کرتے تھے۔ بعد میں اپنے اسی نام کو مستقل اپنا لیا۔ نثرنگاری کی طرف بھی مائل ہوئے اور اپنے افسانوں کا مجموعہ "پرائڈ آف پرفارمنس" کے نام سے کتابی صورت میں لے آئے۔ اس کا انتساب انہوں نے سعادت حسن منٹو کے نام کیا۔ ادبی حلقوں میں تو اس کی خاصی پذیرائی ہوئی مگر حکومت پنجاب نے ملک بھر کی لائبریوں کے لئے اس پر پابندی لگادی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے۔

تین سال قبل شاعری کے حوالے سے جاوید آفتاب کی غزلوں اور گیتوں پر مشتمل "دریچے" کے عنوان سے آڈیو کیسٹ اسلام آباد کی شالیمار ریکارڈنگ کمپنی نے جاری کیا۔ اس کی موسیقی نامور موسیقار واجد علی ناشاد نے دی اور پرائڈ آف پرفارمنس یافتہ گلوکار حامد

علی خاں نے اسے اپنی آواز کا سوز بخشا۔

10 دسمبر 1964ء جاوید کی تاریخ پیدائش ہے۔ کراچی میں پیدا ہوئے اور آٹھویں جماعت تک تعلیم بھی یہیں سے حاصل کی۔ پھر میٹرک اور انٹر لاہور سے کیا۔ کمپیوٹر کی تعلیم لے کر خود کو اسی میدان سے وابستہ کیا مگر جی نہ لگا تو دبئی تک کا چکر کاٹ کر پھر لاہور آگئے اور ڈیوٹی فری شاپ کے سیلز کے شعبے سے وابستہ ہوگئے۔ آج بھی اسی سے وابستہ ہیں۔ ساتھ میں اپنا پبلشنگ ادارہ "عہد ساز" کے نام سے قائم کیا۔ اپنے افسانوں کے مجموعے اشاعت کے بعد لاہور کے شاعر زاہد حسن کا مجموعہ کلام "گلیاں" "شبیر حامد (مرحوم) کا مجموعہ 'بام تعلق'" اور مصطفیٰ شاہد کا "ایک قطرے میں سمندر ڈھل گیا" شائع کیں۔ اپنے بلند عزائم کے تحت آئندہ بھی ادیبوں اور شعراء کی کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بنائے ہوئے ہیں۔ مزاج چونکہ شاعرانہ ہے اور صحافیانہ بھی لہٰذا ایک ماہنامہ "اشکال انٹرنیشنل" بھی شائع کر رہے ہیں۔ یہ رسالہ تین زبانوں اردو' پنجابی اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔

جاوید کو شاعری کے علاوہ نثر نگاری سے بھی دلچسپی ہے' لہٰذا اپنے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "کہانی دستک دیتی ہے" اور دو ناول دھجیاں اور چبھن کی اشاعت کی تیاری کر رہے ہیں۔ علمی' ادبی اور فنون لطیفہ سے منسلک نامور شخصیات کے انٹرویوز پر مبنی کتاب "قوس و قزح" کے عنوان سے اور پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ پر مشتمل کتاب "کاوش اول" کے ساتھ پاکستان کی افسانہ نگار خواتین کا مکمل تعارف کا بشمول ان کے لکھے پہلے افسانے کی اشاعت کا پروگرام بھی لئے بیٹھے ہیں۔ ٹی وی ڈرامے اور فلمی کہانیاں تحریر کرنے کی فکر میں ہیں۔ دیکھیں ان کی جان ناتواں کیا کیا ذمہ داریاں پوری کرتی ہے کیونکہ جاوید حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعہ پرائڈ آف پرمارمنس کا ہندی ترجمہ ممبئی (ہندوستان) کے ادیب اور شاعر رمیش شرما کر رہے ہیں۔

جاوید آفتاب اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں کیونکہ برصغیر پاک و ہند میں اس زبان کی خدمت کرنے والے لاکھوں کروڑوں انسان اب بھی اس کی محبت کا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ جاوید نے کہا کہ ان کے حالیہ دورہ ہندوستان کے موقع پر انہوں نے دیکھا کہ گو وہاں اردو کے مقابلے میں ہندی زبان میں زیادہ لکھا جارہا ہے مگر بول چال میں اردو کا تلفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ اسکرپٹ کا فرق ہے مگر وہاں کے ڈرامے اور فلمیں دیکھئے' ادب پڑھئے تو اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو کے لئے وہاں تعصب ضرور ہے لیکن کیا ہمارے ملک میں خود ہم نے اردو کو قومی زبان ہونے کے باوجود وہ مقام دیا ہے۔ جو اس کا حق ہے؟

جاوید کی وابستگی ترقی پسند مکتب فکر سے ہے۔ غزل کو اظہار خیال کے لئے بہتر صنف سمجھتے ہیں مگر اپنی صلاحیتوں کو تمام اصناف میں طبع آزمائی کے لئے استعمال کرنے کا مشورہ

دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نثری نظم کا کینوس بڑا وسیع ہے اور ادب میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جارہا ہے مگر ہمارے سینئر ادیبوں کا رویہ بڑا حوصلہ شکن ہے حالانکہ نئے تجربات ہونا چاہئیں۔ پابند اور آزاد نظموں کا تجربہ بھی تو ناکام نہیں رہا۔

مشاعروں کے لئے ان کا کہنا ہے کہ یہ ادیبوں کی مالی امداد کے علاوہ اندرون اور بیرون ملک رابطے ملاقاتیں اور یک جہتی کا ذریعہ ہیں۔ اب جہاں تک ادبی نشستوں کا تعلق ہے تو ان میں مثبت تنقید یا گفتگو کے بجائے دوستیاں نبھائی جاتی ہیں چنانچہ جو نوجوان ان محفلوں سے فیضیاب ہونا چاہتے ہیں' وہ بعض اوقات ان محفلوں میں ہونے والی بے مقصد تخلیقات اور تنقید سن کر بیزار ہو جاتے ہیں۔

اگلا سوال سن کر جاوید نے کہا کہ دراصل ہمارے ملک میں شرح خواندگی کی کمی اس کی بڑی وجہ ہے۔ پچاس سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود ہم اپنی قوم میں علم کی وہ شمعیں روشن نہیں کرسکے جو دوسرے ممالک اس سے بھی کم عرصے میں کر چکے ہیں حالانکہ کتاب سب سے بہترین دوست ہے مگر اس کا کیا کریں کہ ہم بحیثیت قوم اس کی دوستی سے محروم ہیں۔ مارکیٹ میں روزانہ ایک نئی کتاب ادبی حوالے سے نظر آئے گی لیکن کتاب خرید کر پڑھنے والے اور لفظوں میں جو جادو ہے' اس کا اثر قبول کرنے والے کم سے کم ہوگئے ہیں کیونکہ اکیسویں صدی کے خوف نے ہمارے چاروں اطراف گھیرا تنگ کر رکھا ہے' اس کی وجہ الیکٹرونک میڈیا کی وہ یلغار بھی ہے' جس سے ساری دنیا سمٹ کر آپ کے بیڈ روم تک مقید ہو گئی ہے۔ ایسے میں کتاب اور لفظ کی اہمیت باقی رہ سکتی ہے؟ اگر ہم سب سہل پسندی ترک کردیں۔ (میں سائنسی ترقی کے خلاف نہیں) ہم میڈیا سے چاہیں تو علم و ادب کو اور فلموں یا ڈراموں کے ذریعے وسیع پیمانے پر لوگوں کو تعلیم دے سکتے ہیں ضروری ہے کہ حکومت اس سلسلے میں تعاون کرے۔ کاغذ سستا ہو کر اخبار اور کتابوں کی قیمتیں کم ہوسکیں تو ادب کا رشتہ قاری سے دوبارہ جڑ سکتا ہے اور ادب بے اثر چیز بن کر نہیں رہے گا۔

جاوید آفتاب کہتے ہیں کہ وہ سینئر ادیبوں کے خیالات سے متفق نہیں ہیں کیونکہ مغرب کے رجحانات برسوں پہلے ہمارے ادب پر منڈلانا شروع ہو گئے تھے اور وہاں کے ادب کی انہی سینئر ادیبوں نے پیروی شروع کی تھی' جن کے یہ خیالات ہیں۔ انھوں نے وہاں کے ادب پاروں کے تراجم کرکے انہیں مشرق میں روشناس کرایا۔ ادب میں بہت سی نئی تکنیک کو متعارف کیا۔ ناول' افسانہ' شاعری (نظمیں) تحقیق و تنقید اور دیگر اصناف ادب کی ابتدا اور ان کی پہچان پہلے مغرب میں ہوئی تھی' جس کی لپیٹ میں مشرق بھی آیا۔ مغربی ادب کے تراجم سے وہاں کے مسائل' حسیت' ماحول' حالات' علمی' ادبی' سیاسی' ثقافتی احساس و شعور کا علم ہوا اور ایسا ہونا بھی تھا۔ ہاں بلاجواز بیرونی فیشن کی پیروی نامناسب ہے کیونکہ ہر چیز اپنے

ماحول کے مطابق بہتر لگتی ہے۔ ویسے بھی جب آپ کا اپنی زمین سے رشتہ جڑا ہو تو لاکھ مغربی ہوائیں آپ کو اپنی لپیٹ میں لیں وہ بے اثر ہوں گی' جب تک آپ خود دل کی گہرائیوں سے اس کے زیر اثر نہ آجائیں۔ اگر ماں اور مٹی سے کبھی کبھار ناراضگی ہو بھی جائے تو دفن ماں کی گود یا اپنی مٹی کے پہلو میں ہی ہونا چاہیے جو ہماری پہچان کا باعث بھی ہے۔ ہمیں تنگ نظر ہونے کے بجائے وسیع النظر ہونا چاہیے اور کسی بھی طرح مغربی رجحانات' وہاں کے ادب کی پیروی اور بیرونی فیشن سے خوف زدہ ہونے کے بجائے ان کا مقابلہ بہترین ادب تخلیق کر کے کرنا چاہیے۔

عکس فن

(تین شعر)

زندگی کی مسافتوں کے بعد
تھک کے سو جائیں رت جگوں کے بعد

میرے وہ درد بھی پرائے تھے
جن کو پایا تھا مدتوں کے بعد

منزلوں پہ پہنچ بھی جائیں اگر
اور کیا ہو گا منزلوں کے بعد!

درد سے نا آشنا لوگوں سے کیا باتیں کریں
شہر نا پرساں میں ہم کس سے ملاقاتیں کریں
مسعود جاوید

Masood Javed
A-25, Munir Garden, Block-18
Gulistan-e- Johar
Karachi-75890, Pakistan

مسعود جاوید
(کراچی)

دکن کی ادبی و علمی تہذیب کی نمائندہ شخصیات میں مسعود جاوید کا نام سرفہرست ہے۔ نام ان کا محمد مسعود علی ہے۔ قلمی نام مسعود جاوید اور تخلص جاوید ہے۔ سابق ریاست حیدر آباد دکن کے ایک معروف شہر نظام آباد ان کی جائے پیدائش ہے۔ اب ہندوستان میں اس کا نام آندھرا پردیش ہے۔ 1948ء میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال سقوط حیدر آباد کے بعد نومبر میں پاکستان چلے آئے۔ یہ اپنے خاندان کے پہلے فرد تھے، جنہوں نے ہجرت کی۔ دو تین سال بعد ان کا پورا خاندان پاکستان آگیا۔ کراچی پہنچنے کے بعد اندرون سندھ اور لاہور میں ملازمتیں کیں پھر اگست 1951ء میں ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کی۔ شعبہ انجینئرنگ میں تقرر ہوا۔ راولپنڈی سے ملازمت کا آغاز ہوا تھا۔ جولائی 1985ء میں ریڈیو پاکستان اسلام آباد (ہیڈ کوارٹرز) سے بحیثیت ڈپٹی کنٹرولر (انجینئرنگ) ریٹائر ہوئے۔ اب گذشتہ بارہ تیرہ سال سے پنشن لے رہے ہیں۔

مسعود جاوید نے تعلیمی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کے والد احمد علی صاحب اپنے آبائی گاؤں راول کول کے واحد تعلیم یافتہ اور سربر آوردہ شخص تھے۔ والد صاحب نے سرکاری ملازمت بھی کی اور وکالت بھی کی۔ گاؤں میں ان کی وسیع زرعی اراضی بھی تھی، جس کی نگرانی ان کے چچا محمود علی کرتے تھے۔ مسعود جاوید کے ماشاء اللہ چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ تین بیٹے میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور ان کی بیویاں بھی۔ بڑی لڑکی فارماسسٹ ہے۔ یہ سب امریکہ میں مقیم ہیں۔ مسعود جاوید زمانہ طالب علمی میں حیدر آباد دکن کی جدوجہد آزادی میں بھی شریک رہے ہیں۔ دکن میں مسلمانوں کی تنظیم مجلس اتحاد المسلمین اور اس

کی رضاکار تحریک سے وابستہ رہے۔ ادب سے بچپن ہی سے لگاؤ رہا۔ اپنے کام پر جناب تصدق حسین صدق جائسی سے اصلاح لی جو ان کے ہائی اسکول کے زمانہ میں اردو کے استاد تھے۔ پاکستان ہجرت کرجانے کے بعد ان سے رابطہ منقطع ہوگیا۔ نثر بھی لکھتے ہیں۔ شعری مجموعہ تو شائع نہیں ہوا مگر مضامین کا مجموعہ "حدیث دلبراں" کے نام سے شائع ہوا ہے' جس میں قائد اعظم' نواب بہادر یار جنگ' سید ابو آعلیٰ مودودی اور دیگر شخصیات کے بارے میں ان کے تاثرات خاکوں کی صورت میں لکھے ہیں۔ دوسرا مجموعہ "امروز ودی" زیر طباعت ہے۔ انہوں نے "ادب اسلامی" کے اثرات قبول کئے ہیں کیونکہ بقول ان کے اردو ادب روز اول سے ہی ادب اسلامی رہا ہے پھر کسی علیحدہ تحریک کی ضرورت کیا ہے۔

ان کے اشعار اور مضامین مختلف ادبی اور ثقافتی موضوعات پر' سہ ماہی رسالہ "سیارہ" لاہور' ماہنامہ "سب رس" کراچی' مجلّہ عثمانیہ' کراچی میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ساٹھ کی دہائی میں ادب اور ثقافت کے موضوعات پر انگریزی میں بھی مضامین لکھے ہیں' جو "ڈان" کراچی' "مارننگ نیوز" کراچی وڈھاکہ السٹریڈ ویکلی کراچی میں شائع ہوئے ہیں۔

مسعود جاوید اردو کے مستقبل سے مایوس ہیں۔ کہتے ہیں "ایک دو نسلوں کی بات ہے۔ جسم کے جس عضو سے کام نہیں لیا جاتا' وہ مفلوج ہوجاتا ہے' جب تک کوئی زبان ذریعہ ء معاش سے منسلک نہ ہو' وہ پنپ نہیں سکتی۔ حیدر آباد دکن میں اردو اس لئے پھلی پھولی کہ وہاں یہ عملاً" سرکاری زبان تھی۔ سارا سرکاری اور غیر سرکاری کاروبار اس زبان میں ہوتا تھا۔ ملازمت حاصل کرنے کے لئے اس زبان کا جاننا ضروری تھا۔ ذریعہ تعلیم ابتدائی جماعتوں سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک اردو تھا۔ پاکستان میں آئینی لحاظ سے یہ سرکاری زبان ہے مگر آئین کی اس شق پر آج تک عمل نہیں ہوا۔ سارا کاروبار انگریزی میں ہوتا ہے۔ انگریزی جاننے والے شخص کو اہمیت دی جاتی ہے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکولوں کا زور ہے' جس میں مالدار طبقہ کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ آئندہ چند برسوں میں اردو صرف بولی کی صورت اختیار کرجائے گی۔ اردو میں شاعری' افسانہ' ناول وغیرہ لکھنے اور پڑھنے والے کچھ اور دن رہ جائیں گے۔ انڈیا میں کوشش کی جارہی ہے کہ اس کا رسم الخط دیوناگری کردیا جائے کیونکہ اردو کا رسم الخط عربی سے ماخوذ ہے۔ اکثریت کو اس خط سے نفرت ہے۔ اگر رسم الخط تبدیل ہوجائے تو یہ ہندی ہوجائے گی۔

بیرون ملک' مغربی ممالک اور امریکہ میں آباد اردو بولنے والے چند برسوں کے مہمان ہیں' ان کی اولاد کو اردو کی ضرورت نہیں رہے گی۔ خود میری دوسری نسل جو امریکہ میں آباد ہوگئی ہے ابھی تک اردو بول سکتی ہے مگر لکھنا پڑھنا بھولتی جارہی ہے۔ میری بڑی پوتی اب مجھے انگریزی میں خط لکھتی ہے۔

ان کا خیال ہے کہ شاعری میں 'غزل سے بہتر کوئی اور صنف نہیں۔ اس میں تخلیق کے بے حد امکانات ہیں۔ پابند نظمیں بہت کم لکھی جا رہی ہیں۔ البتہ معریٰ نظم' غزل کے بعد بہترین صنف کے طور پر ابھری ہے۔ گذشتہ پچاس برسوں میں اس صنف نے بلوغت حاصل کر لی ہے۔ نثری نظم' نہ نظم ہے نہ نثر' یہ کوئی صنف سخن نہیں۔ اس کو شاعری میں شمار نہیں کرنا چاہئے۔ یہ ایک ناکام تجربہ ہے۔ اس پر گفتگو کرنا تضیع اوقات ہے اور رہے آج کے مشاعرے! تو جناب آج کے مشاعرے اور اگلے دور کے مجرے میں کوئی فرق نہیں رہا۔ یہ تخلیقی عمل میں معاون نہیں رہا۔ البتہ ادبی نشستیں بلاشبہ تخلیقی عمل کی محرک بنتی ہیں' جہاں سنجیدگی کے ساتھ تخلیق پر تنقید و تبصرہ ہوتا ہے۔ مفید مشورے دیئے جاتے ہیں۔ ادیب کو اپنی تخلیق کو پرکھنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ آج ادب کا عمل سے رشتہ ٹوٹ گیا ہے تو جواب میں بولے کہ "ایسی بات نہیں۔ ادب اگر واقعی ادب ہے تو وہ یقیناً" عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ منفی اور مثبت دونوں طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بات ابلاغ کی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے میں نے قرۃ العین حیدر کا ناول "گردش رنگ چمن" کا دوسری بار مطالعہ کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے بے ثباتی کا رنگ اور گہرا ہو گیا ہے اور مجھ میں افسردگی کا احساس کئی گنا زیادہ ہو گیا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں ابھی تک ادب کی زندگی میں اہمیت ہے۔ البتہ ترقی یافتہ ممالک میں 'ادب کا رشتہ' عمل سے کمزور پڑ گیا ہے۔"

میرا اگلا سوال تھا کہ ہمارے ادب پر مغربی رجحانات کا رنگ زیادہ چھا رہا ہے۔ آپ کیا کہیں گے۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ "سینئر ادیبوں کی بات درست ہے مگر ذرائع ابلاغ کی بے پناہ ترقی کے سبب ہم مغرب کے رجحانات کو نہیں روک سکتے۔ ہم نے ہر شعبہ زندگی میں مغربی اثرات قبول کئے ہیں۔ ادب میں مغربی فیشن کو کیسے روک سکتے ہیں۔ مغربی فیشن اپنانے سے اگر ادب کی اثر پذیری بڑھتی ہے تو ضرور اپنانا چاہئے۔ ہم اب تک ایسا کرتے آئے ہیں۔ مثلاً" مختصر افسانہ 'مغرب کی دین ہے۔ ادیب کی نشوونما مشرقی اقدار اور روایات کے مطابق ہوئی ہے تو وہ مغرب کی بات کیسے کر سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو بے اثر ہو گی۔ ابھی مشرق اور مغرب اتنے قریب نہیں آ گئے ہیں کہ ان کے مسائل ایک جیسے ہو جائیں۔"

مسعود جاوید کی زندگی رنگا رنگ تجربات اور مشاہدات سے گزر رہی ہے۔ ایک واقعہ یاد کرتے ہوئے کہنے لگے کہ "سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ذہین اور تخلیقی صلاحیت رکھنے والے افراد کی حالت بھی عبرتناک ہو جاتی ہے۔ وہ ماتحت بھی جس پر ان کے احسانات ہوتے ہیں' سلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ دنیا بے حد کم ظرف ہے۔ امجد حیدر آبادی کی ایک رباعی سنئے۔۔

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پر فخر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

ذوالفقار علی بخاری (پطرس بخاری کے چھوٹے بھائی) جنہیں عرف عام میں زیڈ اے بخاری کہا جاتا ہے کو ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بطور ہمدردی ریڈیو کے ایسے شعبے میں مشیر موسیقی بنایا گیا تھا' جہاں پروگرام محفوظ کرنے کے لئے ریکارڈنگ ہوتی ہے' براہ راست نشر نہیں ہوتے۔ اس زمانے میں اس کا ڈائریکٹر ایک ایسا شخص تھا' جس پر بخاری صاحب کے بے شمار احسانات تھے اور وہ بخاری صاحب کی مہربانی سے اس عہدہ تک پہنچا تھا مگر اب وہ بخاری صاحب کو پر کاہ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ بخاری صاحب اپنا بیشتروقت عملہ کے مختلف افراد کے کمروں میں بیٹھ کر گزارتے تھے۔ اس شعبہ کے بڑے انجینئر سے ان کی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ نہ ہوتا تو بھی زیادہ تر اس کے کمرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے یوں ہی گپ شپ لگانے کے لئے اس کو فون کیا۔ (مسعود اس زمانے میں براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے انجینئرنگ مینجر تھے) جس شخص نے فون اٹھایا اس کی آواز مختلف تھی۔ میں نے پوچھا کون صاحب۔ جواب ملا انجینئر صاحب کا پی اے بول رہا ہوں۔ آواز بخاری صاحب کی تھی۔ ڈرامے کے آدمی تھے۔ اداکار بول رہا تھا۔ ان کی صداکاری ریڈیو کی لہروں میں ابھی تک محفوظ ہے۔ میں نے جس احسان فراموش کا ذکر کیا ہے' وہ خود کو بڑا موسیقی دان سمجھتا تھا۔ 1970ء میں وہ ڈھاکہ تشریف لائے تھے۔ بھارت اس وقت چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا اور موصوف کے آنے کا مقصد مقبول فلمی دھنوں میں بھارت کے خلاف گیت تیار کرنا تھا۔ ایک دن وہ اسٹوڈیو میں ریہرسل کر رہے تھے۔ حسب معمول میں اپنے ریجنل انجینئر کے ساتھ اسٹوڈیو میں گشت کر رہا تھا۔ ہم نے ریہرسل والے اسٹوڈیو میں جھانکا تو موصوف طعنہ زن ہوئے۔ کیسے ہیں بڑے مستری صاحب۔ ریجنل انجینئر نے بغیر کسی توقف کے فوراً" جواب دیا۔ آپ کا کیا حال ہے بڑے مراثی صاحب۔ وہ جھنجھلا کر رہ گئے۔

مسعود جاوید کے پاس یادوں کا ایک خزانہ ہے نہ صرف دلچسپ بلکہ عبرت آموز واقعات جمع ہیں کہ جنہیں کتابی صورت لانے میں پر اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہے کوئی دلدار........جو آگے بڑھے۔

عکس فن

غزل

مسعود جاوید

درد سے نا آشنا لوگوں سے کیا باتیں کریں
شہر نا پرساں میں ہم کس سے ملاقاتیں کریں

روئے گل پژمردہ ہے' باد صبا ہے نوحہ خواں
ایسے موسم میں کسی کی کیا مداراتیں کریں

روشنی تھی زندگی میں' جن کے دم سے ہر طرف
آؤ پھر اک بار مل کر یاد وہ باتیں کریں

زلف شبگوں کا تصور ہی نہ تھا کچھ کم کہ اب
اور دیوانہ' جنوں انگیز برساتیں کریں

ہم زباں کوئی نہیں ہے' راز داں کوئی نہیں
کس طرح تنہا بسر یہ ہجر کی راتیں کریں

ثلاثی

آندھیوں میں چراغ جلتا ہے
تم گئے اور پھر نہیں آئے
چاند تو ڈوبتا نکلتا ہے

نازک' سبک' حسیں ہیں
سب کچھ صحیح مجھے کیا!
میرے ہی جب نہیں ہیں

بنا لیا ہے جو میں نے مکان شیشے کا
ہر ایک ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے!

Jamal Naqvi
A-101, Block-J,
North Nazimabad,
Krachi-74700, Pakistan

جمال نقوی

کراچی

آج کے معاشرے میں افلاس، محرومی اور استحصال کے خلاف صف آراء ہونے والے شعراء اور ادیبوں میں جمال نقوی کا نام نمایاں ہے۔ دکھوں میں مبتلا اپنے جیسے انسانوں کا غم ان کا اپنا غم ہے اور جسے محسوس کرکے جمال کہتے ہیں۔

جو ہم نہیں تو جمال اور کوئی ہم جیسا
غموں کی دھوپ میں اکثر دکھائی دیتا ہے

اردو زبان و ادب سے ان کی محبت ان کے خمیر میں گھلی اور رچی بسی ہے۔ 8/ اکتوبر 1946ء میں لکھنؤ (ہندوستان) کی سرزمین پر جنم لینے والے سید علی حسین نقوی نے تعلیم بھی علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی اور 1969ء میں میکنیکل انجینئرنگ میں بی ای کیا۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈپلومہ 1985ء میں برطانیہ سے حاصل کیا۔ اب سینئر مینجر (پلاننگ و ڈیولپمنٹ) کی حیثیت سے کراچی شپ یارڈ سے وابستہ ہیں۔

لکھنؤ اور علی گڑھ کی ادبی فضا میں جمال کی فکر کو جلاء ملی۔ لکھنؤ کے مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا اور انہوں نے احتشام حسین، جوش ملیح آبادی اور جعفر علی خاں اثر کی صدارت میں مشاعرے پڑھے۔ علی گڑھ میں نوجوانوں کی انجمن "ہمراہی" کے بانیوں میں جمال کا نام بھی ہے۔ یونیورسٹی میگزین "غالب نمبر" کی مجلس ادارت کے لئے آل احمد سرور نے انہیں منتخب کیا۔ 1970ء میں کراچی منتقل ہونے کے بعد ماہنامہ "اردو انٹرنیشنل" کے بانی مدیر رہے۔ آجکل ماہنامہ "منشور اور رعنائیاں" کے معاون مدیر ہیں۔ افکار، طلوع افکار اور سہ

ماہی اقدار میں تبصرے لکھتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے بھی ان کے تبصرے براڈ کاسٹ ہوتے ہیں۔ کئی ادبی و سماجی انجمنوں سے وابستہ ہیں اور اعزازی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

انہیں ان کی ادبی و سماجی خدمات کے عوض سماجی اور ادبی انجمنوں کی جانب سے تخلیق ایوارڈ برائے شاعری 1994ء گولڈن جوبلی ایوارڈ برائے ادب 1997ء کے علاوہ بھی کئی ایوارڈز مل چکے ہیں۔ جمال کا شعری مجموعہ "مکان شیشے کا" 1987ء میں شائع ہوا ہے۔ انگریزی مضامین کا مجموعہ "انجینئرنگ ہو رائزن" 1995ء میں شائع ہوا۔ نصف درجن سے اوپر کتابیں زیر طبع ہیں، جن میں شعری مجموعہ، ہائیکو، علمی و ادبی مضامین، سائنسی مضامین اور تبصرے وغیرہ شامل ہیں۔

جمال کی شاعری ترقی پسند مکتب فکر سے متاثر ہے یعنی ادب برائے زندگی لیکن ادب میں کسی ازم کے قائل نہیں لیکن گل و بلبل اور صیاد کے تذکروں سے بھی گریزاں رہے ہیں۔ شاعری کے علاوہ انہیں تنقید و تبصروں سے دلچسپی ہے۔

جمال اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ بیان کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ "کراچی میں کامریڈ جمال نقوی اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے کافی معروف تھے۔ میں یہاں نووارد تھا۔ جب میرا پہلا مجموعہ کلام "مکان شیشے کا" شائع ہوا تو میں جمیل الدین عالی صاحب کے دفتر گیا۔ پرچہ بھجوایا تو انہوں نے فوراً بلوا لیا۔ میں نے کتاب پیش کی انہوں نے کہا..... "اچھا آپ کو جمال نقوی صاحب نے بھیجا ہے۔"

میں نے عرض کیا..... "جناب عالی میں خود جمال نقوی ہوں۔ فرق یہ ہے کہ وہ پروفیسر ہیں اور میں انجینئر۔"

جمال اردو کے مستقبل سے پرامید ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ "تمام رفقائے اردو اس سے اپنی محبت کا ثبوت اس طرح دیں کہ بزرگ نوجوانوں کی صحیح طور پر تربیت اور رہنمائی کریں اور نوجوان بزرگوں کی عزت اور ان کے ادبی اثاثے کی قدر کریں۔ مغربی زبان اور علم سے فیض اٹھانے کے ساتھ ہی مشرقی تہذیب و ثقافت اور اقدار و زبان کو قائم رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم اس پر کاربند رہیں تو اردو کا مستقبل تابناک ہوگا اور اردو کی ترویج و ترقی کے لئے مشاعروں اور تخلیقی و تنقیدی نشستوں، دونوں ہی کی اہمیت مسلم ہے۔ مشاعرے عوام کو ادب کی طرف راغب کرتے ہیں اور تخلیقی و تنقیدی نشستیں شعراء کے کلام میں پختگی پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح ادب کی تخلیق میں دونوں ہی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔"

جمال کے کہنے کے مطابق..... "بات یہ نہیں ہے کہ ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے بلکہ ہمارے معاشرے میں خود انسان عمل سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ہم لوگ باتیں زیادہ کرتے ہیں اور عمل کم ورنہ آج تخلیق کیا جانے والا ڈرامہ، افسانہ اور نغمہ یعنی شاعری سب ہی عملی

زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ہم یہ ڈرامے اور نغمے ٹی وی اور فلم کی اسکرین پر دیکھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ اس سے سبق نہیں حاصل کرتے اور اس پر عمل نہیں کرتے۔ آج تو غزل میں بھی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔" آج اگر غالب ہوتے تو انہیں یہ شکوہ نہیں ہوتا کہ۔

کچھ اور چاہئے وسعت مجھے بیاں کیلئے

اور آج کا قاری اگر کتاب سے دور ہوا ہے تو اس کی وجہ ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ ہیں۔ اب ادب کو نئے ذرائع ابلاغ کا استعمال کرنا پڑے گا' اس میں اس کی بقا کا دارومدار ہے۔

آپ کے آخری سوال کے جواب میں عرض ہے کہ "میں بزرگ ادباء کی اس رائے سے متفق ہوں۔ ہمیں مغربی ادب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان کی تکنیک ضرور سیکھنا چاہئے لیکن مائل' حسیت اور احساس و شعور ہمارے اپنے ہونا چاہئیں ورنہ ہماری تخلیقات حقیقت کے بجائے مصنوعی ہو جائیں گی اور ان میں جاذبیت ختم ہو جائے گی اور قاری اس سے دور ہوتا چلا جائے گا جو آج کل ہمارے ادب کے ساتھ ہو رہا ہے۔"

جمال شاعری میں غنائیت کے قائل ہیں۔ اظہار خیال کے لئے نظم اور غزل دونوں کو بہتر قرار دیتے ہیں۔

عکس فن

ویران گلیاں

گلیاں ہیں ویران
گھر میں سہمے ہیں انسان
دروازوں پر خوف کے پردے
اندھے روشندان
کہیں کوئی ذی روح نہیں ہے
چرند' پرند بے جان
سب دوکانیں بند پڑی ہیں
سب رستے سنسان
ایسی بستی سے بہتر ہے
جنگل' بیابان

سچ کا زہر

سب یہ کہتے ہیں کہ
سچ بات ہی لکھی جائے
سوچ مثبت ہو
اور حق بات ہی بولی جائے
سچ اگر لکھ دیں
تو خوش کوئی بھی ہوتا ہی نہیں
سچ ہے وہ زہر
جسے کوئی بھی پیتا ہی نہیں
اس لئے
سچ تو کوئی شخص بھی کہتا ہی نہیں
اور قلمکار
جو سوچے اسے لکھتا ہی نہیں

کبھی میں تم سے نظاروں کی بات کرتا تھا
اور اب تمہاری۔ نظاروں سے بات کرتا ہوں

جوہر غوری

Jauher Ghori
2550 E College Place #105
Fullerton. C.A. 92631
U.S.A.

جوہر غوری

لاس اینجلس

نام ان کا وسیم احمد خان غوری ہے۔ عرفیت نواب اور تخلص جوہر ہے۔ پیر 29 نومبر 1930ء میں سہارن پور (یوپی) ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول کا امتحان مودی ہائی اسکول مودی نگر (میرٹھ) سے 1947ء میں پاس کیا۔ پھر بی اے تک پنجاب یونیورسٹی میں تحصیل علم کیا اور آخر میں یعنی 1964ء میں جامعہ کراچی سے ایم اے (اردو) میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔

ملازمت کی ابتداء اے جی پی آر سے کی' جہاں محترم جمیل جالبی' ڈاکٹر فرمان فتح پوری' سجاد باقر رضوی وغیرہ ان کے ہم جلیس تھے۔ 1960ء میں بہتر ملازمت حاصل کرنے کی غرض سے زرعی ترقیاتی بینک (ADBP) میں درخواست دی اور وہاں دوسری ملازمت اختیار کی۔ اسی ملازمت میں درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے ڈائریکٹر کے عہدے پر پہنچے اور اسلام آباد (ہیڈ آفس) سے نومبر 1990ء میں ریٹائر ہوئے۔

جوہر غوری کے آباؤ اجداد بادشاہ محمد شہاب الدین غوری کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ وہ افغانستان کے شہر غور سے تعلق رکھتے تھے' اسی لئے غوری کہلائے۔ ہندوستان آکر وہ ضلع بجنور کے گردونواح میں آباد ہوئے۔ ان کے والد علی احمد خان (مرحوم) بی اے (علیگ) تھے اور غلام محمد' ناظم الدین (گورنر جنرل سابقہ) کے ہم عصروں میں تھے۔ یہ پانچ بھائی اور ایک بہن ہیں' جن میں آغا ناصر اور شمیم جاوید قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر نے بہ حیثیت شاعر 1948ء سے 1956 تک پاکستان میں بہت شہرت پائی اور ان کا شمار صف اول کے شعراء میں ہوتا تھا۔ آغا ناصر ان کے چھوٹے بھائی ہیں اور بہت ادب نواز ہیں۔ وہ ٹی وی کے ایم ڈی اور ریڈیو پاکستان کے ڈی جی کے مرتبہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ غوری کہتے ہیں ....

کہ انہوں نے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے باوجود اس سے خاطر خواہ افادہ نہیں کیا۔ درس و تدریس سے تعلق کم رہا صرف جامعہ اسلامیہ کالج میں چند ماہ لیکچرار شپ کی۔ ہاں البتہ شاعر ہونے کے ناتے ان کے اشعار خاص طور پر سیاسی نظمیں اور قطعات وغیرہ رسالوں اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے، جن میں ماہنامہ ماہ نو، ہفت روزہ حریت اسلام آباد کوپن ہیگن، روزنامہ جنگ، نوائے وقت راولپنڈی، کراچی، پاکستان لنک، پاکستان ٹوڈے اور اردو ٹائمز، نیویارک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ البتہ دوران جنگ دو مثنویاں تخلیق کی تھیں، جن کے نام "جنگ کشمیر" اور "جنگ اسرائیل و عرب" ہیں۔ یہ دونوں کتابیں شائع ہونے کے ایک ماہ کے اندر تمام فروخت ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ایک اور مثنوی "بوٹا سنگھ" (قصہ گل بکاؤلی کی طرز پر) لکھی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا مشغلہ اخبارات کا مطالعہ کرنا اور اس کی روشنی میں نئے نئے انداز سے سیاسی قطعات، نظمیں، غزلیں تخلیق کرنا ہے۔ انہوں نے کچھ سال قبل چند لطائف کو بھی منظوم کیا تھا مگر وہ وجہ شہرت نہیں رہیں۔ یورپ اور امریکہ کا منظوم سفرنامہ بھی تحریر کیا جو کافی پسند کیا گیا۔

شاعری کے علاوہ انہیں فن موسیقی اور گلوکاری سے بھی بہت دلچسپی ہے۔ عہد شباب میں ان کی آواز بہت سریلی تھی۔ اپنے اشعار بھی ترنم سے پڑھا کرتے تھے اور اکثر قوالیاں اور غزلیں ہارمونیم پر گاتے تھے۔ ـــــ نانا جان جناب زین العابدین خان (مرحوم) عابد جب بھی ان کے شہر آتے تھے تو ان سے ہر رات ندرت میرٹھی، بہزاد لکھنوی، جگر مراد آبادی وغیرہ کی غزلیں سنا کرتے تھے۔ وہ اکثر ایک منی مشاعرہ بھی گھر پر منعقد کیا کرتے تھے۔ ان سب بھائیوں اور بہن کو مصرع طرح دے کر غزل لکھنے کی فرمائش کرتے اور مشاعرہ کے اختتام پر بحیثیت صدر مشاعرہ خود بھی اپنے کلام سے نوازتے تھے۔ ان سب کو شاعری سے دلچسپی نانا جان (مرحوم) کی بدولت پیدا ہوئی۔

جوہر غوری کی زندگی دلچسپ اور قابل ذکر واقعات سے بھری پڑی ہے مگر جوش مرحوم کے حوالے سے کہتے ہیں۔ "ایک مرتبہ دہلی میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس میں یوپی کے تمام اسکولوں کے طلباء مدعو تھے۔ انعام میں شیلڈ وغیرہ بھی رکھی گئی تھی۔ مجھے میرے اسکول نے اس میں حصہ لینے کے لئے بھیجا۔ میں نے ایک غزل سنائی، جو بے حد پسند کی گئی۔ خوب داد وصول کی اور آخر میں شیلڈ بھی میرے اسکول کو دی گئی۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے مجھے اپنا کلام "فرط و نشاط" عنایت کیا اور اردو شعراء کا ایک البم بھی دیا، جو آج تک میرے پاس بطور یادگار موجود ہے۔"

اردو کے مستقبل کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ صرف پاکستان اور بھارت ہی کی زبان نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی زبان ہے اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ

رہی ہے۔ ہندوستان میں تمام تر مشکلات کے باوجود اردو کی اب بھی پذیرائی ہے۔ بڑے بڑے نامور ہندو شعراء اور ہندو نثر نگاروں نے اردو کی بہت خدمت کی ہے۔ اگر اردو نہ ہوتی تو ہم غالب کو نہ جانتے اور غالب نہ ہوتے تو علامہ اقبال بھی نہ ہوتے اور آج اردو کے ہزاروں نامور شعراء اور نثر نگاروں کا وجود بھی نہ ہوتا۔

غالب اور اقبال پر اردو میں جس قدر تحقیقاتی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں' وہ ہمارے لئے بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ یہ زبان اس قدر شیریں اور عام فہم ہے کہ بہت سے غیر ملکی بھی اس کو سیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے گانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو ہمیشہ قائم دائم رہے تو میرا مشورہ ان والدین سے (جو غیر ممالک میں قیام پذیر ہیں) یہ ہے کہ اپنی اولاد سے گھر پر اردو میں گفتگو کریں اور اگر وہ نہیں سمجھتے تو انہیں اردو سکھائیں ورنہ میرے اس قطعہ کو پیش نظر رکھیں۔

یہ بزم شعر و سخن اور جشن موسیقی
تمہارے دم سے ہے قائم نظام اردو کا
مگر تمہاری نئی نسل کل تمہارے بعد
نہ لائیگی کبھی ہونٹوں پہ نام اردو کا

مجھے ڈر ہے کہ کہیں خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے پیاری زبان اردو کو زمین میں دفن کردیں اور نئی نسلیں مغربی لٹریچر میں گم ہو کر مشرق کی اس مقبول ترین زبان کو ہمیشہ کے لئے فراموش کریں۔

جوہر غوری اظہار خیال کے لئے قطعات یا مختصر نظم کو بہتر ذریعہ اظہار سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں "طویل نظم پڑھنے یا سننے کے لئے آج کل لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے۔ قطعہ حقیقت میں خیالات اور جذبات کو ایک جگہ اس طرح بیان کرنے کا نام ہے' جیسے دریا کو کوزے میں بند کردیا۔ یہ سامعین اور قارئین کے دلوں پر بہت گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ ہاں میں نثری نظم کے مخالفین میں سے ہوں۔ اسے میں نظم نہیں بلکہ کسی تقریر کا کوئی حصہ سمجھتا ہوں' جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے تو اس دور میں مشاعرے کبھی کبھی منعقد ہوتے ہیں جبکہ ادبی نشستیں تواتر کے ساتھ ہوتی رہتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ادب کی ترقی اور تخلیق میں ادبی نشستوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس میں بہت سے شعراء اور ادیب اپنی نئی تصانیف سے بھی متعارف کراتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ ادبی نشست ہر شہر بلکہ ہر محلہ میں منعقد ہوتی رہنی چاہیے تاکہ عوام الناس ادبی ارتقاء سے واقف ہوتے رہیں۔ مشاعروں کی اہمیت قرون اولی میں بہت تھی مگر اب کبھی کبھی ایسی محفلیں وطن یا وطن سے باہر ممالک میں جمتی ہیں' جن سے سامعین بہت محظوظ ہوتے ہیں اور استفادہ بھی کرتے ہیں مگر ادبی نشستوں کی بات ہی کچھ اور

ہے۔ اس میں شاعر اور ادیب کی تخلیق پر تبصرے بھی ہوتے ہیں، جن سے وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہو کر اصلاح کرتے رہتے ہیں اور پھر اپنی تخلیق کو زیادہ بہتر طور پر پیش کرتے ہیں۔"

میرے اگلے سوال کے جواب میں کہنے لگے کہ غالباً" آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اب ادب زندگی کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا اور وہ پھر قرون اولیٰ کی طرح ادب برائے ادب بن کر رہ گیا ہے۔ میں اس خیال سے بالکل متفق نہیں ہوں۔ دراصل ادبی تخلیقات کی یوں تو بہت سی قسمیں ہیں مثلاً" مذہبی ادب، اشتراکی ادب وغیرہ مگر اس کی دو خاص قسمیں ہیں۔ یعنی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی۔ دور حاضر کا ادب زندگی کا ترجمان ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اب ہمارے قارئین کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ سائنسی دور ہے، ہر انسان بے حد مصروف زندگی بسر کر رہا ہے اور ایک مشین بن کر رہ گیا ہے۔ اس لئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ادبی تخلیقات کے مطالعے سے کٹتا جا رہا ہے مگر صحیح ادبی ذوق رکھنے والے حضرات اب بھی ان تخلیقات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض مرتبہ یہ ہی پر اثر ادبی تخلیقات معاشرہ میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا سبب بن رہی ہیں۔ خاص طور پر سیاسی تبصرہ نگار ملک کے معاشرہ اور سیاسی حالات پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ شاعری اور نثر نگاری کو اب اختصار کے ساتھ پیش کرنا زیادہ بہتر سمجھا جاتا ہے کیونکہ انسان کے پاس وقت کی کمی ہے۔ اب ضخیم ناولوں طویل افسانوں، ڈراموں اور داستانوں کی جگہ ڈائجسٹ یا اخبارات و رسائل نے لے لی ہے جو پر اثر تخلیقات مختصر بنا کر شائع کرتے ہیں اور قاری کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اس لئے میں اس کلیہ سے متفق نہیں ہوں کہ ادب بے اثر ہوتا جا رہا ہے یا اپنی افادیت کھو رہا ہے۔ ادب برائے زندگی اب بھی زندہ ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور بام ترقی پر گامزن رہے گا۔

جوہر غوری کہتے ہیں کہ "ہمارا ملک اسلامی نظریہ پر قائم ہوا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ اپنی تخلیقات میں زیادہ سے زیادہ مشرقی تہذیب کے اوصاف اجاگر کریں، جہاں تک مغربی تہذیب و تمدن کا تعلق ہے، وہ سب ہمارے اسلامی معاشرہ کا ہی مرہون منت ہے۔ وہاں لوگ زیادہ سے زیادہ حصول تعلیم پر، نفاست، تنظیم اور ڈسپلن پر اور ایک دوسرے کی ہمدردی اور امداد کرنے پر توجہ دیتے ہیں۔ ہاں فرق ہے تو صرف بے پردگی، بے حیائی اور شراب نوشی کا ہے، جو اسلام میں حرام قرار دی گئی ہیں اور جن کے اثرات معاشرہ پر بہت برے پڑتے ہیں۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ جو خوبیاں اور اوصاف مغربی دنیا نے ہم سے مستعار لئے ہیں، وہ آج ہم سب میں بہت کم ہیں، اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم مغرب سے نئی ادبی تکنیک سیکھیں مگر

اپنے مسائل اور روزمرہ کے کاموں میں مشرقیت اور خاص طور پر اسلامی اصولوں کو اپنانے کی کوشش کریں۔ بس یہی ہمارے لئے اعلیٰ معیاری ادب کہلا سکتا ہے۔

عکس فن

غزل

ٹوٹا آخر سیاہ شب کا غرور
پھوٹ نکلا طلوع صبح کا نور

عارضی حسن پہ ہے ناز اسے
اور مجھے عشق دائمی پہ غرور

کون فردا میں رنگ و نور بھرے
میں بھی لاچار آپ بھی مجبور

جو بھی سرکش ہو کاٹ دو گردن
اب سیاست کا ہے یہی دستور

وہ بھی شامل ہیں اب حکومت میں
جن کو کوئی نہیں سیاسی شعور

وہ ہی اب کچھ بدل گئے شاید
یا میری آنکھ کھو چکی ہے نور

Iqbal Haider
Sector 15- A/3
Bufferzone, North Karachi
Karachi, Pakistan

اقبال حیدر

کراچی

میں موسیقی سن رہی تھی۔ بہت پرسوز گیت تھا۔ مغنیہ کی آواز بھی دل کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی۔ ایک بے چینی سی تھی۔ میں نے کچھ بکھرے کاغذ اٹھا لئے۔ میرے سامنے الفاظ رقص کر رہے تھے۔

چھوٹ گیا وہ ہاتھ
میری ہتھیلی جلتی ہے
میرے دل کے ساتھ

اونچے ہوئے مکان
لیکن ہم سے روٹھ گئے
آنگن اور دالان

میرا من بھی پاپی ہے
لیکن میری کوئی تو چھوٹی موٹی لغزش
موسم کے بھی سر جائے

موسیقی پیچھے رہ گئی۔ میں نے ورق الٹے۔ اب میرے سامنے "پچاس برس" کے عنوان سے پاکستان کی پچاسویں سالگرہ پر حال ہی میں کہی گئی غزل تھی۔

نہ دل کی فکر نہ جاں کی خبر پچاس برس
تلاش کرتے رہے اپنا گھر پچاس برس

نظر کے سامنے مسند نشیں بدلتے رہے
ہمارے بدلے نہ شام و سحر پچاس برس

ہم اپنے بارے میں کیا سوچتے' رہا ہے سدا
ہمارے کاندھے پہ اوروں کا سر پچاس برس

ہوئے جو قافلہ سالار' اجنبی ٹھہرے
ہم ان کے پیچھے چلے بے خبر پچاس برس

دعائیں مانگ رہے ہیں اب آدھے گھر کیلئے
بچا کے رکھ نہ سکے پورا گھر پچاس برس

مغنیہ تو جانے کہاں رہ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر بے خبری میں کب سوئچ آف کر دیا کہ خاموشی چھا جائے مگر خاموشی کہاں تھی؟ میرے اپنے اندر چیخیں تھیں' کراہیں تھیں نالے تھے۔ میرے سامنے ہجرتوں کے منظر تھے' بے گھر لوگ تھے۔ وہ جو گھر بسانے کی آرزو میں آنسوؤں اور لہو کا سمندر پار کر کے آئے تھے اور اب بھی یعنی پچاس سال بعد بھی بے گھر تھے' بے چھت تھے۔

یہ منظر کشی نہ تھی۔ یہ سچی تصویریں تھیں جو اقبال حیدر نے اشعار کی صورت میں ہم سب کے سامنے رکھی ہیں۔ ایک سچا شاعر اور کیا کرے گا اگر اس کے دامن میں آنسو ہیں اور مایوسی کے کانٹے ہیں تو ہمارے حصے میں بھی وہی کچھ آئے گا' جو اسے ملا ہے' وہی تو وہ ہمیں لوٹائے گا نا!

میں نے اقبال حیدر کو سامنے بٹھا لیا ہے میں ان سے پوچھتی ہوں۔ ''آپ نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ بہت خوبصورت غزلیں کہی ہیں اور پیاری پیاری دل کو چھو لینے والی نظمیں بھی۔ پھر ہائیکو کی طرف کیسے نکل آئے؟''

اقبال بتاتے ہیں کہ انہوں نے پاکستان کے مختلف صوبوں کے شعراء کو یک جہتی کی لڑی میں پرونے کے لئے ہائیکو کی طرف زیادہ توجہ دی۔ جیسے ہم ہائیکو میں دالان' مکلی وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ مکلی سندھ میں ایک تاریخی مقام ہے۔ سرحد میں رہنے والا شاعر مکلی سے متعارف ہوگا اور یوں تاریخی شعور کے ساتھ ایک ادبی بندھن بھی مضبوط ہوگا۔ اسی بناء پر ''پاکستان ہائیکو سوسائٹی'' کی بنیاد ڈالی' جس کے تحت ماہانہ ادبی جلسے منعقد کرائے۔ سندھ پشتو' بلوچی' سرائیکی' فارسی' پنجابی اور اردو میں کہی گئی ہائیکو کا آپس میں ترجمہ کروایا گیا تاکہ

ان زبانوں کا ملاپ ان زبانوں کے بولنے والوں کو بھی قریب لا سکے۔

اقبال حیدر بتا رہے تھے کہ جب ٹی وی پروڈیوسر کی حیثیت سے کوئٹہ ان کا تبادلہ ہوا تو 1991ء میں کوئٹہ میں جاپانی قونصل خانے کے ثقافتی مرکز اور پاکستان جاپان دوستی کی انجمن کے زیر اہتمام بلوچستان کا دوسرا ہائیکو مشاعرہ منعقد ہوا' جس میں اردو کے علاوہ انگریزی پنجابی سرائیکی' فارسی' براہوی اور بلوچی زبانوں میں ہائیکو پڑھی گئیں۔ ان میں تراجم اور طبع زاد ہائیکو تھیں۔ اقبال حیدر نے ہائیکو نگاری کے موضوع پر ایک سیر حاصل مقالہ پڑھا۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔ اس وقت کے قونصل جنرل جاپان جناب ایماگاوا نے اس بات پر انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور اقبال حیدر کی کوششوں کو سراہتے ہوئے انہیں "سفیر ہائیکو" کا خطاب دیا۔ اقبال حیدر اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام کے مجموعہ کی اشاعت کو پس پشت ڈال دیا اور ہائیکو سوسائٹی کے بانی چیئرمین ہونے کے ناطے اس کی ترویج میں لگ گئے اور ہائیکو شاعری کا تمام پاکستانی زبانوں کے علاوہ کئی بین الاقوامی زبانوں میں بھی ترجمہ اور اشاعت کا اہتمام کرتے رہے۔ اب جا کر اپنی حمد و نعت' غزل و نظم اور ہائیکو کے مجموعے اشاعت کے لئے ترتیب دے رہے ہیں۔

سید اقبال حیدر شاہ 2 جون 1948 الہ آباد کے پاس ریاست (مدھیہ پردیش - ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ دو عشروں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اقبال حیدر تخلص کرتے ہیں۔ جامعہ کراچی سے اردو ادب اور صحافت میں ایم۔ اے کر چکے ہیں۔ گذشتہ 23 برس سے پاکستان ٹیلی وژن سے بحیثیت پروگرام پروڈیوسر وابستہ ہیں۔ بے شمار ڈرامے سیریلز' موسیقی کے پروگرام اور مذہبی پروگرام کئے اور ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔ اندرون اور بیرون پاکستان بحیثیت شاعر اور میزبان مشاعرہ شرکت کر چکے ہیں۔ اسی سلسلے میں عالمی مشاعرے بھی پڑھے۔ پاکستان کے تمام اہم ادبی جریدوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں..... "اردو قائم رہے گی' جب تک دنیا قائم ہے۔ اس زبان نے اپنا مقام خود بنایا ہے' لہٰذا اس کی فنا کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

نثری نظم کو ایک تجربہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تجربہ کامیاب ہو سکتا ہے اگر شاعری کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو۔ مشاعروں کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ ادب کے فروغ کا ذریعہ ہیں جبکہ نشستیں ادب کی تفہیم میں معاون ہیں۔

اقبال کا خیال ہے کہ ادب کا تعلق عمل سے تو نہیں ہاں ایمان یا نظریہ سے کٹ گیا ہے۔ جس طرح عمل علم کے بغیر مجہول ہے۔ اسی طرح ادب اور علم بھی ایمان یا نظریے کے بغیر بے معنی ہے اور ایسے ادب کا رشتہ قاری سے ٹوٹ گیا ہے ورنہ تو آج بھی سچے ادب اور قاری کا بندھن سلامت ہے۔

آخری سوال کے جواب میں اقبال حیدر کہتے ہیں.... "ہم نے تقریباً" تمام اصناف اردو میں دیگر زبانوں سے اور خصوصاً" مغرب سے در آمد کی ہیں سوائے ہائیکو کے جو مشرق سے در آمد کی ہے لیکن موضوعات اور مسائل اگر ہمارے اپنے تناظر میں نہیں ہیں تو ایسا ادب نافع نہیں ہے بلکہ اجنبی ہے۔ سو ہم صنف کسی بھی زبان کی اختیار کریں، ہمیں اپنی عصری حیثیت اور ماحول کے مطابق اظہار کرنا چاہئے۔"

حمد

دنیا کے سب رنگ اسی کے جس نے رنگ بنائے ہیں
اپنے ہی گھر کے چاروں جانب آٹھوں پہر سجائے ہیں
آنکھیں بھی اپنی جیسی ہیں باتیں بھی اپنی جیسی
اس گھر آنگن میں لگتا ہے سب اپنے ماں جائے ہیں

نعت

جلوہ ء شہر نبیؐ دل کے نہاں خانے میں ہے
اب بھی وہ صبحیں وہ شامیں دیکھتا رہتا ہوں میں
میں نے جن آنکھوں سے دیکھی ہیں سنہری جالیاں
آئینے میں اب وہ آنکھیں دیکھتا رہتا ہوں میں

ہائیکو

جھوٹ ہیں سارے ڈر
سب سے بڑا سچ دنیا میں
اللہ اکبر

عکسِ فن

نظم

۱

دھڑکنوں کا مقدر رہے ہیں یہ کشادہ دلان کراچی
دلبروں کے بھی دلبر رہے ہیں یہ کشادہ دلان کراچی

ہر گھڑی جی رہے مر رہے ہیں یہ کشادہ دلان کراچی
زندگی اب تو یوں کر رہے ہیں یہ کشادہ دلان کراچی

آنکھ سے روشنی چھن رہی ہے اور ہونٹوں پہ چپ سی لگی ہے
اپنے سائے سے بھی ڈر رہے ہیں یہ کشادہ دلان کراچی

خشک موسم ٹھہر سا گیا ہے العطش العطش کی صدا ہے
چاہتوں کا سمندر رہے ہیں یہ کشادہ دلان کراچی

جو بھی آیا گلے سے لگایا اس کا گھر اپنے ہاتھوں بنایا
اور خود گھر سے بے گھر رہے ہیں یہ کشادہ دلان کراچی

رہنماؤں کو اب ڈھونڈتے ہیں ایک اک سے پتہ پوچھتے ہیں
کبھی سب کے ہی رہبر رہے ہیں یہ کشادہ دلان کراچی

لفظوں کی براق نہ جس کو چھو پائی
جانتا ہوں وہ ایک خیال اچھوتا تھا

Amin Khayal
Gul Nagar, Block-Z
House No34, Sec-11, Peoples Colony
Gujranwala, Pakistan

امین خیال
گجرانوالہ

شاعری اگر چاند ہے تو امین خیال اس کے چکور ہیں۔ انہیں اپنے وطن کی مٹی سے اتنا پیار ہے کہ دوہے کہیں یا گیت۔ ماہیے گنگنائیں یا ٹپے گائیں پہلے اپنی مٹی کی بات کریں گے۔ اپنے وطن کی عظمت کو سلام کریں گے اور پھر اپنی ذات کا حصار باندھیں گے۔

غزل میں امین خیال نغمگی کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ دو مصرعوں میں امین خیال کے خیال کی اڑان ملاحظہ ہو ـــ

اس کے آنے کی سدا امید رکھ
دل کا دروازہ کبھی بھیڑا نہ کر

دوری کا غم جی کو بڑا کاٹتا ہے اور ایسے میں کسی بھی اپنے کے خط کا اس شدت سے انتظار رہتا ہے کہ منڈیر پر کاگا کی آواز سننے کی ہڑک جاگ اٹھتی ہے اور خط آئے تو نصف ملاقات کا تصور بندھ جاتا ہے مگر اس نصف ملاقات کے بعد لمبے ہجر کا دکھ سہنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ اس کرب کو کچھ وہی سمجھ بھی سکتا ہے جس نے ہجر کی طولانی کے زخم کھائے ہوں ـــ

جن کو پڑھ کے چاہتیں مغموم ہوں
ایسے خط پردیس میں لکھا نہ کر

انہوں نے چھوٹی بحر میں بھی بڑی پیاری غزلیں کہی ہیں۔ صاف، ستھرا سبک لہجہ اور روزمرہ کی زبان جیسے ہر شعر میں موتی پروئے ہیں۔ ایک غزل سے یہ اشعار دیکھیں ـــ

آدم کی اولاد کی اب
سانپوں جتنی ذاتیں ہیں

کون کسی کا ہوتا ہے
سب کہنے کی باتیں ہیں

اس کا لہجہ' اس کی بات
خوشبوئیں باراتیں ہیں

آیئے پھر گجرانوالہ چلتے ہیں۔ امین خیال سے ملتے ہیں اور ان کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ سوالنامہ ان کے سامنے ہے۔ وہ کہتے ہیں۔۔۔۔ "میرا پورا نام محمد امین تخلص خیال اور ادبی نام امین خیال ہے۔ اسکول سرٹیفکیٹ کے مطابق 14/ اکتوبر 1932ء کو گرجاکھی گوجرانوالہ میں پیدا ہوا۔ یہ میرا آبائی وطن ہے۔ ابتدائی تعلیم گرجاکھی ہی میں حاصل کی۔ میٹرک ایم۔ اے اسلامیہ ہائی اسکول گوجرانوالہ سے کیا۔ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں داخلہ لیا لیکن بوجوہ کالج چھوڑنا پڑا پھر پرائیویٹ طور پر بی۔ اے' آنرز اردو اور پنجابی میں کیا۔ محکمہ تعلیم میں بطور معلم اکتیس سال تک خدمات انجام دیں اور پانچ سال پہلے ریٹائرمنٹ حاصل کرلی۔"

شاعری کے علاوہ تحقیق اور تنقید بھی لکھتا ہوں اور ادبی صحافت میں بھی دلچسپی ہے۔ ہر اس مکتب فکر سے متاثر ہوں جو عملی طور پر سچائی کا علمبردار ہے اور میری شاعری بھی۔ تقریباً سبھی مقتدر رسالوں اور اخباروں میں میری نگارشات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اب تک میری اردو اور پنجابی کی نظم و نثر میں گیارہ کتابیں چھپ چکی ہیں' جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ کن من (اردو شاعری) من کی جوت جگے (دوہے) یادوں کے سفینے (اردو ماہیے شرلاٹے' سولاں سر سرداری (پنجابی غزلاں) جماسے (پنجابی نظماں) پھہاراں (بولی' ٹپہ) ماہیا' دوہا' چو مصرعی وغیرہ) مٹھڑے نیں بول (احادیث کا منظوم ترجمہ) گلاں دین اسلام دیاں (نثر' طہارت وضو' نماز وغیرہ کے متعلق ابتدائی فقہی مسائل) زیر طبع "تاریخ گوجرانوالہ" اور "تذکرہ پنجابی شاعرات"۔

اپنی زندگی سے کوئی دلچسپ واقعہ سنائیں گے؟ امین خیال مسکراتے ہیں' پھر کہتے ہیں۔۔۔۔ "اپنی زندگی میں تو واقعات ہی واقعات ہیں' کیا کیا بتاؤں؟ ایک اہم واقعہ عرض ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے جب قائداعظم گوجرانوالہ تشریف لائے' میں ان دنوں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور جس اسٹیج پر سے آپ نے خطاب فرمانا تھا' اس پر حفیظ جالندھری مرحوم کے "شاہنامہ اسلام" سے انتخاب میں ہی پڑھ رہا تھا۔ قائداعظم کی تھپکی لے کر میں اسٹیج سے نیچے اترا۔ پیر جماعت علی شاہ صاحب کی صدارت میں بھی نعتیں پڑھیں۔"

میں اردو کے مستقبل کے بارے میں پوچھنے لگی۔ "بھئی میں تو اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں۔" امین خیال نے بڑے آرام سے کہا۔ گو یہ ہماری قومی اور سرکاری زبان ہے جو آج تک دفتری نہیں بن سکی اور سرکار کی جانب سے اس کی ترویج و ترقی کا حال پتلا ہی ہے مگر اب یہ ایک طاقت ور عوامی زبان بن چکی ہے' اس لئے میں اس کے مستقبل سے بہت زیادہ پرامید ہوں کہ ایک دن یہ دنیا کی ضرور ہی چوتھی زبان ہوگی۔"

امین خیال کہتے ہیں' میں نے نظم' غزل' گیت اور پنجابی کی ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ زیادہ تر غزل کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے۔ نثری نظم کے سوال پر کہنے لگے' نثری نظم کی ترکیب ہی عجیب ہے۔ نثر اور نظم پر دو الگ الگ اصناف ہیں۔ اب چونکہ یہ سہولت چل ہی نکلی ہے تو میں بھی اس بھیڑ چال میں شامل ہو چکا ہوں۔ مشاعرے اور ادبی نشستیں ہر دو ادب کی تخلیق میں معاونت کا سبب ہیں۔

ادب کا قاری سے رشتہ برقرار نہیں اور ادب بے اثر ہو چلا ہے۔ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔۔۔۔ "تخلیق کاروں کے قولی اور فعلی تضاد سے یہ المیہ پیدا ہوا ہے اور اب ادب میں تاثیر سچائیوں پر عمل پیرا ہونے سے ہی پیدا ہوگی۔ بدلتے حالات' ڈش کلچر' ڈائجسٹوں کی بھرمار اور اخبارات کا گلیمر بھی اس کا سبب ضرور ہیں۔"

آخری سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ "مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق ہر دو تہذیبیں الگ الگ ثقافتیں رکھتی ہیں۔ مسائل ہر ایک کے اپنے اپنے ہوتے ہیں' جن سے شعور اور حسیات جنم لیتے ہیں۔ ان کا حل اسی ادب اور کلچر میں ہوتا ہے مگر کسی تہذیب سے تکنیک کا حصول کہیں بھی اور کبھی بھی نادرست نہیں۔"

عکس فن

دوہے

نا امریکہ، روس، جرمنی، اٹلی، نا جاپان
سارے جگ سے سندر شیتل میرا پاکستان

اس کو ڈر کا ہے کا جس دل میں ہو نا کھوٹ
سچا ہے تو چھت پر چڑھ کر کہہ ڈنکے کی چوٹ

ہر اک راجا راجا ہوگا یا راجے کا پوت
اتم آج بھی ہے اتم ہے چھوت ہے آج بھی چھوت

من اک صحرا من اک پربت من اک لالہ زار
من کے رنگ جدا ہیں من کے اپنے ڈھنگ ہزار

پیت تپسیا پیت سمسیا جیون کار پریت
پیت ہے اگنی پیت ہے جگنی پیت بناں جگ سیت

جور نہ ڈھا مجبور پر بری غریب کی ہا
من سے نکلی آگ جو انبر بھی جل جا

چھکن لاگیں ٹولیاں مہکن لاگے باگ
تو آوے تو ساجنا ہم بھی کھیلیں پھاگ

کسی سے پوچھتے کیا ہو جبینوں پر نظر ڈالو
لکیریں خود کہیں گی کس نے کتنی خاک چھانی ہے

رفیع الدین راز

Rafiuddin Raz
A-2/3, Usman Tarace
Abulhasan Ispahani Road
Metrowill - III
Karachi, Pakistan

رفیع الدین راز
کراچی

رفیع الدین راز کنول کا وہ پھول ہیں جو ناساز گار حالات اور گدلے پانی کے باوجود کھلا اور اپنی مہکار سے مشام جاں و روح معطر کئے ہوئے ہے۔ ہاں انہیں شہرت کے در کھولنے کے گر نہیں آتے تو نہ آئیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ان کا کام دیئے جلا کر روشنی بکھیرنا ہے سو وہ کر رہے ہیں۔ رفیع نے کڑی محنت کی اور بچپن سے کی۔ نہ شراب کا سہارا لیا نہ عورت کا۔ پھر انہوں نے اپنی منزل کیسے پائی؟ آیئے انہی سے پوچھتے ہیں' جن کا نام رفیع الدین بیگ ہے' تخلص راز۔ تاریخ پیدائش 21/اپریل 1938ء اور جائے پیدائش بہار (ہندوستان) کا شہر بیگو سرائے ہے۔ قائداعظم کالج ڈھاکہ سے آئی۔ کام کیا۔ پھر جامعہ کراچی سے بی۔ اے اور تاریخ عمومی میں ایم۔ اے کیا۔

رفیع بتا رہے تھے کہ "میری چھ سال کی عمر تھی کہ ابا نے دوسری شادی کرلی۔ اس حادثے نے ابتدائی عمر کو بہت متاثر کیا۔ گیارہ سال کی عمر میں چچا کے پاس ڈھاکہ آگیا۔ چچا نے تعلیم دلوانے کی بجائے بس میں کنڈیکٹر لگا دیا۔ وہ خود ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں مینجر تھے۔ پھر میں بس ڈرائیور ہوگیا۔ I.Com ڈرائیوی کے دوران کیا۔ والدین کی زندگی میں گیارہ سال کی عمر ہی میں یتیم و لیسیر ہوگیا۔

ابا اردو' انگریزی اور فارسی پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ عربی کی شدبد بھی اتنی تھی کہ تراویح میں لقمہ دیتے ہوئے کئی بار سنا گیا۔ حافظ نہیں تھے لیکن میں ان کی صلاحیتوں سے فیضیاب نہیں ہوسکا۔ میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے نہ کبھی پان کھایا نہ سگریٹ پیا نہ کبھی شراب کو ہاتھ لگایا حالانکہ میں نے گیارہ سال کی عمر ہی میں عملی

زندگی میں قدم رکھ دیا تھا اور مکمل طور پر ہر فعل کے لئے آزاد تھا۔

1967ء میں شادی ہو گئی۔ 1971ء میں سقوط ڈھاکہ کے بعد 1973ء میں پاکستان آگیا۔ کراچی کو جائے رہائش بنایا۔ 1971ء سے 1973ء کا عرصہ بال بچوں کے ساتھ جنگی قیدی کی حیثیت سے ہندوستان کے شہر میرٹھ میں گزارا۔ کراچی کے ابتدائی چند سال کچھ سخت گزرے۔ ملازمت کے علاوہ کچھ دوسرے کام بھی کرتا رہا۔ خدا کا شکر ہے' اب رہنے کو اپنا گھر ہے۔ میرے دو بڑے بیٹے حادثاتی طور پر نارمل نہیں ہیں۔ بڑا بیٹا گونگا ہے لیکن برسر روزگار ہے۔ بہت اچھا ٹائپسٹ ہے اور سرکاری ملازم ہے۔ اس سے چھوٹا بیٹا البتہ معذور ہے۔ اس کے بعد جو بیٹی ہے وہ MBBS ڈاکٹر ہے۔ دوسری بیٹی B.Com ہے۔ اس سے چھوٹا بیٹا C.A کر رہا ہے۔ سب سے چھوٹا ساتویں جماعت میں ہے۔

مجھ سے چھ سال بڑی ایک سگی بہن ہیں جو دربھنگہ' بہار میں ہیں۔ ابا نے دوسری شادی اپنی سگی چچازاد بہن سے کی تھی' لہٰذا دوسری ماں سے جو دس بھائی بہن ہیں۔ ان سے روابط ہیں اور اچھے ہیں۔ اب تک دو شعری مجموعے "دیدۂ خوش خواب" اور "بینائی" آچکے ہیں۔"

شاعری کے علاوہ رفیع راز کی افسانے سے وابستگی ہے۔ 1975ء اور 1976ء میں ان کے کئی افسانے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ پھر انہوں نے افسانہ لکھنا بند کر دیا۔ البتہ 1996ء میں ایک افسانہ "صریر" کراچی میں چھپ چکا ہے۔ شاعری میں غالب کے مکتبۂ فکر سے شعوری اور جذباتی طور پر متاثر ہیں۔ اوراق' افکار' صریر' اقدار اور سیپ وغیرہ میں ان کا کلام چھپتا رہا ہے۔

زندگی میں رونما ہونے والے ایک واقعے نے ان کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ انہیں شاعری کی راہ پر لگا دیا۔ رفیع بتاتے ہیں کہ "یہ غالباً 1966ء کی بات ہے۔ ہم چند دوست نواب پور ڈھاکہ کے ایک ہوٹل کے سامنے کھڑے تھے۔ ہم میں ایک صاحب فیاض عالم خان تھے' جو ہم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ مزاحیہ شاعر ہنرؔ کا ایک شعر سنا کر کہنے لگے۔ رفیع بھائی دیکھیں کیسا فلسفہ ہے۔ میں نے اخبار ان کے ہاتھ سے لے کر شعر پڑھا اور نہ جانے کس زعم میں ان سے کہہ گیا کہ ایسا فلسفہ تو میں بھی بیاں کر دوں گا۔ (میں نے اس سے پہلے کبھی ایک مصرعہ تک نہیں کہا تھا)۔ فیاض صاحب نے کہا اس قافیہ ردیف میں؟ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگے اگر آپ نے اس قافیہ ردیف میں ایک شعر کہہ دیا تو میں ان تمام لوگوں کو چائے پلاؤں گا' تب دو منٹ کے اندر میں نے یہ شعر کہہ دیا۔

کیوں نہ ڈر جاؤں تیری قوت سے
میں ہوں تنہا تری خدائی ہے

پہلے تو انہیں یقین نہیں آیا۔ پھر کہنے لگے اگر آپ نے پوری غزل کہہ دی تو سب کے

لئے مغلیہ پراٹھہ میری طرف سے (اس ہوٹل کا مغلیہ پراٹھہ بہت مشہور تھا) میں نے کہا بسم اللہ۔ پھر ہم اسی ہوٹل میں کونے کی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے کے اندر میں نے آٹھ شعر کی غزل کہہ دی۔ تمام مصرعے وزن میں تھے۔ تذکیر و تانیث کی ایک غلطی ہوئی تھی۔ مقطع میں "رفیع" بھی استعمال کیا تھا۔ خوش قسمتی سے رفیع مصرع کے اخیر میں لکھا گیا تھا۔ اگر کہیں رفیع مصرعہ کے بیچ میں لکھتا تو "ع" "یقیناً" گر جاتا۔ یہ محض اتفاق تھا۔

میں اپنی اس جسارت پر آج بھی حیران ہوں۔ جس شخص نے زندگی میں کبھی ایک مصرع نہ لکھا ہو' اس کی زبان سے ایسا دعویٰ۔ یہی واقعہ میری شاعری کا سبب بنا۔ اس واقعہ کو اکیس سال ہو گئے ہیں۔ آج اگر وہ لمحہ پلٹ کر پھر آجائے تو میں ایسا دعویٰ شاید نہ کر پاؤں۔ اس وقت نہ جانے کون سا جذبہ میرے پورے احساسات پہ غالب آگیا تھا۔

اردو زبان کے مستقبل کے متعلق ان کا خیال ہے کہ بلاشبہ اردو اس وقت دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے۔ زبان کے عروج و زوال میں بہت سارے عوامل کا دخل ہوتا ہے۔ جیسے سماجی زندگی کی ٹوٹ پھوٹ' جغرافیائی سرحد کی تبدیلی۔ قوموں کا عروج و زوال' معاشرتی تقاضے۔ اکیسویں صدی میں اس کی رفتار مزید تیز ہوگی۔

مشاعروں کے ضمن میں ان کی رائے ہے کہ مشاعرے میں عوام کی اکثریت ہوتی ہے' لہٰذا بڑے مشاعرے تخلیقی صلاحیت کو نہ صرف مجروح کرتے ہیں بلکہ انحطاط کی طرف بھی لے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تخلیقی نشستیں بہتر کردار ادا کرتی ہیں۔

راز کہتے ہیں کہ ادب کا رشتہ عمل سے کبھی نہیں کٹتا۔ ادب زندگی سے وابستہ ہے۔ زندگی بے عمل کبھی نہیں ہوتی۔ دراصل گزرے ہوئے وقت کی بہت سی باتوں سے ہمارا شعوری اور جذباتی لگاؤ بہت گہرا ہوتا ہے۔ پھر بعض عہد بہت زرخیز ہوتے ہیں۔ ہر عہد ایک جیسا زرخیز نہیں ہوتا۔ پچھلا عہد چونکہ بہت زیادہ زرخیز تھا۔ اس کے نقوش بھی ذہنوں پر بہت گہرے ہیں۔ پھر ہمارا عہد اتنا تیز چل رہا ہے کہ ہر لمحہ منظر بدل جاتا ہے' لہٰذا کوئی بھی نقش اتنا واضح نہیں ہو پاتا جو ہماری نگاہوں کو دیر تک اپنی طرف متوجہ رکھ سکے۔ میں نہیں سمجھتا کہ قاری سے رشتہ کمزور پڑ گیا ہے اور میں سینئر ادیبوں کی اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں' جہاں مادی ترقی بہت زیادہ ہوگی' وہاں موضوعاتی طور بہت زیادہ اچھا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ ہاں تکنیکی اعتبار سے بڑے سے بڑا ادب تخلیق ہو سکتا ہے۔ موضوعات تو ترقی پذیر ممالک کے پاس ہیں۔ تکنیک ہماری کمزور ہے۔ موضوعات ہم وہاں سے لینا چاہتے ہیں' جہاں اس کی کمی ہے۔ ظاہر ہے' اس طرح تو اچھا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم دل جمعی سے مسلسل اپنے مسائل' حسیات' شعور و احساسات پر طبع آزمائی کرتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم تکنیکی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے برابر نہ ہو جائیں۔

رفیع الدین راز سے رخصت ہونے سے قبل میں آپ کو ان کی غزل کا ایک وہ شعر ضرور سنانا چاہوں گی جو اپنی جگہ خود ناانصافی کی اندھیری رات میں ایک جگنو کی مانند ہے۔۔

شاید اس راہ سے جگنو کوئی گزرا ہے ابھی
تیرگی رات کی خائف سی نظر آتی ہے

عکسِ فن

غزل

وسوسہ جب دلوں میں پلتا ہے
برف چھونے سے ہاتھ جلتا ہے

بار ہستی کی شکل میں انساں
آسماں سر پہ لے کے چلتا ہے

بات ہوتی ہے صرف حدت کی
موم کیا سنگ بھی پگھلتا ہے

مہر سے ہے یہ گردش ایام
یا کوئی کروٹیں بدلتا ہے

دھوپ سے کیا بدن چرانا راز
جسم تو چاندنی سے جلتا ہے

شجر سے شاخ جدا ہو گئی تھی طوفاں میں
ثمر کے بوجھ کا جس پر کوئی دباؤ نہ تھا

زین صدیقی

Zain Siddiqui
K.F.U.P.M
P.O. Box 268
Dhahran 31261,
Saudi Arabia

زین صدیقی

دہران

سچی لگن سے حاصل کیا ہوا علم اور محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ زین الدین صدیقی اس کی کھری مثال ہیں۔ 15 نومبر 1946ء کو غازی پور یوپی (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم جناب محی الدین صدیقی (مرحوم) کٹر مسلم لیگی اور نظریہ پاکستان کے حامی تھے۔ وہ قیام پاکستان کو اسلامی نظریہ حیات کی فتح تصور کرتے تھے چنانچہ قیام پاکستان کے بعد 1949 میں غازی پور (یوپی) سے ہجرت کرکے پاکستان تشریف لے آئے اور کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ (پنجاب) میں سکونت اختیار کی۔ کوٹ ادو کی خوبصورت فضا میں زین نے ہوش سنبھالا اور یہیں سے 1963ء میں میٹرک کیا۔ پھر مزید تعلیم کے لئے اپنے چچا حافظ کمال الدین صدیقی (مرحوم) کے یہاں کراچی چلے گئے۔ 1965ء میں جامع اسلامیہ کالج ملیر سے انٹر 1967ء میں نیشنل کالج سے بی۔ اے اور 1968ء میں کراچی یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ (لائبریری سائنس) پہلی پوزیشن میں پاس کیا۔ 1968ء میں ہی ترکی زبان کے امتحان میں بھی امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ 1969ء میں کراچی یونیورسٹی سے لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس میں MLS کیا۔ 1971ء میں ایم اے پولیٹیکل سائنس (سیاسیات) پہلی پوزیشن میں کیا۔ تعلیم کے دوران ہی جامعہ کراچی کی لائبریری میں ملازمت اختیار کی اور 24 نومبر 1974ء تک بحیثیت ہیڈ یونائیٹڈ نیشنز ڈاکومنٹس، گورنمنٹ پبلی کیشنز اینڈ گفٹ اینڈ ایکسچینج کا کام کرتے رہے۔

کراچی یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران ہی انہیں یونیورسٹی آف پیٹرولیم اینڈ منرلز کی لائبریری میں لائبریرین کی ملازمت کی پیشکش ہوئی جسے اپنے اساتذہ کے مشورے پر قبول

کرتے ہوئے زین 24 نومبر 1974ء کو دہران، سعودی عرب چلے گئے۔ ان دنوں کنگ فہد یونیورسٹی آف پیٹرولیم اینڈ منرلز دہران سعودی عرب میں بحیثیت یونیورسٹی لائبریرین خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

زین کہتے ہیں.... ''ادب وہی اچھا ہے، جس میں انسان دوستی کا بھرپور اظہار ہو۔ آزادی کا جذبہ ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو اور آزادیء خیال کی حفاظت کا بندوبست ہو، ترقی پسند ادب ان تمام خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ خیال و خواب کی دنیا میں پناہ نہیں لیتا نہ سماجی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرتا ہے بلکہ زندگی کی تاریکیوں کے خلاف جہاد کا علم بردار ہے۔ میں ذاتی طور پر اسی مکتبہء فکر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور اس کی علمی فضیلت اور فکری طہارت سے متاثر ہوں۔''

زین صدیقی شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری کی جانب بھی مائل رہے۔ اردو زبان سے متعلق متعدد مضامین اخبارات و رسائل میں تحریر کئے۔ خاص کر اردو زبان اور علاقائی زبانوں کی اہمیت و افادیت سے متعلق عام فہم الفاظ میں ان کے تحقیقی مضامین روزنامہ جنگ کراچی کے ادارتی صفحات پر شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ تنقیدی مضامین ''فیض احمد فیض، شخص اور شخصیت، مومن غزل کا شاعر، جدید شاعری میں نئے تجربے، حبیب جالب اور سیاسی استعارے'' وغیرہ۔ کراچی کے ادبی رسائل 'نیا ادب' لاہور کے اسلوب' ملتان کے کارواں اور ادبی منظر میں اشاعت پذیر ہوئے۔ بچوں کے ادب سے خصوصی دلچسپی ہے اور بچوں کے لئے نصف سے زائد کتابیں تحریر کرچکے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے بچوں کے پروگرام کے لئے نظمیں اور ڈرامے بھی انہوں نے تحریر کئے۔ ان کا شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے، جو انشاءاللہ 1998ء کے آخر تک ''عذاب آگہی'' کے نام سے شائع ہوگا۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اردو برصغیر سے نکل کر بین الاقوامی زبان کا روپ دھار چکی ہے۔ اردو کا حلقہ روزبروز بڑھتا جارہا ہے۔ جو لوگ بسلسلہ معاش اور حصول علم کی غرض سے دنیا کے قابل ذکر ممالک میں پہنچے ہیں، وہاں اردو کی ترقی و ترویج کے سلسلے روزمرہ کی زبان، مشاعرہ، ادبی نشستوں اور مذاکرات کے ذریعے ترقی پارہے ہیں۔

مشرقی وسطی، کینیڈا، یورپ، امریکہ میں نہ صرف اردو زبان کو بڑھاوا مل رہا ہے بلکہ ان ممالک سے اردو کے روزنامے اور ماہنامے باقاعدگی سے نکل رہے ہیں۔ لندن، جدہ امریکہ سے باقاعدگی سے اخبارات نکل رہے ہیں جو نہ صرف اردو کی نشوونما میں اہم کردار ادا کررہے ہیں بلکہ تجارتی نقطہ نظر سے کافی سود مند ثابت ہورہے ہیں۔ پاکستان سے بھی ایسے سالنامے، ماہنامے نکل رہے ہیں، جن کے پڑھنے اور لکھنے والے ملک سے باہر رہتے ہیں اور یہ رسائل تارکین وطن میں کافی مقبول ہیں، جس کا حوالہ دنیائے ادب ہے، جو کراچی سے

اوج کمال صاحب نکال رہے ہیں اور جس میں ملک سے باہر کے شعراء اور ادباء کی نمایاں نمائندگی پائی جاتی ہے۔

مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور امریکہ سے کئی ریڈیو اسٹیشن ' اردو سروس پیش کرتے ہیں ' اس کے علاوہ حکومتی ٹیلی ویژن سے بھی اردو زبان میں پروگرام باقاعدگی سے پیش ہوتے ہیں جو مقامی افراد بھی شوق سے دیکھتے اور سنتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں تو اردو زبان کاروباری دنیا میں کافی مقبول ہو رہی ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اردو کا دائرہ کار وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے اور یہ رجحان اہل اردو کے لئے باعث اطمینان اور طمانیت ہے۔ اردو کا مستقبل خدا کے فضل سے روشن اور خوش آئند ہے۔"

زین غزل اور نظم کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میں نثری نظم کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں کیونکہ اردو شاعری میں جدید رجحانات کو قبول کرنا اور اسے ترقی دینا اردو کے فروغ کے لئے بہت ضروری ہے ' لٰہذا وہ لوگ جو نثری نظم لکھ رہے ہیں ' میرے خیال میں قدر و منزلت کے حقدار ہیں کیونکہ ان کے یہ تجربے اور تخلیق اردو کو ایک نئی صنف سے مالامال کر رہے ہیں۔

مشاعروں کے ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ مشاعرے کسی شاعر کی مقبولیت میں تو اضافہ کا سبب ہو سکتے ہیں اور اس کے ذریعے کچھ مالی فوائد بھی ہو سکتے ہیں لیکن ادب کی تخلیق میں ادبی نشستیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ ان نشستوں میں اپنی کہنے اور دوسروں کو سننے کا موقعہ ملتا ہے۔ خاص کر تنقیدی نشستیں فنکار کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرتی ہیں جو آئندہ کی تخلیق کے لئے رہنما ثابت ہوتی ہیں جبکہ مشاعرہ میں اپنی فکر کے فروغ کی بجائے عوام کی پسند اور ناپسند کو اولیت دینا پڑتی ہے۔

ہمارے اگلے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا.... "ادب کا تعلق آج بھی عمل سے جڑا ہوا ہے اور آج بھی ادب کا قاری سے گہرا ربط و ضبط ہے۔ ادیبوں ' شاعروں ' فنکاروں کی نظر ہمیشہ اپنی قوم اور قومی مسائل پر مرکوز ہوتی ہے اور وہ عوام کے مسائل و مشکلات کو ہی اپنی تخلیق کا محور گردانتے ہیں۔ یہ کوئی احسان نہیں بلکہ یہ ان کا فرض منصبی ہے ' جس کو ہر صورت میں پورا کرنے کی تگ و دو انہیں کرنا چاہئے۔ ادیب امن کے پیامبر ' پیار و محبت کے نقیب اور امن و آشتی کے پرچارک ہیں۔ ظلم و ستم کے خلاف جہاد اور محبت و یگانگت کی تبلیغ ان کا مسلک ہے۔ اب بھی ادیب معاشرہ میں ایک باوقار اور پراثر عنصر ہے اور سوسائٹی پر اس کی گہری گرفت ہے ' یہی وجہ ہے کہ آج بھی ٹی وی کے ڈرامے واقعاتی اور رزمیہ نظمیں قاری کے دلوں پر گہری چھاپ چھوڑتی ہیں اور وہ ایسے تمام ادب کو محبت و تحسین سے نوازتے ہیں ' جو ان کے مسائل یا زندگی کی تاریکیوں کے خلاف جہاد کے

موضوعات لئے ہوتے ہیں۔

آخری سوال کے جواب میں زین صدیقی کہتے ہیں..... "بحیثیت ادیب ہمیں مغربی رجحانات اور میلانات سے ضرور باخبر رہنا چاہئے اور ان کی جدید تکنیک سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے لیکن مسائل' حسیت اور احساس و شعور' فکر و ادراک ہمارے اپنے ہونے چاہئیں۔

ہمارا معاشرہ' ہمارے مسائل' ہماری ترجیحات' ہمارے نظریے مغرب سے قطعی مختلف ہیں۔ ہمارے اپنے مسائل ہیں' مغرب کے اپنے۔ ہمارا اپنا ماحول ہے مغرب کا اپنا' اس لئے نقالی کا عمل صرف ایک مذاق ہوگا اور اس نقالی سے جو ادب تخلیق ہوگا' وہ بے جان' بے مزہ اور مستعار ہوگا' جس پر قاری کوئی توجہ نہیں دے گا' ایسے ادب کا مطالعہ اس کے وقت کا زیاں ہوگا اور ایسا ادب بے فیض' بے ثمر اور بے اثر بھی ہوگا۔"

عکس فن

غزل

ہم نے کبھی زخموں کی نمائش تو نہیں کی
آئے وہ عیادت کو یہ خواہش تو نہیں کی

جس گھر کے مکیں ہوتے ہوں اخلاص سے عاری
اس گھر میں کبھی ہم نے رہائش تو نہیں کی

لکھتے رہے سب لوگ قصیدے تری خاطر
پر ہم نے کبھی تیری ستائش تو نہیں کی

ہم دوست تھے سو ہم نے کہی بات جو حق تھی
ہاں غیر سے مل کر کوئی سازش تو نہیں کی

وہ جود و سخا میں بڑا مشہور تھا لیکن
اپنوں پہ کبھی اس نے نوازش تو نہیں کی

مظلوم تھے سو اوڑھے رہے خول انا کا
ظالم سے کبھی رحم کی خواہش تو نہیں کی
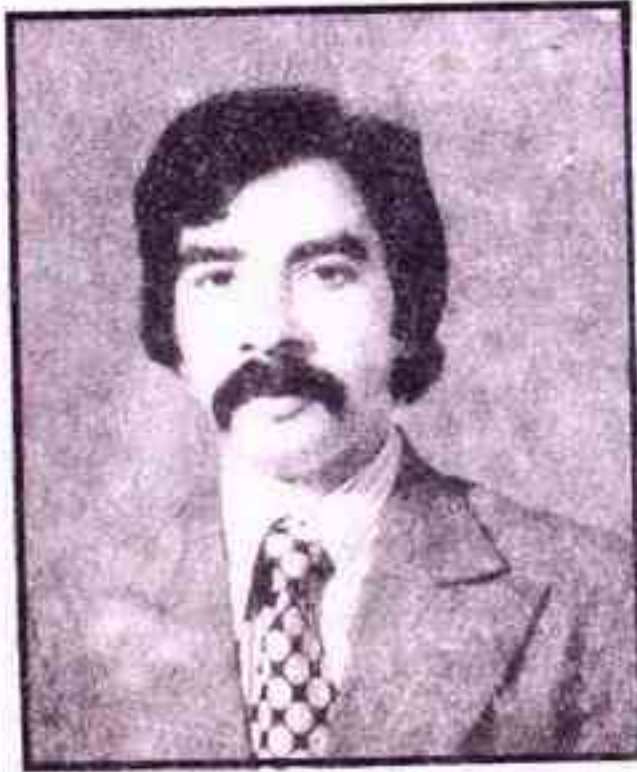
ایک لمحہ بھی اگر میرے تصرف میں نہیں ہے
پھر یہ اوقات نہیں پھر بھی دنیا کیا ہے

امتیاز ساغر

Imtiaz Saghar
7-165/C, Model Colony
Near Telephone Exchenge, Malir
Karachi, Pakistan

امتیاز ساغر
کراچی

کتاب ذات پڑھ کر دیکھتا ہوں
میں کوزے میں سمندر دیکھتا ہوں

اس اعتماد سے شعر کہنے والے شخص نے یقیناً" آج کے ابنارمل معاشرے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان سے نبرد آزما بھی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سچائی سے شعر کہہ رہا ہے۔

یہ امتیاز احمد خاں ہیں، جنہوں نے ادبی نام امتیاز ساغر اپنایا۔ 11 جون 1949ء کو ڈھاکہ (سابق مشرقی پاکستان حال بنگلہ دیش) میں پیدا ہوئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی۔ کام کیا۔ سقوط ڈھاکہ کے المیے کے بعد براستہ نیپال ڈھاکہ سے کراچی پہنچے۔ اس دوسری ہجرت میں کنبے کے سارے افراد توان کے ساتھ تھے مگر ان کے چھوٹے بھائی اسرار احمد خاں میمن سنگھ میں مکتی باہنی اور بنگالی فوج کے ہاتھوں اپنے علاقہ کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ امتیاز ساغر کراچی پہنچے۔ شاعری سے رشتہ استوار کیا۔ شاعری جو بدترین حالات اور سنگین لمحات میں بھی ان کے لئے پناہ بنی رہی اور آج بھی ان کے لئے شجر سایہ دور کی صورت ہے۔

ساغر کا کلام ملک اور بیرون ملک کے تقریبا" تمام معروف رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ "صحرا کی ہوا" کے نام سے 1985ء میں ان کا مجموعہ کلام شائع ہو کر اہل علم و دانش سے قبولیت کی سند حاصل کر چکا ہے۔ مزید دو شعری مجموعوں کی 1998ء کے آخر تک طبع ہو جانے کی امید ہے انشاء اللہ۔

ساغر کراچی کے یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ سے وابستہ ہیں۔ کسی بھی مکتب فکر سے خود کو وابستہ نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک شاعری مسیحائی کا درجہ رکھتی ہے۔ شاعر اپنے عہد کا چونکہ مسیحا ہوتا ہے چنانچہ مسیحا کا کام صرف مسیحائی ہے۔ نبض کائنات پر جس کی انگلیاں ہوں اسے خود کو کسی خانے میں نہیں بانٹنا چاہئے۔ وہ تو تمام خلق خدا کی امانت ہے۔

ساغر یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں کہ آیا غزل میں اپنا اظہار بہتر طور سے کرتے ہیں یا نظم میں۔ ان کے احباب کی رائے میں ان کی غزلیں ہی ان کے خارج و باطن کی عکاس ہیں اور ان کی پہچان کا ذریعہ بھی لیکن ساغر گاہے گاہے نظمیں بھی کہتے ہیں۔

نثری نظم کے لئے ان کا کہنا ہے کہ ابھی تجرباتی مراحل سے گزر رہی ہے کیونکہ جس صنف کا کوئی پیمانہ نہ ہو' اس کے بارے میں خوش یقین نہیں ہوا جاسکتا۔ ہاں کسی کو اگر اپنے نام کے ساتھ "شاعر" کا لاحقہ لگانا مقصود ہو تو نثری نظم کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

امتیاز تخلیقی نشستیں اور مشاعروں کے حامی ہیں۔ کہتے ہیں کہ "ان کا انعقاد فروغ ادب کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کی ذہنی صلاحیتوں کو روشن تر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور اچھے مشاعروں اور تنقیدی نشستوں کی کمی ہی کی وجہ سے ادب کا رشتہ اس کے قاری سے کمزور پڑگیا ہے مگر ادب کا تعلق عمل سے ہرگز نہیں کٹا نہ ہی ادب ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے۔ آج بھی ادب عوام و خواص سے لے کر اہل علم و ہنر تک کے ذہنوں کو آسودگی فراہم کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔ اس تاثر کی وجہ یہ ہے کہ معاشرتی ناہمواریوں' سیاسی رقابتوں اور اقدار کی پامالی نیز ہمارے تعلیمی اداروں کی عدم دلچسپی و خواندگی کی شرح میں روز افزوں کمی کی وجہ سے لوگ ادب کو ایک عام سی شے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے کیونکہ مادیت گزیدگی نے لوگوں کو درہم' پاؤنڈ اور ڈالر کا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ہر شخص ایک کھوکھلی زندگی کی تعمیر کے لئے سرگرداں ہے۔ ایسے ماحول میں ادب کی جانب کون دیکھے گا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ صورتحال جلد بدلے گی۔ ادب کی کتابیں اور رسالے کی اہمیت سے بھی لوگ آگاہ ہوں گے۔ ادب کا قاری سے رشتہ جو کچھ کمزور سا لگ رہا ہے۔ بہرحال مضبوط ہوگا۔"

آخری سوال کے جواب میں امتیاز ساغر نے کہا کہ بیرونی ادبی فیشن کی پیروی سے اچھا ادب تو دور کی بات ہے عام ادب بھی تخلیق نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمارا ماحول' ہمارا سماج اور ہمارے تہذیبی اقدار مغرب سے مختلف ہیں۔ ہمارے مسائل بھی مغرب سے جدا ہیں۔ رہی بات تکنیک کی تو میں نہیں سمجھتا کہ آخر وہ کون سی تکنیک ہے جو اچھا ادب تخلیق کرنے میں ہماری معاونت کر سکتی ہے۔ ہماری زبان کی ایک الگ چاشنی اور ذائقہ ہے۔ اس کی تمام تکنیک اور رموز پہلے سے طے شدہ ہیں۔ میر' غالب' جوش' اقبال' فانی' جگر' فیض' انیس' یا یگانہ چنگیزی کی شاعری میں کون سی مغربی تکنیک شامل ہیں۔ کیا یہ شعراء اور ان کی طرح

بے شمار ہمارے شعراء' اردو شاعری کی آبرو نہیں ہیں؟ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم مغرب سے متاثر ہونے کی حد تک خوف زدہ ہیں۔ بے شک مغرب کی شاعری نئے رجحانات و روشن خیالات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے مگر دیکھا جائے تو اردو شاعری کا دامن بھی جدید حسیت و روشن احساسات و شعور کی دولت سے مالا مال ہے۔ ہمیں کسی بھی ادب کی پیروی سے گریز کرنا چاہئے۔ مغربی ادب کا مطالعہ اچھی بات ہے اور نئے رجحانات کا ادراک بھی ذہن کی آب و ہوا کے لئے ضروری ہے۔"

عکس فن
نظم

شجر عمر سے گرا پتا
آج اک اور سال بیت گیا
خال و خد آئینے میں دیکھتا ہوں
جیسے بکھرا ہوا ہو رنگ شفق
جیسے سائے دراز ہوتے ہوں
اور دن چھپ رہا ہو شام ڈھلے
جیسے دریا کے راستے میں کہیں
اک سمندر رہو ہاتھ پھیلائے
آئینہ دیکھتا ہوں' سوچتا ہوں
عمر کے سائے ہو رہے ہیں دراز
خال و خد زاویے بدلنے لگے
آنکھ کی جھیل خشک ہونے لگی
کندنی جسم خاک رنگ ہوا
شاید اب خاک انتظار میں ہے
آئینہ دیکھنے سے کیا حاصل.......؟

جلتے رہے نہاں ہمارے برگ و بام

اٹھتا ہوا چمن سے دلوں کا دیکھتے رہو

سکندر سالم
26-1-1998

Sikander Salim
38 Lynton Drive
Brad Ford BD95JT
West York Shire
U.K.

سکندر افتخار سالم

بریڈ فورڈ

سکندر سالم اجنبی زمین میں شاعری کے پھول کھلانے پر کمربستہ ہیں۔ بریڈ فورڈ میں رہتے ہوئے بھی اپنے وطن پاکستان کی بد حالی پر کڑھتی ہیں اور انسانی محرومیوں کے احساس کو شاعری کا جامعہ پہناتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ابہام اور پیچیدگی نہیں۔ سیدھا سادا سچا لہجہ ہے جو ٹھوس بھی ہے اور مضبوط بھی ہے۔۔

آج شعلوں میں ہے وطن میرا
کیسا ابتر ہوا چمن میرا

میں نے گلشن میں پھول چاہے تھے
سیلِ خوں میں ہے گم چمن میرا

یہ اشعار آج کے پاکستان کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ سکندر سالم کا رشتہ اپنی مٹی سے جڑا ہوا ہے۔ وہ وطن آتی ہیں تب بھی اور وطن سے دور ہوں تب بھی اپنے وطن کے حالات سے باخبر رہتی ہیں کیونکہ انہیں اپنی مٹی سے بے حد پیار ہے اور یہی پیار ان سے کہلواتا ہے۔۔

وہ لگاتے ہیں آگ شہروں میں
جل رہا ہے یہاں بدن میرا

سکندر افتخار سالم ان کا پورا نام ہے اور سکندر تخلص کرتی ہیں۔ 10 فروری 1946 کو

کانپور (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد اس وقت ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ جگہ جگہ تبادلے ہوتے رہتے تھے' لہٰذا نرسری سے لے کر پرائمری اسکول تک تعلیم کا سلسلہ مختلف شہروں تک پھیلا۔ گھر پر بھی استادوں سے کچھ سیکھا۔ نومبر 1957ء میں کراچی (پاکستان) آئیں۔ مڈل اسکول کی تعلیم یہاں پر شروع ہوئی چنانچہ اسلامیہ سائنس کالج کراچی سے انٹر میڈیٹ کیا۔ بی ایس سی' ڈی جے سائنس کالج سے کرنے کے بعد فاطمہ جناح میڈیکل کالج سے 1973ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔ اس کے بعد جناح پوسٹ گریجویٹ کالج سے M.C.P.S. مکمل کیا۔ 1974ء میں ان کی شادی ہوگئی تو پاسنگ لندن سدھار گئیں' تب سے وہیں آباد ہیں۔ ویسے 1979ء سے 1980ء کا عرصہ کراچی کے عباسی شہید ہسپتال میں انستھسیا میں کنسلٹنٹ کے طور پر کام کیا مگر حالات نے پھر انہیں لندن جانے پر مجبور کر دیا۔ اب تقریباً" 9 سال سے ایک ہسپتال سے وابستہ ہیں۔ یوں یارک شائر کی حسین وادیوں میں زندگی کے مشقت بھرے شب و روز تنہا گزار رہی ہیں۔

سکندر سالم شاعری کے علاوہ ادبی مقالہ' مضامین اور افسانہ لکھتی ہیں۔ فرصت ملنے پر طبی خلاصے بھی لکھتی ہیں۔ ان کی تحریریں اور کلام زیادہ تر انگلینڈ کے مختلف جرائد میں چھپتے ہیں' جن میں راوی' سجاد' ویلڈن اور وطن شامل ہیں۔ ہندوستان کے رسالہ انشاء و شاعر میں بھی افسانے اور غزلیں اور کراچی کے دنیائے ادب میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا ہے۔

صنف سخن میں غزل اور نظم دونوں ہی میں اظہار خیال کو پسند کرتی ہیں۔ بات خیال کی نوعیت اور مزاج کی کیفیت پر منحصر ہے۔ نثری نظم کے لئے ان کا کہنا ہے کہ لفظی معنوں میں بھی اس میں تضاد موجود ہے' اس لئے سکندر اس صنف سے کچھ زیادہ متاثر نہیں۔

اردو کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ یہ یقیناً" دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے لیکن دنیا بھر میں بدلتے ہوئے معاشی' سیاسی' اخلاقی اور تمدنی حالات کی زد میں بری طرح گھرتی جا رہی ہے۔ نئی نسل کی امریکہ اور یورپ سے اتنی گہری ذہنی وابستگی دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ کراچی کے ٹریفک کی طرح زبان بھی غلطاں و پیچاں نظر آتی ہے۔

مشاعروں کے بارے میں سکندر کہتی ہیں کہ "مشاعرے یقیناً" ادب کی تخلیق میں معاون ہیں لیکن نشستیں بہتر فکر' ادب پارے اور ارتقائے ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

اگلے سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ "میرے نزدیک ادب میں اظہار خیال اور بیان پر ماضی حاوی ہے جبکہ موجودہ قاری کی اکثریت نوجوان نسل ہے' جس کا رہن سہن روزمرہ اور زندگی کے مسائل بالکل مختلف ہیں جو موجودہ دور کے ادب اور عملی روش میں یکساں نہیں۔"

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "میں ان تمام بزرگ ادیبوں کی آراء سے

پوری طرح متفق ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ یورپ کی معاشرت میں احساس و شعور ہمارے تمدن سے اور احساس سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے ادب اور تمدن میں لطافت احساس اور جذبات کو بہت دخل ہے جبکہ مغرب میں اب ان احساسات کا کوئی وجود نہیں وقت حاضر اور ضرورت اور اس کی تکمیل ہی بنیاد ہے۔"

عکس فن

غزل

کتنی شمعیں تھیں فروزاں، پہ اندھیرا نہ گیا
اپنے حالات کا رخ ہم سے تو پھیرا نہ گیا

تو نے جلووں سے ہر اک راہ منور کردی
اپنی محفل میں وہی نور بکھیرا نہ گیا

ابکے نکلا ہے صداقت کا نیا اک خرشید
لاکھ ظلمات کی یورش سے بھی گھیرا نہ گیا

التفات ان کا ہمیں گو نہ میسر آیا
کوچہ دوست میں ہر روز کا پھیرا نہ گیا

ملک افرنگ میں موسم کا نہ پوچھو احوال
دھند کا، برف کا، برسات کا ڈیرا نہ گیا

شہر کی ویرانی کا عالم اب نہیں دیکھا جاتا ہے
اپنی آنکھیں طاق پہ رکھ کر گھر سے باہر جاتا ہوں

سرشار صدیقی

کراچی، ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۷ء

Sarshar Siddiqui
F-28, K.D.A Oversease Banglows
Gulistan -e- Jauher, Block 16 -A,
Karachi-75290, Pakistan

سرشار صدیقی

کراچی

"میں پہلے بھی آپ کی شاعری کا معترف تھا اور آج بھی ہوں بلکہ دل دادہ ہوں۔ بڑی بات آپ کے ہاں یہ ہے کہ آپ شاعر ہیں۔ شعر کہتے ہیں۔ جدید بننے کی کوشش میں مبتلا نہیں ہیں' اسی لئے آپ پر لکھنے کے لئے جدید **مصطلحات** کے مارے ہوئے نقاد کو بڑی دقت پیش آئے گی۔ میری ناچیز رائے میں آپ کا کلام فصیح بھی ہے اور بلیغ بھی۔ معذرت خواہ نہیں ہوں۔ یہ الفاظ جن شعراء کے لئے استعمال کئے گئے ہیں' وہ شاعری کی آبرو ہیں۔ آپ کا لہجہ صاف' نڈر اور فیصلہ کن ہے۔ آپ کا ایک مصرعہ کیا خوب مصرعہ ہے۔"۔

جو بے زمیں ہوئے ان کا کہاں ٹھکانا ہوا!

آپ کی شاعری میں یہ آواز دور تک گونجی ہے۔ جواب کون دے.... اور آپ جواب مانگ بھی نہیں رہے ہیں..... میر اور آتش کے بعد ایسا مطلع نکالنا؟ واہ جناب سرشار واہ!۔

جو بے وطن ہوئے ان کا وطن زمانہ ہوا
جو بے زمیں ہوئے ان کا کہاں ٹھکانا ہوا

یہ موتی رولتی تحریر میرے استاد پروفیسر مجتبیٰ حسین (جو میرے لئے مرحوم نہیں' اب بھی میں ان سے کسب نور کرتی ہوں) کی ہے جنہوں نے 1983ء میں جناب سرشار کا کلام پڑھ کر کوئٹہ سے لکھ بھیجی تھی۔ یوں سرشار 1947ء سے اہل علم کی آنکھوں کا تارہ بنے ہوئے ہیں اور تب ہی سے ادب کے افق پر ایک ماہ نو کی طرح جگمگانا شروع ہوئے۔ مہ و سال کی آشنائی

نے اب اس ماہ نو کو ماہ کامل کا روپ دے دیا ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری سے ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر اختر الایمان سے تسلیم الٰہی زلفی تک کم و بیش دو درجن سے زیادہ اہل نظر و اہل بصیرت ان کے فن و شخصیت کا احاطہ کر چکے ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں کئی اعزازات مل چکے ہیں، جن میں نشان نیاز اور فیض یادگار شیلڈ بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی بتاتے ہیں..... "سرشار صدیقی نے دیار قرطاس و قلم میں پچاس برس پورے کر لئے۔ اہل سخن کو سرشار کا جشن نصف صدی منانا چاہئے اگر ایسا نہ ہوا تو ہم سب "بے حس قوم کے افراد" میں شمار کئے جائیں گے۔ یہ سرشار کا حق بھی بنتا ہے کیونکہ بقول ڈاکٹر ابوالخیر کشفی سرشار نے اپنا اسلوب سخن ایجاد کیا ہے۔ اس اسلوب میں بڑا تنوع ہے اگر شعر عقیدت میں عبادت کے آداب ہیں تو غزل میں آشفتہ بیانی ہے اور نظموں میں بغاوت اور دروں بنی کا امتزاج ہے۔ سرشار نے کوئی ایسا حرف نہیں لکھا جو سچ سے عبارت نہ ہو۔ ان کے وجود کی سچائیوں کا دوسرا نام ان کی شاعری ہے، ملاحظہ ہو۔"

چراغاں کا سماں تھا قابل دید
ہماری بستیوں کے گھر جلے تھے

مری توسیع ہیں یہ میرے بچے
رگوں میں ان کی میرا ہی لہو ہے

کہاں سے پایا ہے دل نے گلوں کا ذوق نمو
مژہ تک آگیا کھینچ کر مرے جگر کا لہو

میں نے جس حال میں اک عمر بسر کی سرشار
ایک ہی دن کبھی اس طرح گزارے کوئی

خلوص ختم ہوا، اعتبار ختم ہوا
خسارہ جس میں تھا وہ کاروبار ختم ہوا

اس خاک پہ موسم تو گذرتے ہی رہے ہیں
موسم ہی تو ہو، تم بھی گزر جاؤ گے لوگو!

ہم وہ ہدف حرف ملامت ہیں کہ سرشار
ہوگی یہی دنیا کبھی ہم لوگوں پہ نازاں

ویسے ان کا نام تو ننھیال اور ددھیال کی جانب سے محمد امان اور اسرار حسین ہیں لیکن

سرشار صدیقی کے نام سے جانے جاتے ہیں اور کوچہ ء ادب میں سرشار تخلص اختیار کئے ہوئے ہیں۔ 25 دسمبر 1926ء کو کان پور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ مئی 1950ء میں کراچی آئے۔ 5 سال تک مختلف سرکاری' غیر سرکاری اداروں میں ملازمت کرتے رہے۔ 1955ء سے 1985ء تک نیشنل بینک آف پاکستان سے وابستہ رہے۔ سبکدوشی کے بعد "Travel -a- Dial" کے نام سے ایک مکمل رجسٹرڈ اور منظور شدہ ٹریولنگ ایجنسی قائم کی ہے' جسے ان کے چھوٹے صاحبزادے طارق سرشار چلا رہے ہیں۔ بڑے صاحب زادے جنید سرشار صدیقی تقریبا" 18 سال سے اپنے اہل و عیال کے ساتھ عرب امارات میں مقیم ہیں۔

جناب سرشار کے شعری مجموعے ہیں۔ پتھر کی لکیر (1962ء)' زخم گل (1965ء) ابجد (1983ء) بے نام (1983ء) خزاں کی آخری شام (1988ء) اساس (1992ء) نثر میں ایک مختصر تنقیدی مجموعہ "حرف مکرر" زیر طبع ہے جو اہم کتابوں پر تبصروں کا انتخاب ہے۔ زیر طبع تصانیف میں "شنیده" (تاثراتی مضامین) "تشکیل" (ہائیکو) اور بے نام کے بعد کا شعری انتخاب شامل ہیں۔

شاعری کے علاوہ تنقید و تبصرہ سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کی شاعری ان کے اپنے ہی مکتب فکر سے متاثر ہے۔ پاک و ہند کے تمام قابل ذکر صف اول کے ممتاز جرائد میں 1945ء سے شائع ہو رہے ہیں اور ادب کے باشعور قارئین آگاہ ہیں۔

ان کا کہنا ہے زندگی بجائے خود نہایت غیر اہم اور غیر دلچسپ شے ہے۔ بہر حال چند قابل ذکر واقعات میں شاعری کا آغاز 45-1944ء' ہجرت 1950ء' شادی 1954ء' ملک کی اہم شخصیت کی حیثیت سے پاکستان کی قومی انسائیکلو پیڈیا کے لئے انتخاب اور شمولیت کا اعزاز 1988ء پہلا عمرہ 1984ء میں اور پھر تسلسل سے اب تک 1997ء تک ہر سال حاضری اور حضوری کی سعادت شامل ہیں۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا آپ کی اطلاع درست نہیں۔ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ پاکستان میں اس کے مستقبل کے بارے میں آپ کیوں فکر مند ہیں۔ آپ تو اب امریکہ کی شہری ہیں۔ وہاں رہ کر اس زبان کے بارے میں سوچئے جو آپ کو آئندہ استعمال کرنی ہے۔

سرشار نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ صنف کا انتخاب موضوع فکر کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ ویسے انہوں نے ہائیکو' مسدس' گیت' غزل' نظم سب لکھی ہیں۔

نثری نظم کے بارے میں فیض صاحب کی رائے سے مکمل اتفاق کرتے ہیں۔ مشاعروں کے سلسلے میں کہتے ہیں..... یہ تخلیق کا ذریعہ نہیں ہوتے بلکہ ترویج کا وسیلہ ہوتے ہیں اور محدود گھریلو نشستیں اور خانہ ساز انجمنوں کے مشاعرے کبھی بھی تخلیق ادب میں معاون نہیں

ہوئے بلکہ معیار کی ابتری کا سبب بنے ہیں۔

میرے سوال نمبر6 کے جواب میں سرشار صدیقی کا کہنا ہے کہ "یہ صرف آپ کا مفروضہ ہے۔ ادب اگر واقعی ادب ہے تو کبھی بے اثر نہیں ہوتا۔ البتہ ہر تحریر کو ادب سمجھ لینا حماقت ہے اور اس بنیاد پر سوال قائم کرلینا شفیق الرحمان کے بقول "مزید حماقت" ہے۔"

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔۔۔۔"میں نے تو کسی سینئر ادیب کو جو معتبر بھی ہو' یہ کہتے نہیں سنا جو آپ نے سوال میں بڑے اعتماد سے کہا ہے۔ آپ جانتی ہی ہوں گی کہ ہماری زبان (اردو) میں بھی ساری مہذب دنیا کے در آمدی الفاظ شامل ہیں اور اس کی اصناف میں غزل خالصتاً" عرب سے' مرثیہ ایران سے' آزاد اور معریٰ نظم مغربی ممالک سے' سانیٹ اصلاً" انگلستان سے' ہائیکو جاپان سے' دوہے اور گیت ہندوستان سے در آمد کئے گئے ہیں۔ الفاظ' اسلوب اور موضوعات کے باہمی تبادلے کا عمل زندہ زبانوں کا وظیفہ اور آپس کے گہرے روابط کا ثبوت ہے۔ اسی غیر شعوری رویے سے زبانوں کے دائرے وسیع ہوتے ہیں۔"

نوٹ : سرشار صدیقی صاحب نے غالباً" صرف نظر کیا ہے ورنہ 27 جولائی 1997ء کے روزنامہ "جنگ" کراچی کے ادبی صفحے پر سینئر اور معتبر ادیب جناب ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون موجود ہے۔ اسی مضمون کی بنیاد پر سوال نمبر6 اور 7 مرتب کیا گیا ہے' ملاحظہ فرمالیں۔

عکس فن

ام النبی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم

سلسلہ نور کے ظہور کا تھا
کائنات انتظار شوق میں تھی
اور تخلیق کائنات کا راز
صورت انکشاف چاہتا تھا
قبلہ ء عرش و فرش کے اطراف
کعبہ' اذن طواف چاہتا تھا

اور وہ راز
تیرے بطن میں تھا
لوح محفوظ عرش کی مانند
کلمہ ء اعتبار کی صورت

جس کا سایہ نہ ہو گا
اس کے لئے
تیرے سائے کا انتخاب ہوا
تیرا ام النبیؐ خطاب ہوا

فیصلہ ہے نظام قدرت کا
شاخ لازم ہے پھول سے پہلے
تیری تخلیق ناگزیر ہوئی
دو جہاں کے رسولؐ سے پہلے
تیری عظمت کا کیا ٹھکانا ہے
تجھ سے جبریلؑ ہم کلام ہوئے
آیتوں کے نزول سے پہلے

بے یقینی کے اس دور میں سعدیہ
زندہ رہنا بھی ہے معجزوں کی طرح

سعدیہ روشن

۱۲ر فروری ۹۸ء

Sadia Raushan Siddiqui
P.O. Box 26555
Abudhabi, U.A.E.

سعدیہ روشن

ابو ظہبی

سعدیہ میرے سامنے بیٹھی ہیں۔ بڑے ادب سے سر پر دوپٹہ اوڑھے' ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ سجائے' چہرے پر معصومیت کا پرتو اور آنکھوں میں روشن روشن چمک۔

"سعدیہ تم بہت دنوں میں ملی ہو۔ کچھ سناؤ" میں کہتی ہوں۔ اور سعدیہ مسکرا کر شروع ہو جاتی ہیں۔ "میں پریشاں ہوں"

"مگر سعدیہ تم تو قطعی پریشان نہیں دیکھتیں مجھے۔" میرے چہرے پر حیرت دیکھ کر وہ ہنس کر کہتی ہے۔ "ارے سلطانہ مہر آپا آپ سنیں تو میری پریشانی۔ بیچ میں نہیں بولیں گی۔" اور میں چپ ہو جاتی ہوں۔ سعدیہ کو سنتی ہوں۔

میں پریشاں ہوں' اس بات سے کہ
آپ غزل میں باغوں' کھیتوں' فصلوں
درختوں' پھولوں اور تتلیوں کی باتیں کرتے ہیں
جہاں میں رہتی ہوں' وہاں یہ باتیں بچے' مالی اور کسان کرتے ہیں
میری دنیا کے لوگ فلسفہ' سیاست' انٹرنیٹ' انسانی کلوننگ'
تیل کی قیمتوں اور حصص بازار کی باتیں کرتے ہیں
سمجھ میں نہیں آتا کہ میں سانس لینے کے لئے
آکسیجن کہاں سے حاصل کروں! غزل کیسے کہوں؟

میں بے اختیار سعدیہ روشن کے ماتھے کا بوسہ لیتی ہوں۔ اس کے ہاتھ چوم لیتی ہوں کہ

یہ میرے پیار کا نذرانہ ہے اور پھر سعدیہ سے کہتی ہوں۔ "اللہ کرے زور بیاں اور زیادہ" اب کچھ باتیں سخن ور حصہ سوم کے لئے کرتے ہیں۔ اپنے بارے میں بتاؤ۔ کنجوسی سے کام نہ لینا۔

سعدیہ بولی۔ "ہرگز نہیں۔ آپ پوچھئے تو" پھر اپنے بارے میں سعدیہ نے بتایا کہ میرا پورا نام سعدیہ روشن صدیقی ہے اور میرا نام ہی تخلص ہے۔ کراچی میں پیدا ہوئی۔ میٹرک گورنمنٹ گرلز اسکول جیکب لائنز' انٹرمیڈیٹ کراچی کالج فار ویمن اور بی اے آنرز وایم۔ اے سیاسیات میں جامعہ کراچی سے کیا۔ پہلی پوزیشن لینے پر سریامین خان گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی سرگرم رہی۔ مضمون نگاری' سیرت النبی پر تقریریں کرنا' بین الکلیاتی مباحثوں اور بزم ادب کی سرگرمیوں میں حصہ لینا اپنے کالج اور یونیورسٹی کے متعدد مجلوں کی ادارت کرنا' ریڈیو پاکستان کراچی کے بزم طلباء کے پروگراموں میں مسلسل شرکت کرنا اور گرل گائیڈ کی خدمات بھی انجام دینا' یہ سب تعلیم کے ساتھ اضافی سرگرمیاں تھیں۔ تعلیم کے بعد ایک سال فریڈم موومنٹ آرکائیوز سیکشن جامعہ کراچی میں ریسرچ اسکالر رہی۔ اسی جامعہ میں پھر دس سال تک شعبہ سیاسیات میں لیکچرار رہی اور تین سال تک ابوظہبی کے شیخ زاہد عرب پاکستان کالج میں لیکچرار رہی۔

ادب کی تمام اصناف سے دلچسپی ہے لیکن طنز و مزاح اور تنقید سے خصوصی شغف ہے۔ شاعری کے ہر مکتبہ فکر سے متاثر ہیں۔ ادب کی قاری اور طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہر مکتبہ فکر کا تفصیلی مطالعہ اور ہر اسلوب و انداز کی مشق ہے۔

بچوں کی دنیا' پھلواری جو کہ شائع کی گئیں۔ کراچی کے ہمدرد نونہال' بھائی جان اور جنگ کراچی میں میری نثری تحریریں شائع ہوئیں۔ کالج پہنچ کر اپنے کالج کے مجلّے "فضا" میں کراچی یونیورسٹی کے متعدد مجلوں میں لکھا اور ادب سیپ' فنون' افکار' اقدار' صریر اور چہار سو میں گاہے بہ گاہے چھپتی رہتی ہیں۔ میرا پہلا مجموعہ کلام "روشنی ہماری ہے" 1993ء میں لاہور سے الحمد پبلشرز نے شائع کیا۔ آج کل دوسرا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔"

سعدیہ کی زندگی میں کئی دلچسپ موڑ آئے' جس نے انہیں نئے حوصلے دیئے اور جدوجہد کی رنگا رنگ امنگیں بخشیں۔ سعدیہ مجھے بتا رہی تھیں۔ "سلطانہ آپا زندگی بذات خود ایک دلچسپ اور امتحانی چیز ہے۔ یادوں کی اس کہکشاں میں بے شمار ستارے جھلملاتے رہتے ہیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ پانچویں جماعت کی ایک طالبہ جو خطرناک حد تک دبلی ہے۔ سیرت النبیؐ کے جلسے میں تقریر کر رہی ہے اور کیونکہ یہ اس کی پہلی تقریر ہے تو وہ سخت خوفزدہ ہے اور تھر تھر کانپ رہی ہے۔ پھر نویں جماعت میں اس لڑکی کی دو نظمیں "بچوں کی دنیا" لاہور میں بغیر کسی سفارش اور جان پہچان کے چھپ گئیں تو اس میں تھوڑا سا اعتماد آگیا اور جب دسویں جماعت

میں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کراچی نے مضمون نگاری کا مقابلہ منعقد کروایا تو اس لڑکی کا تحریر کردہ مضمون اول آگیا۔ اب وہ لڑکی خوش بھی ہے اور پر اعتماد بھی۔
کالج میں وہ لڑکی ایک تو ویسے ہی فرسٹ ایئر فول تھی۔ پھر اس کالج میں اس زمانے کے روزنامہ جنگ اور ماہنامہ بھائی جان کی جغاوری لکھنے والی طالبات موجود تھیں۔ سینئر طالبات میں شہلا تزئین، انیسہ جلال، رشیدہ خاتون، راشدہ ظفر، خالدہ شفیع وغیرہ موجود تھیں۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ایک دن اسمبلی میں پرنسپل صاحبہ نے کالج میگزین کی اشاعت کا اعلان کردیا۔ اردو ایڈوانس کی استاد نے غزل کی تعریف اور کچھ ردیف قافیے کی سوجھ بوجھ پیدا کردی تھی، لہٰذا اس دن اس فرسٹ ایئر فول نے اپنی زندگی کی پہلی غزل کہہ دی اور کسی کو دکھائے بغیر اگلے دن ایک غزل اور نظم دونوں پرنسپل صاحبہ کی میز پر جاکر رکھ دی۔ وقفے میں ڈھنڈیا پڑی۔ پرنسپل صاحب صاحب نے اردو ہوم ورک اور کلاس ورک کی کاپیاں بھی طلب کرلیں۔ بڑا کڑا انٹرویو ہوا۔ ہر شعر کا مطلب پوچھا گیا۔ اگلے دن بی۔ اے فائنل کی دو طالبات ہمیں "دیکھنے" کے لئے آگئیں۔ وجہ یہ بتائی کہ پرنسپل صاحبہ نے آج کلاس میں آپ کی تعریف کی ہے۔ اب آپ کی غزل کالج کے مجلّے میں چھپے گی۔ تب کہیں جاکر ہمیں اطمینان ہوا اور اپنی ہم جماعت لڑکیوں یعنی نکہت اشارت (طلعت اشارت کی بہن) رضیہ رضوی (زیبا ردولوی کی صاحبزادی) صفوریٰ خیری (رزاق الخیری کی صاحبزادی) صفیہ موہانی (حسرت موہانی کی نواسی) میں کچھ مقام بنا۔
میں فرسٹ ایئر ہی میں تھی کہ ریڈیو پاکستان کراچی نے پہلا جشن طلبا منانے کا اعلان کردیا۔ معلوم نہیں کیسے کراچی یونیورسٹی کی نمائندگی کا شرف مجھے عطا ہوا۔ میجر آفتاب حسن صاحب کوئیز ماسٹر تھے۔ ان کا رعب اور دبدبہ اپنی جگہ مگر آخر کار تیاری رنگ لائی۔ ٹیم کی دوسری رکن بالکل خاموش رہیں۔ میں نے دس کے دس سوالوں کے جواب دیئے۔ نتیجتاً ہماری ٹیم کو اول انعام ملا۔ اس جشن کے خاتمے کے بعد یاور مہدی صاحب نے ایک مذاکرے میں بھی مدعو کرلیا۔ اس کے بعد میں جامعہ کراچی میں بھی پہچانی جانے لگی۔
ریڈیو پاکستان کے دوسرے جشن طلبا میں مشاعرے کی صدارت جناب زیڈ اے بخاری فرما رہے تھے۔ اس میں 'میں نے اپنی نظم "قلم" پڑھی تھی اور میں نے کم' بخاری صاحب نے زیادہ پڑھی۔ وہ صدر ہونے کے باوجود ہر مصرعہ اٹھا رہے تھے داد دے کر دوبارہ پڑھ رہے تھے۔ اتنی بڑی شخصیت کی اتنی زیادہ حوصلہ افزائی دراصل خود ان کی بڑائی تھی۔
تمہاری اتنی کامیابیوں میں تمہارے اساتذہ کا تعارن کتنا رہا؟ کہنے لگیں.....
آپا..... کراچی یونیورسٹی میں تمام کے تمام اساتذہ دراصل صحیح معنوں میں استاد تھے۔ تمام اساتذہ کرام چاہے وہ مجھے متعلقہ مضمون پڑھاتے بھی نہیں مگر نہایت شفقت، محبت اور

حوصلہ افزائی کا سلوک فرماتے تھے۔ ہمارے شیخ الجامعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم' ڈاکٹر محمود حسین مرحوم' ڈاکٹر عزیز احمد صاحب' ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب' ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب' ڈاکٹر جمیل اختر صاحب' ہماری چھوٹی سے چھوٹی صلاحیت کی تعریف کرتے' ہمت افزائی کرتے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہم زیادہ سے زیادہ محنت اور توجہ سے کام کرتے۔ میں اپنے اساتذہ کے اس احسان اور کردار کو کبھی نہیں بھلا سکتی۔ سعدیہ کی پلکیں بار احسان سے بھیگ چلی تھیں۔

میری شاعری کا سفر تو جاری ہی تھا لیکن اس کے ساتھ میں بین الکلیاتی مباحث میں بھی حصہ لے رہی تھی۔ مثلاً" میں نے اپنی چھوٹی بہن فائزہ صدیقی (پروفیسر فائزہ احسان) کے ساتھ مل کر سرسید گرلز کالج میں مسلسل تین سال تک ٹرافی (نشان ظفر) حاصل کیا۔ این ای ڈی کالج (وہ اس وقت یونیورسٹی نہیں تھا) کے مباحثے میں' میں نے بہترین خاتون مقررہ کی ٹرافی حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی کا بین الجامعاتی مباحثہ بھی بڑا یادگار مباحثہ تھا' اس میں اردو مباحثے میں مجھے اول ظہور الحسن بھوپالی شہید کو سوم انگریزی مباحثے میں شاہد عزیز صدیقی کو اول اور جاوید جبار کو دوم انعامات ملے۔ نتیجے میں دونوں ٹرافیز کراچی یونیورسٹی کو ملیں' جو آج تک وہاں موجود ہیں۔

جامعہ کراچی میں لیکچرار بننے کے بعد زندگی میں' میں نے جو پہلی کلاس لی' وہ ایم۔ اے فائنل کی تھی۔ (اصلی استاد رخصت پر تھے) پرچہ تھا عالمی سیاست' اس کلاس کو پڑھانے کے لئے میں نے کراچی کے تمام کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ سارا زور خطابت صرف کیا تب کہیں جا کر بات بنی۔ یہ بھی میرے اساتذہ ہی کی تربیت تھی۔ بی۔ اے آنرز کو میں "دساتیر کا تقابلی مطالعہ" پڑھاتی تھی۔ جسٹس راجہ قریشی' سلیم رضا بھٹو' رضا ربانی' تاجدار عادل' شاہدہ حسن' حسن اللہ ہما' ساجد علی ساجد سب اسی زمانے کے شاگرد ہیں۔

غالباً" 1974ء میں میرے شوہر محمد روشن صدیقی صاحب نے بیرون ملک آنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد مجھے بھی اپنے علمی اور ادبی مشاغل کو ترک کر کے مشرق وسطیٰ آنا پڑا۔ بحرین' دبئی اور اب سترہ سال سے میں ابوظہبی میں ہوں۔"

اب کچھ اردو زبان کے بارے میں بات ہو جائے' میرا سوال سن کر سعدیہ بولیں۔ "اردو زبان دنیا میں بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار چوتھی زبان ہے۔ یہ یقیناً" خوشی کی بات ہے لیکن مجھے زیادہ خوشی اس وقت ہوگی' جب وہ زیادہ بولی جانے والی نہیں زیادہ لکھی جانے والی اور زیادہ پڑھی جانے والی زبان بن جائے۔ جب پاکستان کے آئین کے مطابق وہ سرکاری اور دفتری زبان بن جائے۔ ہمارے یہاں اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کا امتحان اور اس کا وائیوا (زبانی امتحان) اردو میں ہونے لگے۔ ملک میں انگریزی ضرور پڑھائی جائے لیکن تمام تعلیمی ادارے

اردو میڈیم ہوں، چین جاپان، جرمنی اور فرانس کی طرح ہم اپنی قومی زبان بولیں، لکھیں اور پڑھیں۔ رہ گئی اس کی بین الاقوامی حیثیت تو جب تک ہم مالی اور سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے مضبوط و مستحکم نہیں ہوں گے، ہمارے حقوق کی طرح ہماری زبان کو بھی تب ہی عالمی حیثیت اور اہمیت ملے گی۔"

سعدیہ شاعری میں غزل کی صنف کو اظہار خیال کے لئے بہتر سمجھتی ہیں۔ ایک شعر میں اپنی خوبصورت سوچ کا اظہار کر رہی ہیں۔۔

غزل کہنے کی یہ کوشش تو دیکھو
ثقافت کو مرتب کر رہی ہوں

نثری نظم کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس کا مواد یا خیال اس کے بارے میں رائے کو قائم کرتا ہے۔ مشاعروں کے بارے میں کہتی ہیں کہ متحدہ عرب امارات کے مشاعروں کو سننے اور دیکھنے بعد میرا خیال ہے کہ مشاعرے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہونے علاوہ اسٹیج شوز بھی ہیں جبکہ ادب کی تخلیق اور تہذیب کے لئے تخلیقی نشستیں اور ادبی جرائد زیادہ بہتر کردار ادا کرسکتے ہیں۔

سعدیہ متفق ہیں کہ دور حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے۔ ان کا اپنا تجربہ بھی یہی ہے۔ کہتی ہیں، ہمارے بعض سینئرز شعوری طور پر یہ کر رہے ہیں کہ جب کوئی تازہ فکر شاعر عملی زندگی کے مسائل کا ذکر کرتا ہے تو اسے غیر ادبی رویہ کہہ کر غزل کو ناقابل اشاعت قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہاں جس غزل میں صرف رومانی، تصوراتی اور غیر اخلاقی، غیر قانونی، غیر شرعی روابط کا ذکر ہوتا ہے، اس کی پذیرائی ہوتی ہے چنانچہ قاری سے مضبوط رشتہ جب ہی استوار ہوگا، جب آپ اس کے مسائل کا عملی، اخلاقی، قانونی اور شرعی حل اس کے سامنے رکھیں گے۔ ورنہ ادب بے اثر، منفی، گمراہ کن ہی رہے گا۔ بلاشبہ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ فرد اور معاشرے کے تمام مسائل کو مثبت انداز میں تعمیری مقاصد کے تحت پیش کریں تاکہ ادب بے کاری اور بے عملی کی ترغیب دینے کے بجائے معاشرے کو آلودگی سے پاک کرنے اور مثبت قدروں کو پروان چڑھائے۔

آخری سوال کے جواب میں سعدیہ کہتی ہیں۔ یقیناً" بیرونی فیشن کی پیروی سے اچھا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ آج فیکس، انٹرنیٹ اور ای میل جیسی ایجادات سے جغرافیائی فاصلے تو کم ہو گئے ہیں لیکن مقامی مسائل، ہمارا نظام حیات، ہمارا تمدن، تہذیب معاشرت، ہمارے احساسات، ہمارا طرز عمل اور رویہ ہم سے ایسا ہی ادب چاہتا ہے جو ہمارا اپنا ہو۔ دوسروں کی نقل اور تقلید سے ہمیں فائدہ نہیں، نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے عقل و شعور کا تقاضہ یہ ہے کہ سب نئی ایجادات اور تکنیک کو اپنے حالات کے مطابق استعمال کیا جائے۔

عکس فن

"دانش وری"

تو کیا دانش وری
سورج مکھی کا پھول ہوتی ہے؟
کہ جو بھی زیب منبر ہو
سریر آرائے مسند ہو
افق پر جو ابھر آئے
اسی کی سمت ہم دیکھیں
سر تسلیم خم کر کے
مصاحب شہ کے بن جائیں
تو کیا دانشوری
سورج مکھی کا پھول ہوتی ہے؟
سیاست کے افق کا جب
کوئی منظر بدل جائے
قیادت بھی نئی آئے
تو اس کے بعد یہ سوچیں
گذشتہ دور کیسا تھا؟
عوامی تھا کہ فسطائی؟
نراجی تھا کہ جمہوری؟
ہمارا حکمراں کیا تھا؟
ہمارا طور کیسا تھا؟
گذشتہ دور کیسا تھا؟
تو کیا دانش وری
سورج مکھی کا پھول ہوتی ہے؟

[illegible] بھی نہ تھا

وہ آدمی جس سے پہلے اگرچہ کہیں ملا بھی نہ تھا

محمود شام

Mehmood Sham
A-262, Block-3
Gulshan-e-Iqbal
Karachi-74000, Pakistan

محمود شام
کراچی

محمد طارق محمود ان کا نام ہے اور شام تخلص۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا تھا کہ اس "شام" کو کیا معنی پہنائے جائیں۔ سلونی نکھری نکھری شام یا برندا بن کا محبت بانٹنے والا شام۔ بولے، جو معنی چاہے لے لیں۔ تو پھر میں نے انہیں من موہن والا شام ہی سمجھا حالانکہ رکھ رکھاؤ کی گفتگو کرنے والا برندا بن کا شام تو ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر کفر کا فتویٰ بھی تو لگ سکتا ہے۔ اس لئے بھی لوگ انہیں۔

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کی "شام" سے مناسبت دیتے ہیں گو بقول ڈاکٹر اسلم فرخی انہوں نے اپنا تخلص شام اس لئے قرار دیا ہے کہ وہ آزادانہ طور پر ان تمام کیفیات کا ذکر کر سکیں، جن سے شام کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ شام ڈوبتی ہوئی نبضوں، اداس لمحوں، آوارہ ہواؤں، کم ہوتی ہوئی روشنیوں اور خراب و خستہ حال انسانوں کی علامت ہے۔ یہ رائے ان کے مجموعہ چہرہ چہرہ مری کہانی میں موجود ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی استاد ہیں۔ ان کی رائے پر کیا کلام لیکن اداس لمحے اور آوارہ ہوائیں ہی تو وہ جذبے بھی جگاتی ہیں، جب ایک شاعر دیس دیس کی خاک چھان کر بھی یہی کہتا ہے کہ۔

غسل آخر سے اتر جائے گی
ملکوں ملکوں سے جو لپٹی مٹی

جانے کس دیس کی آغوش ملے
ساتھ رکھتے ہیں وطن کی مٹی

اپنی مٹی سے اتنی محبت کرنے والے شاعر کو میں نے صحافی کی حیثیت سے جانا۔ 1967ء میں محمود شام "اخبار جہاں" کراچی سے وابستہ ہوئے۔ میں بھی اس زمانے میں روزنامہ جنگ کراچی میں صفحہ خواتین کی انچارج تھی' ان سے سرراہے ملاقات ہوتی اور سلام دعا بس۔ محمود شام پیپلزپارٹی سے وابستہ تھے۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا' اس لئے بھی واسطہ کم رہا' مگر جب بھی گفتگو ہوئی گو مختصر سہی مگر انہیں بہت سلجھا سلجھا سا' کم سخن اور دردمند پایا۔ ایسا شخص ہی بہت اچھا شاعر بھی ہو سکتا ہے' جس کی انسانیت نوازی کی تعریف دوسرے کریں۔

محمود شام 15/ فروری 1940ء کے دن ریاست پٹیالہ ہندوستان کے شہر راجپورہ میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ لاہور کالج سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ بحیثیت صحافی 1963ء سے 1967ء تک نوائے وقت سے وابستہ رہے۔ 1967ء سے 1975ء تک اخبار جہاں کے مدیر رہے۔ اپنے ہفت روزہ معیار سے 1975ء سے 1994ء تک وابستہ رہے اور اب 1994ء سے تاحال روزنامہ جنگ کراچی کے ایڈیٹر ہیں۔

شام جی نے شاعری کے علاوہ انشائیے لکھے ہیں۔ ایک ناول بھی لکھ رہے ہیں' جو جلد ہی شائع ہوگا۔ ان کا کلام "نقوش" لاہور کے علاوہ ہر قابل ذکر جریدے میں چھپ چکا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام میں کارڈیو سپازم (طویل نظم) آخری رقص (نظموں اور منظوم تراجم کا مجموعہ) غزلوں اور نظموں کا مجموعہ چہرہ چہرہ مری کہانی نوشتہ ءدیوار' قربانیوں کا موسم اور سفرناموں میں برطانیہ میں خزاں' کتنا قریب کتنا دور' مضامین کا مجموعہ خواتین و حضرات' شائع ہو چکے ہیں۔ غزلوں اور نظموں کا اگلا مجموعہ "محلوں میں سرحدیں" زیر طبع ہے' ان کے بے شمار سیاسی انٹرویوز بھی شائع ہوئے ہیں۔ کسی مکتب فکر سے وابستگی نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں جو دیکھتا ہوں' محسوس کرتا ہوں' وہی لکھتا ہوں۔

اردو زبان کے فروغ سے محمود شام مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو نئے نئے الفاظ اپنا رہی ہے۔ اس کا دامن پہلے بھی وسیع تھا' اب بھی وسعتیں اور برکتیں اس کا مقدر ہیں۔ بیرون ملک مقیم اردو خواں اور اردو نگار اسے اور زیادہ مالا مال اور مستحکم کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود کہ محمود شام خود خان ظفر افغانی کی کتاب "سخن امروز" کی رونمائی کے موقع پر اپنی تقریر میں ادبی انٹرویوز کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ایک لکھنے والے کی تخلیقات کے ذریعے قارئین اس کے اسلوب نگارش' زبان پر عبور' الفاظ کے رکھ رکھاؤ سے تو آگہی حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن قاری کو تخلیق کار کی ذات کے قریب لانے میں روزمرہ کے معاملات جاننے میں ادب اور زندگی سے متعلق نظریات کے بارے میں گردوپیش اور عہد کے سلسلے میں ادبی

انٹرویوز ہی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں یہ ساری باتیں قارئین کے حوالے سے کر رہا ہوں۔ اہل قلم کے حوالے سے نہیں۔ ہم اہل قلم میں صرف اپنا نام دیکھ کر اپنی تخلیق پڑھنے کے علاوہ کسی اور چیز کے مطالعہ کی عادت بھی نہیں رہی۔ رسالہ آیا تو اس میں سب سے پہلے یہی دیکھتے ہیں کہ اپنی تخلیق کہاں شائع ہوئی ہے۔ مقام مرضی کے مطابق ملا تو خوش ہو گئے ورنہ کڑھ کر رسالہ رکھ دیتے ہیں کہ باقی چیزیں بعد میں دیکھیں گے۔"

لیکن اس فضا میں بھی محمود شام میری طرح اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں کہ امید کا دیا جلتے رہنا چاہئے۔ کبھی تو تاریکی چھٹے گی ہی.........!

محمود شام غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی کوشش کرتے ہیں۔ غزل انہیں زیادہ تسکین بخشتی ہے۔ غزل کو حرف باز ناں گفتن اور حرف باز ماں گفتن دونوں کے لئے مکمل ذریعہ سمجھتے ہیں اور اسی طور برتتے بھی ہیں' البتہ نثری نظم کو معذوروں کے لئے مختص سہولت سمجھتے ہیں۔ جیسے زندگی کے مختلف شعبوں میں معذوروں کے لئے سہولتیں مخصوص کی جاتی ہیں۔ یہ بھی ایسا ہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نظم نظم ہے اور نثر نثر۔ اچھی نثر بھی لوگ پسند کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ نظم کا لاحقہ ضروری نہیں ہے۔ مشاعروں کے سلسلے میں ان کی رائے ہے کہ یقیناً" ادبی ذوق پیدا کرتے ہیں جبکہ تخلیقی نشستیں تو محدود سطح پر چلتی ہی رہتی ہیں۔ مشاعرے زیادہ بڑے حلقے تک ابلاغ کا وسیلہ بنتے ہیں۔

شام جی اس خیال سے متفق نہیں کہ دور حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے اور قاری سے اس کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب ہر دور میں دو حصوں میں بٹا رہا ہے۔ بعض لکھنے والے عملی دنیا سے وابستہ رہے ہیں اور وہی لکھتے رہے ہیں' جو محسوس کرتے رہے ہیں' دیکھتے رہے ہیں' اس لئے ان کا رشتہ قاری سے مضبوط رہا ہے۔ اکثر لکھنے والوں کی تخلیقات میں قارئین کے مسائل اور دکھ درد منعکس ہوتے رہتے ہیں چنانچہ قاری یقیناً" اپنے آپ کو ان کی تحریروں میں سانس لیتا ہوا پاتا ہے اور لکھنے والے کو اپنا ہمدرد محسوس کرتا ہے۔ اگر اسے اپنا عکس اس آئینے میں نظر نہ آئے تو وہ دوبارہ اس آئینے میں جھانکنے کی زحمت کیوں کرے گا؟ یہی وجہ ہے کہ آج بھی وہ لکھنے والے معاشرے میں مقبول ہیں اور بااثر بھی جو معاشرے کی بر آب اور زیر آب موجوں کو اپنے الفاظ کا لبادہ پہناتے ہیں۔

میرا اگلا سوال تھا کہ ہمارے سینئر ادیبوں کی رائے کے مطابق آج ہم مغرب کے رجحانات اور اس کے ادب کی پیروی کر کے وہاں کے ادبی فیشن اپنے ملک میں درآمد کر رہے ہیں جبکہ ہمیں مغرب سے تکنیک ضرور سیکھنا چاہئے لیکن مسائل' حسیت اور احساس و شعور ہمارے اپنے ہونا چاہئیں کیونکہ بیرونی فیشن کی پیروی سے اچھا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔

محمود شام نے بڑے غور سے سوال کا جائزہ لیا اور پھر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "معلوم نہیں یہ کون سے ادیب ہیں جو اس انداز سے ایک بے معنی بات کر رہے ہیں۔ آج دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو رہی ہے اور ہو چکی ہے۔ دنیا کا ہر حصہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ایک منٹ پہلے ہونے والا واقعہ سیٹلائٹ کے ذریعے کل عالم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ڈش سے مختلف چینل ہر روز نئے محسوسات اور رویئے منتقل کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ آپ کے شعور کا حصہ بن رہا ہے۔ شعری اور ادبی تجربے میں شامل ہو رہا ہے۔ ادب عالیہ ان اعلیٰ قدروں، محسوسات اور تخلیقات کا نام ہے، جو زمانی، علاقائی اور عقیدتی حد بندیوں سے ماورا ہوتے ہیں۔ ہر ادیب کا اپنا اسلوب ہوتا ہے، جو وہ اپنے گرد و پیش پھیلے ہوئے ماحول سے اور روزانہ پیش ہونے والے واقعات سے ترتیب دیتا ہے۔ بہت کچھ ہم مغرب سے سیکھ رہے ہیں، بہت کچھ مغرب ہم سے سیکھ رہا ہے۔ حال ہی میں زیادہ تر ادبی ایوارڈز مشرق سے تعلق رکھنے والے نئے لکھنے والوں کے حصے میں آرہے ہیں۔ مغرب تو اپنے محسوسات اور اقدار سے بیزار ہو رہا ہے۔ اسے ایشیائی ثقافت اور تہذیب میں زیادہ اپنائیت اور حقیقت نظر آرہی ہے۔ حقیقت سے قریب جو ادب بھی ہوگا، وہی بقا پائے گا۔ چاہے وہ مغرب میں ہو یا مشرق میں۔ اگر مشرقی زندگی میں مغرب کے اثرات داخل ہو چکے ہیں تو ان سے صرف نظر بھی غیر حقیقت پسندانہ ہوگا اور اگر مغربی زندگی میں مشرقی طرز معاشرت اپنی جگہ بنا رہی ہے تو مغرب کا حقیقت پسند ادیب اس کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

عکس فن

غزل

چڑھتا ہوا جوبن ہے، اترے ہوئے چہرے ہیں
دہکی ہوئی آنکھیں ہیں، جھلسے ہوئے چہرے ہیں

ٹہنی پہ کسی لب کی مسکان نہیں کھلتی
سوچوں کی صلیبوں پر لٹکے ہوئے چہرے ہیں

تسخیر مہ و انجم تعمیر فلک بوساں
پر خوف دروں ایسا سہمے ہوئے چہرے ہیں

قدموں میں زمانہ ہے، ہاتھوں میں جہاں لیکن
ایک لمحہ تسکیں کو ترسے ہوئے چہرے ہیں

سرمایہ ہے بے پایاں تا حد نظر امکاں
پھر بھی کسی تنگی میں جکڑے ہوئے چہرے ہیں

قربت ہے کہ فرقت ہے شیڈول میں لکھا ہے
انساں ہیں کہ نکتوں سے ابھرے ہوئے چہرے ہیں

ہڈسن کی روانی ہے دلدار سمندر ہے
پیاسی ہیں مگر روحیں سوکھے ہوئے چہرے ہیں

سرسبز جزیرے ہیں دامن میں لئے منظر
تاریک فلیٹوں میں دبکے ہوئے چہرے ہیں

ڈاکٹر محمد ہارون صدیقی شاہد
کراچی

ڈاکٹر ہارون شاہد کی ایک ہی غزل کے دو شعر ان کے دو مختلف موڈ اور مزاج کا پتہ دیتے ہیں۔ مطلع ہے۔۔

تپش ہے دھوپ میں سورج خفا معلوم ہوتا ہے
یہ ہے وہ روز جو روز جزا معلوم ہوتا ہے

بہت اٹھلا کے جب بھی بات کرتا ہے رقیبوں سے
وہ سب لطف و کرم کتنا برا معلوم ہوتا ہے

یوں ان کے کلام میں قدیم و جدید کا مزاج ہم آہنگ ہے۔ ایک ہی غزل میں میر اور سودا کے انداز میں رقیب کا ذکر ہے تو دوسری جگہ روز مرہ کے مصائب اور مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش ہے۔

یوں تو بقول ڈاکٹر شاہد ان کا رجحان مزاحیہ شاعری کی طرف تھا۔ میڈیکل کالج کے زمانے میں دوستوں کی محفل میں جب نثر میں لطیفے بیان ہوتے تھے تو ڈاکٹر شاہد اشعار میں مضامین باندھتے تھے۔۔

مریضوں کی فغاں ہے اور میں ہوں
دل آتش بجاں ہے اور میں ہوں
بہت پڑھتا رہا ہوں سرجری کو
دماغ ناتواں ہے اور میں ہوں

اسکول کے زمانے میں کورس کی کتابوں سے اساتذہ کی نظمیں پڑھ کر ان کے مصرعوں پر پیروڈی کرتے تھے۔ خود گھر میں اکیلے تھے۔ ان کی پیدائش کے دس سال بعد ان کا چھوٹا بھائی پیدا ہوا۔ اپنی تنہائی میں انہوں نے بچوں کے رسالوں کو "ساتھی" بنایا۔ یوں ان کا لکھنے لکھانے کا سلسلہ چل نکلا حالانکہ گھر میں کسی کو ادب سے لگاؤ نہ تھا مگر وہ جو کہتے ہیں اللہ کی دین۔ سو وہ ڈاکٹر شاہد کو ودیعت ہوئی۔

پھر اس میں کمی اس وقت آئی، جب انہوں نے سنجیدگی سے میڈیکل کی پڑھائی شروع کی۔ اس کے بعد اپنے کاروبار میں الجھے لیکن اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے جب بھی موقع ملتا شعر کہہ لیتے۔ یوں ان کی سالوں کی کاوش نے "میں سوچتا رہتا ہوں" کے عنوان سے 1995ء میں ایک شعری مجموعہ کی صورت اختیار کی۔

ڈاکٹر محمد ہارون بتاتے ہیں کہ وہ 6 جنوری 1939ء کو سیتاپور (یوپی - ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ اودھ کی تہذیب، ان کے مزاج میں اور ان کے کلام میں رچی بسی ہوئی ہے گو ان کی تعلیم کراچی میں ہوئی مگر بچپن میں گھریلو ماحول اور زبان کے اثرات نے اپنا اثر تو دکھایا ہے۔ 1947ء میں کراچی آئے۔ بی ایس سی ڈی جے سائنس کالج کراچی سے اور پھر ایم بی بی ایس داؤد میڈیکل کالج کراچی سے کیا۔ ان کے والد صاحب کا دواؤں کا کاروبار تھا۔ یونانی داؤں کا رواج تھا۔ والد صاحب نے یونانی اور آیورویدک پڑھ کر چھوٹے پیمانے پر "کپور کیمیکل ورکس" کے نام سے سیتاپور میں اپنا کارخانہ شروع کیا۔ لکھنؤ سے 80 میل دور پر سیتاپور اس زمانے میں ایک بڑی منڈی تھی۔ والد صاحب دہلی سے گولیاں بنانے کی مشین لائے، جس میں پاؤڈر ڈالا جاتا جو گولیوں کی شکل میں نمودار ہوتا۔ محمد ہارون کے لئے یہ نئی بات تھی مگر انہی چھوٹی چھوٹی باتوں نے فارماسیوٹیکل کمپنی کھولنے کا رجحان پیدا ہوا چنانچہ والد کی بیماری کے زمانے میں ڈاکٹر ہارون نے کاروبار سنبھالا اور اب ایپلا لیبارٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ کراچی کے چیئرمین کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں اور اب دونوں شخصیات ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ شاعر اور مسیحا یعنی مسیحا شاعر بھی ہے اور شاعر مسیحا بھی۔ اس پر مجھے یہ شعر یاد آیا۔

خود ہی بنتے ہیں وجہ بیماری
اور خود ہی طبیب ہوتے ہیں

ڈاکٹر شاہد شاعری کے قدیم و جدید دونوں مکتب فکر سے متاثر ہیں۔ ان کا کلام روزنامہ "جنگ" کے ادبی صفحہ کے علاوہ ماہنامہ دنیائے ادب کراچی اور اقدار سہ ماہی کراچی میں شائع

ہوتا ہے۔ کم سخن ہیں اور کم گو بھی۔ تین بیٹا بیٹی ہیں جو امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔
ان کی زندگی کا وہ واقعہ جو ان کے ذہن پر دائمی اثرات چھوڑ گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ”میں سیتاپور میں زیر تعلیم تھا۔ 1947ء میں تقسیم ہند ہو چکی تھی۔ ایک روز میں اسکول میں تھا کہ شور ہوا کہ ہندوؤں نے حملہ کردیا ہے' سب بچے اسکول چھوڑ کر چلے جائیں' میں شاید تیسری جماعت میں تھا۔ اسکول آنے والے تقریباً“ تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ میرے ایک ہم جماعت نے میری پریشانی دیکھ کر مجھے اپنے ساتھ لیا اور اسکول کے عقبی گلی کوچوں سے لے جاکر کسی عزیز کے ہاں چھوڑا' جہاں سے میرے والد کو مطلع کیا گیا اور وہ آکر مجھے لے گئے۔“

ڈاکٹر ہارون نے اردو کے مستقبل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ ”آج کی اس تیز رفتار زندگی میں دنیا سمٹ کر ایک بین الاقوامی گاؤں بن گئی ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی نقل مکانی نے بیشتر مشرق کو مغرب میں پہنچا دیا ہے۔ اس ہجرت کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی بتدریج خطہ ءارض پر پھیلتی جارہی ہے' لہٰذا اردو کا مستقبل بھی ایک حد تک تابناک ہے اور ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر شاہد شاعری میں غزل اور نظم دونوں ہی کو اظہار خیال کے لئے موزوں تصور کرتے ہیں۔ نثری نظم میں ان کے خیال میں چاشنی ہے نہ حلاوت اور نہ ہی دلوں کو گرما دینے والی حرارت۔ آج کے دور کے مشاعروں اور تخلیقی نشستوں کے بارے میں کہتے ہیں..... ”دونوں کا اپنا مقام ہے اور ان کی افادیت بھی مسلمہ ہے۔“

ڈاکٹر شاہد جزوی طور پر اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ ”ادب سے قاری کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے۔ ان کے بقول دوسرے میڈیا ز نے آج قاری کو پہلے سے زیادہ باشعور بنا دیا ہے اور جنہیں ادب کا شوق ہے' وہ کسی نہ کسی طور ادب سے اپنا رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جیسے رسالہ ”آجکل“ جو انٹرنیٹ پر پڑھا جارہا ہے۔

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ”مجھے کلی طور سے اتفاق ہے۔ مزید برآں اتنا اضافہ ضرور کروں گا کہ مغرب سے اچھی و مثبت باتیں لے لیجئے اور بری و منفی باتیں چھوڑ دیجئے۔“

ڈاکٹر محمد ہارون صدیقی شاہد جہاں ادب کا وقار ہیں' وہاں پاکستان کے لئے ایک اعزاز بھی کہ انہیں یوگینڈا نے پاکستان میں اپنا اعزازی قونصلر بھی چنا ہے' اس طرح آپ پاکستان میں یوگینڈا کے اعزازی قونصلر ہیں۔ بلاشبہ یہ نہ صرف ان کی محنت بلکہ ہر دلعزیزی کا بھی ثبوت ہے۔

عکسِ فن

غزل

عافیت کا نشان بن کر دیکھ
پیار کی تو زبان بن کر دیکھ

تیرے پیچھے چلے گی اک دنیا
تو بلالی اذان بن کر دیکھ

مہر برلب ہیں بیکس و مظلوم
ان کا تو ترجمان بن کر دیکھ

پیار تجھ سے کرے گی کل خلقت
آدمیت کی شان بن کر دیکھ

کچھ جو بننا ہے تجھ کو اے شاہد
فیض کا سائبان بن کر دیکھ

تو سرِ بام ہوا بن کے گزرتا کیوں ہے
میرے ملبوس کی عادت نہیں لہرا جانا

شاہدہ حسن
۲۲ دسمبر ۹۷ء

Shaheda Hasan
J-308, Rufi Lake Drive
Block-18, Gulistan -e- Jauhar
Karachi, Pakistan

شاہدہ حسن
کراچی

شاہدہ حسن کا پہلا مجموعہ ء کلام "اک تارا ہے سرہانے مرے" میرے ہاتھ میں تھا اور شاہدہ میرے سامنے۔ میں نے شاہدہ سے پوچھا کہ مجموعہ کے اس نام کے پیچھے کون سا جذبہ اور کیسی کیفیت روشن تھی۔ تب شاہدہ نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ "جب میں تحصیل علم کی راہوں پر نکلی تو اور بہت سی خوبصورت آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اتنی آوازیں کہ دل و جاں مسحر ہونے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ سچے لفظوں سے رشتہ رکھنے والوں کی اپنی ہی دنیا ہوتی ہے جو انہیں سرمست اور بے خود رکھتی ہے۔ اس سرمستی کی روشنی دور تک پھیلی ہوتی ہے۔ میں نے ان روشنیوں سے ایک معاہدہ کرلیا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے مجھے عمر بھر روشنیاں چننی ہیں اور ان کی ہر دستک پر دل کا دروازہ کھولنا ہے' اس لئے میں نے یہ نام چنا۔ یہ ایک اعلان بھی ہے' جس کے ساتھ میں شہر سخن کے در تک آئی ہوں۔ سچائی کی سرمستی اور بے خودی کے احساس کے ساتھ جس کی لذت ہی عجیب ہے' جسے میں اپنے بچپن میں اچھے اور سچے لوگوں کی دسترس میں بڑی حسرت سے دیکھا کرتی تھی۔"

شاہدہ نے سخن در حصہ سوم کے تمام سوالوں کا جواب بڑے آرام اور بڑے سکون سے دیا۔ اب اس میں کٹوتی کرنا بددیانتی ہوتی چنانچہ میں شاہدہ کی سوچ اور فکر کو جوں کی توں آپ تک پہنچا رہی ہوں۔ یہ معلومات یقیناً" بے حد مفید ہیں۔

سیدہ شاہدہ حسن 24/ نومبر 1953ء کو چٹا گانگ (سابق مشرقی پاکستان حال بنگلہ دیش) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد وہاں نیوی میں تھے۔ 2 سال کی عمر میں والدین کے ساتھ کراچی آگئیں۔ جامعہ کراچی سے ایم اے انگریزی میں 1975ء میں کیا اور 1978ء سے درس و

تدریس سے وابستہ ہو گئیں۔ بحیثیت لیکچرار دادو ڈسٹرکٹ سندھ، پھر بی ای سی ایچ ایس گرلز کالج اور عبداللہ کالج سے وابستہ رہیں۔ اب گورنمنٹ ڈگری سائنس اینڈ کامرس کالج گلشن اقبال شعبہ انگریزی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

میں نے پوچھا شاعری کے علاوہ اور کسی میدان میں طبع آزمائی کی؟

جواب ملا کہ شاعری کے علاوہ معاصر ادب پر تجزیاتی اور تنقیدی مضامین بھی لکھتی رہتی ہوں۔ کسی خاص مکتبہ فکر سے باقاعدہ منسلک ہو کر کبھی نہیں لکھا۔ میں نے جن دنوں پڑھنے لکھنے کا آغاز کیا اردو شاعری میں فیض، ندیم، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، اختر الایمان اور ناصر کاظمی کی آواز گونج رہی تھی بلکہ ان کے بعد آنے والے شعراء بھی اپنی اپنی انفرادیت کے رنگ بکھیر رہے تھے۔ میں نے کلاسیکی اردو ادب کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے شعراء کا مطالعہ بھی کیا پھر انگریزی ادب اور مغربی ادب کے تراجم تک رسائی بھی سہل ہو چکی تھی اور زیادہ تر نئے لکھنے والے ان سے اثرات قبول کر رہے تھے۔ کراچی میں ان دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس اور ادبی نشستوں میں سقوط ڈھاکہ کے بعد کراچی منتقل ہونے والے شعراء اور کراچی کے نوجوان لکھنے والے شرکت کرتے تھے۔ ریڈیو پاکستان کراچی میں بزم طلباء پروگرام کے حوالے سے قمر جمیل صاحب، عصمت زہرہ صاحبہ اور ضمیر علی صاحب جیسے پروڈیوسر تھے، جو نئے لکھنے والے طلباء و طالبات کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اکثر ان تخلیقات پر گفتگو کے سلسلے بھی رکھے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ ایک حلقہ بنتا گیا، جس میں ثروت حسین، شوکت عابد، سیما خان، اقبال فریدی، عذرا عباس، فاطمہ حسن، تنویر انجم، انور سن رائے اور دیگر کئی دوسرے لوگ شامل ہوتے گئے۔ منیر نیازی صاحب لاہور سے آتے تو کراچی کے یہ نوجوان اکثر ان سے گفتگو رکھتے، تازہ کلام سنتے اور سناتے۔ زیادہ تر ان دنوں قمر جمیل صاحب کا گھر، شام کے اوقات میں نثری نظم لکھنے والوں کے لئے ایک مستقل نشست گاہ بن گیا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی ان نشستوں میں شرکت کرتی تھی۔ ابتدا میں، میں نے بھی نثری نظمیں کہنے کی کوشش کی مگر میرا مزاج غزل کا تھا۔ اس لئے میں نثری نظمیں لکھنے کی طرف مائل نہ ہو سکی۔ میں جو کچھ شعبہ انگریزی میں اپنی کلاسوں میں پڑھ رہی تھی یا میرے اساتذہ جن میں انگریزی کی معروف شاعرہ مکی قریشی شامل تھیں اور بطور خاص ڈاکٹر کلیم الرحمان اور مایہ جمیل صاحبہ تھیں اور جس پیرائے میں وہ اپنے اپنے موضوعات پر گفتگو کرتے تھے اور لیکچرز دیتے تھے، وہ سب رنگا رنگی، میرے احساسات اور فکر کی دنیا کا حصہ بنتی جاتی تھی۔ اردو ادب کی شعری روایتیں اور اسالیب بھی میرے شعری تخیل کا حصہ بنے ہوئے تھے، اس لئے اظہار کی سطح پر اپنے جذبوں کو خدوخال دیتے ہوئے یہ دونوں شعری

روایات اور ان کی کیفیات ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگتی تھیں۔ میری شاعری میں میرا لہجہ انہی دونوں اثرات کے تحت تشکیل پایا ہے۔ میں نے ابتدا میں اپنی غزلیں جناب صہبا لکھنوی کو بھیجیں، جنہوں نے انہیں افکار میں جگہ دی اور ساتھ ہی نئی غزلوں کی فرمائش بھی کی۔ پھر میرا کلام سیپ، فنون، سویرا، ماہ نو، تخلیق، الفاظ اور شب خون میں شائع ہونے لگا۔ اس کے بعد دریافت، صریر اور ارتکاز کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے دیگر ادبی جرائد میں بھی وقتاً فوقتاً کلام یا انتخاب کلام شائع ہوتا رہا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں میری کوتاہی بھی بہت زیادہ رہی ہے۔ میں عام طور پر اپنا کلام جرائد کو ارسال نہیں کرتی تھی۔ ایک تو نسبتاً کم لکھتی تھی اور پھر زیادہ تر قریبی دوستوں کو سنا کر مطمئن ہو جاتی تھی یا کسی ادبی محفل یا نشست میں سنا لیتی تھی۔ میرا پہلا شعری مجموعہ "ایک تارہ ہے سرہانے میرے" کے نام سے 1995ء میں الحمد پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔"

میں نے شاہدہ سے پوچھا کہ پاکستان میں تو اب ترنم سے پڑھنے کا رواج نہیں تو کیا اس سے تحت اللفظ پڑھنے والے متاثر نہیں ہوتے۔ اس پر شاہدہ نے کہا کہ دبئی میں منعقد ہونے والے جشن خمار کی روداد سنئے۔ بیرون ملک اک عالمی مشاعرہ پڑھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ سلیم جعفری مرحوم اس کے روح رواں تھے۔ ان کے ساتھ ضیغم زیدی اور ڈاکٹر زیدی بھی منتظمین میں شامل تھے۔ پاکستان سے مدعو کئے جانے والے شعراء میں جون ایلیاء، احمد فراز حمایت علی شاعر، پیرزادہ قاسم اور دیگر شعراء کے ساتھ ساتھ پروین شاکر اور میں بھی دبئی پہنچے۔ میرا اور پروین کا انتظام سلیم جعفری کے گھر تھا۔ مشاعرہ سے ایک شام قبل جب ہم سلیم جعفری کی بیگم شاہدہ جعفری سے گفتگو میں مصروف تھے کہیں سے گانے کی آواز آنے لگی۔ پہلے تو ہم لوگوں نے توجہ نہ دی مگر جب دیر تک سلسلہ چلتا رہا تو آخر کار پروین نے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ پتہ چلا کہ ہندوستان سے جو شاعرات آئی ہیں، وہ کل کے مشاعرے کی پریکٹس میں مصروف ہیں اور غزل کی دھنیں ترتیب دی جارہی ہیں۔ میں ہمیشہ تحت اللفظ شعر پڑھنے کی عادی تھی۔ میرے لئے یہ انکشاف بڑا حیرت انگیز تھا کہ کل شام اتنا پر ترنم مشاعرہ منعقد ہونے والا ہے۔ خیر اگلے دن مشاعرہ گاہ میں پہنچے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب صدارت فرمارہے تھے اور خصوصی مہمان تھے حضرت خمار بارہ بنکوی، جن کے نام سے یہ جشن منعقد کیا جارہا تھا۔ مجھ سے پہلے ہندوستان کی شاعرات نے اپنا کلام پیش کیا۔ سامعین سے مکالمے بھی کرتی رہیں۔ ترنم بھی بڑا شاندار تھا۔ اس لئے سامعین خوب خوب محظوظ ہورہے تھے اور داد دے رہے تھے۔ مگر پھر میں نے دیکھا کہ جب دوسرے شعراء تحت اللفظ شعر سنانے آئے تو انہیں داد دی گئی۔ میرا حوصلہ بڑھنے لگا۔ اسی اثناء میں میری باری آئی اور میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی کہ سامعین نے جو اس سے قبل اچھے ترنم سے محظوظ

ہو رہے تھے، اچھے شعروں پر کھل کر داد دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ سناتے ہوئے شاہدہ نے کہا کہ غالباً" 1990ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں اکیڈمی ادبیات کے چیئرمین سندھی زبان کے معروف قلم کار جناب غلام ربانی آگرو تھے۔ ان کی سربراہی میں پاکستانی ادیبوں کا ایک وفد، جس میں میرے علاوہ مظہر یوسف، ایوب بلوچ، جاوید شاہین، زیتون بانو وغیرہ شامل تھے۔ چین کے ادبی دورے پر روانہ ہوا۔ بیجنگ میں مختصر قیام کے بعد ہم سنکیانگ پہنچے۔ جہاں ہمارے اعزاز میں ایک ثقافتی تقریب کا اہتمام تھا۔ ایک بہت بڑے ہال میں ہم اپنی خوبصورت چینی اسکواڈ کے ساتھ داخل ہوئے تو رنگ برنگے ملبوسات میں سجی گڑیوں جیسی چینی فنکارائیں ہمارے استقبال کے لئے آگے بڑھیں۔ بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا گیا اور ہمیں خصوصی نشستوں پر بٹھایا گیا۔ کچھ دیر بعد ہماری پذیرائی کے لئے ایک وسیع اور سجے سجائے اسٹیج پر جسمانی کرتب کے مظاہرے، رقص اور چینی موسیقی پیش کی جانے لگی۔ ہم ان خوبصورت لمحات میں گم، اس شاندار پذیرائی کا لطف اٹھا رہے تھے کہ اچانک قریب بیٹھی ہوئی ہماری چینی میزبان خاتون نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہمیں اطلاع دی کہ اب اس کے بعد آپ لوگوں کو مدعو کیا جائے گا اور آپ کو بھی کوئی پاکستانی نغمہ یا رقص پیش کرنا ہوگا کہ یہی ہمارا روایتی انداز ہے۔ اس انکشاف کے ہوتے ہی ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے، انکار کی کوئی گنجائش اس لئے نہیں تھی کہ ہم حکومت پاکستان کے نمائندے تھے اور چینی حکومت ہماری میزبان تھی اور ظاہر ہے پروٹوکول کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ہمارے وفد میں نہ کوئی خوش گلو شامل تھا نہ کوئی رقص کے فن سے آشنا۔ آخر طے یہ پایا کہ کوئی قومی نغمہ سنادیں گے، لہٰذا فوری طور پر "سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد" جیسے نغموں کے بول یاد کئے جانے لگے مگر مشکل یہ آن پڑی کہ کوئی نغمہ ایک دو بول سے آگے یاد ہی نہیں آرہا تھا۔ پریشانی اور گھبراہٹ میں اگر نغمہ یاد آنے لگتا تو اس کی دھن ذہن سے محو ہونے لگتی اور اگر دھن یاد آجاتی تو بول یاد نہ آتے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وفد میں شامل ہم سب لوگ چونکہ پہلے سے ایک دوسرے سے ناواقف بھی تھے اور پہلی بار ملے تھے، اس لئے ہر شخص ایک دوسرے کی خفیہ صلاحیتوں سے بھی آشنا نہ تھا۔ آخر قرعہ فال میرے نام نکلا کہ کوئی فوری کارروائی کی جائے۔ میں نے کسی اندرونی تحریک کے زیر اثر چین اور پاکستان کی دوستی کے حوالے سے کچھ بول ایک کاغذ پر لکھنے شروع کئے اور ساتھ ہی گنگنانے کی ناکام کوشش بھی کی۔ کچھ نہ کچھ دھن بن گئی تو اسی پر مصرعے موزوں کرتے کرتے چار بند کی ایک نظم لکھی گئی، جس میں چینی عوام کی جدوجہد اور سخت کوشش زندگی اور پاکستان اور چین کی دوستی کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا اور ان کے لئے نیک خواہشات کا اظہار تھا۔ یہ مرحلہ طے تو ہوا مگر پریشانی اپنی جگہ تھی کہ آخر اسے پیش کیونکر کیا جائے گا مگر

اس وقت بڑا لطف آیا' جب مائک ہاتھ میں تھمایا گیا اور میرے ساتھ باقی سب لوگ بغیر تیاری کے ایک کاغذ پر لکھی ہوئی نظم کو آواز میں آواز ملا کر گانے لگے۔ اس اردو نظم کا چینی ترجمہ اردو سے آشنا ایک چینی دوست نے ہمارے میزبانوں کے لئے کیا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور ہم نے سکھ کا سانس لیا۔"

اردو کے مستقبل کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اردو کے مستقبل کو پاکستان میں تو کوئی خطرہ نہیں۔ اگرچہ یہاں بھی اسے ابھی تک اپنے پورے حقوق نہیں ملے اور قومی زبان ہونے کے باوجود اسے عملی طور پر اب تک سرکاری زبان کے طور پر نافذ نہیں کیا جاسکا ہے مگر پھر بھی اردو زبان و ادب کے حوالے سے مستقل کام ہو رہا ہے' جس میں نئی نسل بھی برابر کی شریک ہے بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ تخلیقی سطح پر اظہار کی ندرت اور تازگی سے اس زبان میں اظہار کی نئی گنجائشیں پیدا ہوتی جارہی ہیں مگر چونکہ ہجرت اور ترک وطن کے اس دور میں' اردو آج دنیا کے بہت سے ملکوں میں پہنچ چکی ہے اور وہاں اردو داں طبقہ اپنے اپنے طور پر اپنی روایتی قدروں اور زبان و ادب سے محبت کا اظہار بھی کر رہا ہے۔ اس لئے اس تناظر میں دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ان علاقوں میں اردو کا مستقبل کیا ہے۔ ظاہر ہے جن لوگوں نے نصف زندگی اپنے وطن میں گزاری ہے اور عمر کے ایک خاص حصے میں ترک وطن کیا ہے' وہ تو یقینی طور پر اردو زبان و ادب کو اپنی تہذیبی شناخت سمجھتے ہیں اور اپنی ذہنی اور فکری آسودگی کا وسیلہ بھی.... مگر جہاں تک ان کے بچوں کا تعلق ہے چونکہ وہ پیدا ہی ایک مختلف سرزمین پر ہوئے ہیں اور ان کی پرورش مغربی طرز فکر رکھنے والے معاشرے کے خطوط پر ہو رہی ہے' اس لئے اردو سے ان کی لاتعلقی ایک یقینی بات ہے کیونکہ اردو نہ تو ان کے لئے رابطے کی زبان کے طور پر اہم ہے اور نہ اس سے ان کو اپنے تعلیمی سلسلوں میں مدد ملتی ہے۔ ایسی صورت میں ترک وطن کرنے والے محبان اردو پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تہذیبی تشخص اور اپنے ادب اور زبان کی اہمیت کے پیش نظر اپنے بچوں میں اردو بولنے' سمجھنے اور لکھنے کے شوق کو بیدار رکھنے کے لئے انفرادی سطح پر مسلسل کوششیں کریں کیونکہ اگر اس سلسلے میں ابھی سے پیش بندی نہ کی گئی تو ہماری آئندہ نسل جدید عہد کے اس موج در موج سمندر میں اپنے نام کی کوئی لہر نہیں دیکھ سکے گی۔

نثری نظم کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اسے ایک شعری تجربہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ادب میں وسعت انہیں تجربات کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ کسی بھی صنف اظہار کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس صنف میں اظہار کرنے والوں نے اس میں کیا گنجائشیں پیدا کی ہیں۔ کہتی ہیں جو احساس یا جذبہ و فکر شعری صورت میں ڈھالا جارہا ہو' اس میں شعریت کا پیدا ہونا ہی اس کا معیار قرار پائے گا۔ نثری نظموں کی ایک خاصی بڑی تعداد

سامنے آچکی ہے مگر اس میں سے زیادہ تر شعری اعتبار سے اکثر سپاٹ اور بے لطف محسوس ہوتی ہیں اور ذہن و دل کو متاثر نہیں کر پاتیں۔ مگر ایسی بھی نثری نظمیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں، جن میں احساس کی تازگی اور نئی فکر کے ساتھ ایک رچاؤ ملتا ہے۔ میرا خیال ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ نثری نظم نے اپنا کیا مقام بنایا۔

آج کے مشاعروں کے متعلق شاہدہ حسن کی رائے بڑی جامع ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مشاعروں کا معیار اب بہت پست ہو گیا ہے۔ اب شاعر' شاعر نہیں رہا... Performing Artist بن گیا ہے اور اپنی حرکات و سکنات، اپنی پرفارمنس اپنی آواز اور اپنے ترنم سے مجمع کو کس قدر سحر زدہ کر سکتا ہے، اسی بات پر اس کی مقبولیت کا دارومدار ہے۔ مشاعروں میں زیادہ تر سطحی اشعار مقبول ہوتے ہیں جو با آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں اور اگر ان میں فکر یا احساس کا کوئی ایسا پہلو ہو جو سوچ بچار کی دعوت دے تو اکثر وہ سننے والوں کے سر پر سے گزر جاتا ہے۔ اسی لئے سنجیدہ شعری کاوشیں کرنے والے زیادہ تر مشاعروں میں ناکام قرار پاتے ہیں۔ اس سے ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ فوری مقبولیت حاصل کرنے والا اور مشاعرے کا کامیاب شاعر ہی اپنے وقت کا نمائندہ شاعر سمجھا جانے لگتا ہے اور اچھے شعراء پس پردہ چلے جاتے ہیں۔ یہ صورتحال اس لئے بھی پیدا ہوئی ہے کہ اب مشاعرے کمرشلائز ہو چکے ہیں اور مشاعرے منعقد کرنے والے ان سے ایک خاص آمدنی متوقع رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے مشاعرے کے لئے تو ایک تربیت یافتہ سماعت درکار ہوتی ہے مگر جب کوئی بھی شخص مشاعرے کا ٹکٹ خرید کر وقتی تفریح کی نیت سے مشاعرہ گاہ میں داخل ہو جائے گا تو وہ اپنے معیار کے مطابق محظوظ ہونا بھی چاہے گا۔ اس اعتبار سے مشاعرے اب زیادہ تر ذاتی پروپیگنڈے یا مالی منفعت کی نیت سے کئے جاتے ہیں اور ان کا وہ روایتی انداز جس سے آداب محفل اور نشست و برخواست کے سلیقے سکھانے تقدیم و تاخیر کی اہمیت سمجھانے اور ذہنی اور روحانی آسودگی بہم پہنچانے کا کام ممکن تھا یکسر بدل گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ادبی نشستیں زیادہ بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں کیونکہ ان میں چنیدہ اور منتخب لوگ ہی شرکت کرتے ہیں، جن کا ایک خاص ذہنی معیار اور ذوق ہوتا ہے اور ایسی نشستوں میں کسی تخلیق کی مختلف جہتوں پر کھل کر بات کی جا سکتی ہے۔ باہمی تبادلہ ء خیال سے کسی ادب پارے کی معنوی سطحوں تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ نشستیں خود شاعر کے حق میں بھی زیادہ بہتر ہوتی ہیں کہ اس طرح اسے اپنے کلام پر معیاری رد عمل کے اظہار سے، اپنی راہیں متعین کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

آج کے قاری کا ادب سے رشتہ برقرار ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں شاہدہ کہتی ہیں کہ جدید عہد بیک وقت ابلاغ Communication کا ایک حیرت انگیز عہد بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی اپنی ذات کے دائروں میں ہم ایک دوسرے سے بیگانہ بھی ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

زندگی کے ہر شعبے میں تغیر کے پیمانے تیزی سے گردش کر رہے ہیں اور اب زندگی ایک سیدھی سادی زندگی نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس زندگی کا ترجمان ادب بھی ایسا سادہ اور آسان نہیں ہو سکتا کہ قاری کو بہت آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ کچھ نہ کچھ سوچ کے پہلو ہوتے ہیں۔ احساس کے بہت سے تیور ہوتے ہیں' لہٰذا اس عہد کے ادیب اور قلم کار کو قصوروار نہیں ٹھہرانا چاہئے کہ اس کی تحریر قاری کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ قاری کو بھی چاہئے کہ اپنی ذہنی سطح کو بلند کرے تاکہ ادب میں منعکس ہونے والی زندگی کی مختلف جہتوں کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ایک سچے اور اچھے شاعر اور ادیب کا رشتہ اپنے قاری سے پوری طرح استوار ہے اور جو لوگ ادب سے سنجیدہ تعلق رکھتے ہیں' وہ آج بھی اپنے عہد کے ادب سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

آخری سوال کے جواب میں شاہدہ کا کہنا ہے کہ مغرب کے رجحانات اور تحریکوں کو بطور فیشن اپنا لینا تو ظاہر ہے درست نہیں اور نہ اس سے ادب کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے کیونکہ لایعنی تجربات آپ ہی دم توڑ دیتے ہیں مگر چونکہ اب مسلسل اثرات سے انکار ممکن نہیں رہا' اس لئے ادب و شاعری میں نئی تبدیلیاں تو یقیناً" ہوں گی۔ عہد جدید کا ایک اہم فکری رخ یہ ہے کہ آج پوری دنیا ایک Global Village کی حیثیت رکھتی ہے جو کچھ جہاں بھی ہو رہا ہے' سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہے۔ احساس و شعور بھی متاثر ہو رہے ہیں اور مسائل بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ E-Mail اور Internet کی سہولتوں نے سب کو ایک میز پر لا بٹھایا ہے۔ ایسے میں انسانی فکر' عالمی صورتحال کی زد میں رہتی ہے۔ اب ان سب باتوں کے اثرات جب زندگی پر ہو رہے ہیں تو ظاہر ہے ادب و شعر پر بھی ہوں گے۔ لہٰذا آج کا شاعر مغرب سے محض تکنیک لے کر تو اپنے عہد کا ترجمان نہیں بن سکتا۔ اسے اپنے عہد کی سچی ترجمانی کے لئے اپنی نئی نسل کو ایک پورے عہد کی نئی سچائیوں سے لبریز شاعری پیش کرنا ہوگی کیونکہ دنیا بھر کے ادب میں اب تراجم کے ذریعے بھی ہم ایک دوسرے کے احساسات کی کائنات میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ ان انسانی احساسات و جذبات کی زبان ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ اس لئے ادب کے حوالے سے ساری دنیا ایک دھاگے میں پروئی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اچھا ادب اسی سچائی کی بنیاد پر تخلیق پاتا ہے اور اپنی دائمی حیثیت متعین کرتا ہے مگر یہ سچ ہے کہ اس میں مقامی رنگ شامل کر کے اسے ایک منفرد ادب کے خدوخال دیئے جانے چاہئیں۔

عکسِ فن

غزل

سبب کیا ہے کبھی سمجھی نہیں میں
کہ ٹوٹی تو بہت بکھری نہیں میں

رکھی ہے گفتگو اس سے ہر اک پل
سخن جس سے کبھی رکھتی نہیں میں

یہ ضرب اپنے ہی ہاتھوں سے لگائی
کسی کے وار سے زخمی نہیں میں

کروں کیوں یاد تیرے خال و خط اب
شکستہ آئینے چنتی نہیں میں

عجب تھی رہ گزر بھی ہمرہی کی
قدم رکھ کر کبھی پلٹی نہیں میں

جو پہنچی ساحلوں پر تب کھلا ہے
کہ اب وہ تشنگی رکھتی نہیں میں

میں نہ سودائی ہوں نہ آئینہ
پھر یہ پتھر کدھر سے آتے ہیں

شعاع درانی

Dr. C.J. Shua'a Durrani
Shua'a Clinic
Near Hamid Pathology
Latifabad, 7-D 71800
Hyderabad (Sindh), Pakistan

شعاع درانی حیدر

حیدر آباد

کیتھرائن جہانگیر خان درانی ان کا نام ہے اور شعاع تخلص۔ 1958ء میں فیصل آباد میں پیدا ہوئیں۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی اور ہومیو پیتھی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کئی سال سے بحیثیت ہومیو پیتھی ڈاکٹر اپنے کلینک سے وابستہ ہیں۔

شعاع مجھے بتارہی تھیں کہ پاکستان بننے سے پہلے ان کے والد محترم کا تعلق فوج سے تھا۔ پاکستان بننے کے بعد آبائی شہر سرگودھا کو بسایا اور مرتے دم تک جذبہ ءحب الوطنی سے سرشار رہے۔ شعاع کی شادی دوران تعلیم ہوگئی اور یہ پیا کے دیس شکار پور سندھ میں آن بسیں۔ سسرال والے پڑھے لکھے تھے اور شعاع کے شوہر جہانگیر خان درانی خود بھی اعلیٰ پائے کے ادیب ہیں۔ شعاع کے بھائی جاوید یاد اور بہن نسرین بھی پرورش لوح و قلم کرتے رہے ہیں۔ اب ماشاء اللہ شعاع کی بیٹیاں بھی تھوڑی بہت انگریزی شاعری کرلیتی ہیں۔ شعاع نے بی۔ اے بھی شادی کے بعد کیا اور گردش روزگار کی وجہ سے وادی ء مہران کے عظیم شہر حیدر آباد میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کی مہکتی مہکاتی شبنمی راتوں نے شعاع کی فکر کو جلا بخشی۔ یوں شعاع کا پہلا مجموعہ "ریزہ ریزہ روشنی" کے نام سے 1993ء میں شائع ہوا۔ 1997ء میں دوسرے مجموعے "حرف حرف غزل" نے شعاع کو ادبی میدان میں اعتماد بخشا۔ اب نثری نظموں کا مجموعہ "گل سرسبد" کی اشاعت کی تیاری ہے اور "دیوان شعاع" پر کام جاری ہے۔

شعاع کسی مکتب فکر سے وابستہ نہیں۔ البتہ غالب اور اقبال کے علاوہ دور حاضر کے کئی شعراء کے کلام سے متاثر ہیں۔ ان کا کلام روزنامہ جنگ' امن اور حریت کے ساتھ جریدہ

آہنگ' روپ اور سماجی لوگ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

شعاع کو اردو زبان سے بے حد محبت ہے چنانچہ وہ اس کے مستقبل سے بہت پرامید ہیں۔ ان کا کہنا ہے یہ ایک طاقت ور اور توانا زبان ہے۔ گو دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس کی عمر اتنی زیادہ نہیں مگر ایک شاعر کی طرح دوسروں کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت' وسعت اور شیرینی کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کا موثر ذریعہ بھی ہے۔ اس لئے دنیا میں تیزی سے مقبول ہو رہی ہے۔ انگریزی تسلط کے باوجود اس کا اپنا مزاج اور انداز ہے۔ اس میں خیالات کے نازک سے نازک فرق کو شاندار طریقے سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

شعاع شاعری میں نظم اور غزل دونوں کو اپنی جگہ اہم سمجھتی ہیں۔ ان کے خیال میں اگر نظم میں خیالات مربوط' جاندار اور خوبصورت پیرائے میں ادا ہوتے ہیں تو غزل اپنی شیرینی' خوبصورتی' اظہار مطلب اور حسن بیان کے لئے مشہور ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ غزل کی ابتدا حسن و عشق' گل و بلبل جیسے موضوعات سے ہوئی مگر آج کل کائنات کے مسائل بھی اس کا موضوع ہیں۔ جہاں تک بات نثری شاعری کی ہے تو میں اس کے بارے میں مثبت خیالات رکھتی ہوں اور میری اکثر شاعری نثری شاعری ہے۔ خاص طور پر آنے والا مجموعہ "گل سر سبد" تو تمام کا تمام نثری شاعری پر محیط ہے۔

دور حاضر میں ابلاغ کے موثر ترین الیکٹرانک ذرائع اور تیزی سے دوڑتی ہوئی دنیا کے ساتھ تیز رفتاری سے دوڑنے کی لگن کے علاوہ کتابوں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے ادب اور قاری کے درمیان فاصلے کو بڑھا دیا ہے اور یہ فاصلہ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے جو یقیناً" فکرمندی کی بات ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ "آپس داری" اور "تعلق داری" جسے ہم "تعلقات عامہ" (Public Relation) بھی کہہ سکتے ہیں۔ ادب ہو یا ادیب دونوں کو غیر موثر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

آخری سوال کے جواب میں شعاع نے کہا کہ "میں اس سوال کے بعض حصوں سے متفق اور بعض سے انکاری ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ ایک ادیب کی حیثیت سے خود کو دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ اور ہم خیال ہونے کے لئے ہمیں دوسری زبانوں کا ادب ضرور ہی پڑھنا چاہئے مگر اس کی تقلید یا اسے فیشن کے طور پر اپنانا بالکل غلط ہے۔ اس طرح تو ہم تخلیق کار کے بجائے نقالچی کہلائیں گے۔ دوسری دنیا کا ماحول وہاں کے معروضی حالات' وہاں کے لوگوں کے خیالات اور تکنیک سے ضروری استفادہ کرنا چاہئے مگر احساس' انداز اور اظہار ہمارے اپنے رنگ میں ضروری ہے۔ ایک اچھا تخلیق کار اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ضرور ہوتا ہے مگر اس کا حصہ نہیں بن جاتا' بس یہی چیز اسے اچھا تخلیق کار بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

بحیثیت شاعرہ شعاع کو بہت کم مگر چنیدہ مشاعروں میں کلام پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان میں پہلا کل سندھ گولڈن جوبلی مشاعرہ برائے خواتین اور کل پاکستان گولڈن جوبلی مشاعرہ، ریڈیو پاکستان حیدر آباد کا قابل ذکر ہے۔ شاعری کو سراہتے ہوئے فیشوڈیل آرٹ پروموٹرز کی جانب سے 1993ء کی حسن کارکردگی پر ایوارڈ ملا جبکہ صدف آرٹ سرکل حیدر آباد اور کوئٹہ کی جانب سے بھی انہیں 97-96ء کی بہترین شاعرہ کا ایوارڈ دیا گیا۔

عکس فن

غزل

باغ میں گزرا بچپن جس کا جگنو، تتلی کے پیچھے
آج بھی وہ ظالم ہے بھونرا، جگنو، تتلی کے پیچھے

بچہ بن کر جھونک رہا ہے دھول جو سب کی آنکھوں میں
کھیل رہا ہے کھیل وہ کیسا، جگنو، تتلی کے پیچھے

اپنے ورق دل پر ہم نے اشکوں سے تحریر کیا
روز و شب وہ مارا پھرتا جگنو، تتلی کے پیچھے

ماضی اپنا یاد آتا ہے، ماضی حال سے اچھا تھا
باغ میں خوش خوش پھرتا رہتا جگنو، تتلی کے پیچھے

ایک چکوری چاند کی جانب بڑھتی ہے بے چینی سے
اور چکوری کا ہے چندا جگنو، تتلی کے پیچھے

ناگ کی صورت گھور اندھیرا چاروں اور سمایا ہے
کب تک آخر ساتھ رہے گا جگنو، تتلی کے پیچھے

آج شعاع اپنے عصیاں پر ہوتا ہے شرمند کون؟
جس کو دیکھو ہے دیوانہ جگنو، تتلی کے پیچھے

انور شعور

Anwar Shaoor
Subrang, Press Chambers
Chundrigar Road
Karachi, Pakistan

انور شعور

کراچی

نامور اور معتبر شاعر قمر جمیل انور شعور کی شاعری پر لکھے گئے اپنے مضمون (روزنامہ جسارت 4 جنوری 1998ء) میں لکھتے ہیں۔ "انور شعور کا طنز اس کا وہ ہتھیار ہے جو وہ قدیم اقدار کے نمائندوں کے خلاف استعمال کرتا ہے لیکن اس طنز میں سنجیدگی اور مزاح اس طرح گھلے ملے ہوئے ہیں کہ ان کو الگ الگ محسوس تو کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔"

آگے لکھتے ہیں۔ "وہ جدید آدمی ہے جو بڑے شہروں میں پیدا ہو رہا ہے' جو نسل' وطن اور رنگ پر یقین نہیں رکھتا۔ جو معاشی شعور رکھتا ہے' مذہبی شعور نہیں رکھتا جو تشبیہ اور استعارے سے زیادہ طنز' قول' محال اور استعارے سے زیادہ کام لیتا ہے۔ وہ دیکھئے جدید آدمی ہمارے شعر میں آرہا ہے یعنی انور شعور آرہا ہے۔ وہ کائنات کو Absurd سمجھتا ہے۔"

پھر قمر جمیل خواتین سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں۔ "خواتین سے گزارش ہے کہ وہ اسے خودکشی سے روکیں" لیکن قمر جمیل صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ کونسی خواتین انور شعور کو خودکشی سے روک سکتی ہیں۔ آگے لکھتے ہیں۔ "حاضرین ہمارے انور شعور سے بہت پہلے سقراط نے بھی طنزیہ انکسار سے کام لیا تھا اور ایک یونانی مفکر Diogenes تھا جو برفباری میں کھڑا اکڑ رہا تھا۔ خواتین اسے سمجھا رہی تھیں کہ وہ سائبان کے نیچے آجائے مگر وہ مانتا نہیں تھا۔ اتفاقاً" افلاطون وہاں سے گزرا اس نے یہ صورتحال دیکھی کہ خواتین اسے سمجھا رہی ہیں اور وہ سائبان میں نہیں آتا' تب افلاطون نے کہا خواتین آپ تمام لوگ یہاں سے ہٹ جائیں تو وہ خود سائبان میں آجائے گا مگر مشکل یہ ہے کہ شاعری کے اس Diogenes کے سامنے خواتین بھی نہیں ہیں۔ (شکریہ اے میرے رب ورنہ ہماری خواتین اس بے چارے

شاعر کا حشر نشر کردیتیں) اور یہ برفباری میں تنہا کھڑا ہوا ہے اور گا رہا ہے!۔

مسکرا کر دیکھ لیتے ہو مجھے
اس طرح کیا حق ادا ہو جائے گا؟

آگے قمر جمیل لکھتے ہیں کہ سچ تو یہ ہے کہ انور شعور پر تنقید کا حق ادا نہیں ہو سکتا لیکن انور شعور نے شاعری اور کاہلی دونوں کا حق ادا کردیا ہے۔ نطشے نے اس کاہلی کو جی کا جنجال بتلایا ہے۔ انور شعور نے اپنی کاہلی کا ذکر کس طرح کیا ہے۔ وہ دیدنی سے زیادہ شنیدنی ہے۔ فرماتے ہیں۔۔

تساہل ایک مشکل لفظ ہے اس لفظ کا مطلب
کتابوں میں کہاں ڈھونڈوں کسی سے پوچھ لونگا میں

انور شعور کے تساہل کا مشاہدہ اور تجربہ مجھے بھی ہوا۔ سخن ور حصہ سوم کا سوالنامہ میں نے انہیں تھمایا اور وعدہ لیا کہ وہ ہفتہ بھر میں مجھے اس کا جواب لکھ کر دیں گے۔ تین ہفتے بعد پتہ چلا سوالنامہ کھو گیا۔ میں نے فون پر سوالات لکھوا دیئے۔ دو ہفتے بعد پتہ چلا وہ بھی کھو گئے۔ میں نے تیسری بار شکیل عادل زادہ کو سوالنامہ بھجوا دیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب نہیں کھوئے گا چنانچہ انور شعور کا جواب آگیا مگر ہر سوال کا جواب ایک ایک سطر میں۔ میں جواب پڑھ کر بہت جھلائی۔ اتنی کنجوسی کے جوابات سے تو انور شعور صرف ایک صفحہ میں سمٹ کر رہ جاتے۔ میں سوچتی رہی اور دکھی ہوتی رہی۔ تب میں نے انور شعور پر لکھا قمر جمیل کا مضمون توجہ سے پڑھا لیکن اس گرہ کو کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکی کہ انور شعور نے خود کو اس طرح ضائع کیوں کیا ہے؟ محض اس لئے کہ حالات ناساز گار رہے یا اس لئے کہ معاشرہ کرپٹ ہے مگر ہم سب اسی کرپٹ معاشرے اور ناساز گار حالات میں ہی پنپ رہے ہیں۔

انور شعور کتنا باشعور کتنا حساس شاعر ہے۔ یہ کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ وہ بھی نہیں جانتے جو اس کے احباب میں شمار ہوتے ہیں اور وہ بھی نہیں جو اس کے مداح ہیں ورنہ وہ اسے یوں ضائع نہ ہونے دیتے۔ اس شاعر کو تو بہت نمایاں ہونا چاہئے تھا جو پکار پکار کر کہتا ہے۔۔

کیا ہے گردشوں سے تنگ آکر فیصلہ میں نے
کہ محنت کے علاوہ چاپلوسی بھی کروں گا میں

مگر انور شعور میں چاپلوسی کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ بہت سادہ لوح ہے وہ اور بہت زیادہ سادہ لوح کیا کہلاتے ہیں؟ شعور کے دو مجموعہ کلام شائع ہوگئے۔ یہ بھی اس کے دوستوں کی محبت کا نتیجہ ہے۔ پہلا اندوختہ 1995ء میں دوسرا مشق سخن 1997ء میں۔ میں انور شعور کو

بہت نہیں جانتی مگر جتنا جانتی ہوں' اس پس منظر میں کہہ سکتی ہوں کہ اسے شکیل عادل زادہ جیسے چند اور ساتھی بہت پہلے مل جاتے تو آج وہ اور زیادہ باشعور ہوتے۔

مارچ 1965ء میں پی آئی اے کے قاہرہ جانے والے جہاز کی تباہی کے المیے میں جدا ہوجانے والے اپنے بہت سے پیاروں کے لئے میں نے جو کالم لکھا اسے انور شعور کے اس شعر پر ختم کیا تھا۔

ہم تم کو روتے ہی نہ رہتے اے مرنے والو
مر کے اگر پاسکتے تم کو' مرجاتے ہم بھی

اسی انور شعور کو آج میں آپ سے بھی متعارف کرا رہی ہوں۔

11/ اپریل 1943ء کو سی پی ہندوستان کے ایک شہر سیونی میں پیدا ہونے والے بچے کا نام والدین نے انور حسین خاں رکھا' جس کا اب تخلص انور شعور ہے۔ شعور نے نہیں بتایا کہ انہوں نے تعلیم کہاں حاصل کی۔ انجمن ترقی اردو اور اخبار جہاں کے بعد "سب رنگ" ڈائجسٹ سے وابستہ ہوئے اور اب سب رنگ المعروف شکیل عادل زادہ کے ساتھ ہیں۔ غزل کو صنف سخن میں اظہار کا بہتر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کسی ایک خاص مکتب فکر سے متاثر نہیں۔ فنون اور دیگر ادبی رسائل میں ان کا کلام ان کے قارئین پڑھتے رہتے ہیں۔ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ نثری نظم کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ شعریت کے لئے وزن ضروری نہیں۔ یہ نثر میں بھی ممکن ہے۔ تخلیق کے لئے تنہائی کو معاون سمجھتے ہیں۔ ہاں تربیت کے لئے مشاعروں اور نشستوں کو مفید سمجھتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ادب اگر واقعی ادب ہے تو قاری سے کبھی نہیں کٹتا' نہ بے اثر ہوتا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق اچھی چیز ہر جگہ سے لینا چاہئے۔ حسیت تو بہرحال اپنی ہی ہوتی ہے۔

انور شعور سے الوداعی مصافحہ سے پہلے ان کے دو شعر پڑھ لیں۔۔۔

گزارے ہیں ہزاروں سال ہم نے
اسی دوچار دن کی زندگی میں

اک نظر میں نظر نہیں آتا
سادگی میں چھپا ہوا ہے وہ

عکسِ فن

غزل

اثر بڑے سے بڑا واقعہ نہیں کرتا
گلی میں کوئی دریچہ بھی وا نہیں کرتا

کھڑے کھڑے مجھے باہر نکال دیتا ہے
وہ اپنے گھر میں تکلف ذرا نہیں کرتا

کھلا ہوا نہ ملے در تو لوٹ آتا ہوں
میں دستکیں نہیں دیتا، صدا نہیں کرتا

وہ اپنے آپ چلا آئے تو سر آنکھوں پر
فقیر گوشہ نشیں سلسلہ نہیں کرتا

بھلا سکے نہ جسے ہم کبھی، خدا جانے
ہمیں وہ یاد بھی کرتا ہے یا نہیں کرتا

شعور آپ کو خود پر یقین ہی تو نہیں
یقین ہو تو بھلا کوئی کیا نہیں کرتا

انقلابِ نو کی اک تازہ خبر لائیں گے ہم
جب حصارِ ذات سے باہر نکل آئیں گے ہم

سید شمس وارثی
۶ر جنوری ۱۹۹۸ء

Syed Shams warisi
B-131, Block-11, F.B. Area
Karachi, Pakistan

سید شمس وارثی
کراچی

اساتذہ ایک طالب علم کی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اتنا بڑا کہ طالب علم اپنے اساتذہ کا روپ دھار کر ایک پورے معاشرے کی تصویر بدل دیتے ہیں۔

ایسا ہی ایک واقعہ سید شمس وارثی کی زندگی میں بھی رونما ہوا۔ اس واقعے نے بہت سے طالب علموں کو زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا ہوگا مگر یہ واقعہ شمس وارثی کی زندگی کا بھی نا قابل فراموش واقعہ بن گیا۔

کہتے ہیں۔۔۔۔ "اسلامیہ کالج لکھنؤ کی جانب سے ایک تمثیلی مشاعرہ "دہلی کی آخری شمع" کانپور میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ میں اس میں بحیثیت استاد ذوق شریک تھا۔ مشاعرہ کے اختتام کے بعد میں اور میرے ساتھی قیام گاہ پر واپس آئے تو ہمارے پرنسپل بھی ہمارے ساتھ موجود تھے۔ رات کافی گزر چکی تھی سب سونے کی تیاریاں کرنے لگے اور کمرے کی بتی بھی گل کردی گئی۔ کمرے میں اندھیرا چھاتے ہی لڑکوں نے مختلف جانوروں کی بولیاں بولنا شروع کردیں اور اب کمرے میں ہر طرح سے بلی، کتے اور بندر کی آوازیں آرہی تھیں، جب شور نا قابل حد تک بڑھ گیا تو ہمارے پرنسپل صاحب کہنے لگے۔۔۔ "بڑے افسوس کی بات ہے، میں تو لکھنؤ سے تمہیں انسان بنا کر لایا تھا مگر تم سب کانپور آتے ہی جانور بن گئے۔ اب میں تمہارے والدین کو کیا جواب دوں گا۔" پرنسپل صاحب کی اس بات کا بہت اثر ہوا اور پھر سب اس طرح خاموش ہوگئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ پرنسپل صاحب کا یہ پر اثر اور دل چسپ انداز آج تک میرے ذہن میں موجود ہو کر میرے لئے نا قابل فراموش ہے۔"

وارثی صاحب اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ انہوں نے ابتدائی

تعلیم سینٹ جوزف اسکول لکھنؤ میں حاصل کی لیکن کبھی اسکول کا یونی فارم نہیں پہنا۔ ان کے والد کو پسند نہ تھا۔ وہ خالصتاً مشرقی ماحول کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسکول سے اپنے بیٹے کے لئے خصوصی اجازت لی اور یوں صاحبزادے شیروانی پاجامہ پہن کر اسکول جانے لگے۔

والدین نے ان کا نام سید شمس الحسن وارثی رکھا۔ انہوں نے تخلص شمس وارثی اپنایا۔ یکم جولائی 1936ء کو قصبہ کھولی ضلع بارہ بنکی یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ امیرالدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ سے ساڑھے چودہ سال کی عمر میں اردو میں امتیازی نمبر لے کر اول درجہ میں کامیاب ہوئے۔ بارہویں جماعت (کامرس) کے طالب علم تھے کہ پاکستان آ گئے۔ یہاں کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر 17 سال کی عمر میں ملازمت کا آغاز کیا اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن ناسازگار حالات کے باوجود علم کے حصول کی لگن کم نہ ہوئی اور ملازمت کے دوران ہی انہوں نے جامعہ کراچی سے ایم۔ اے اور جامعہ پنجاب سے ادیب فاضل کے امتحانات کامیابی سے دیئے۔ تقریباً دس بارہ سال تک مختلف تعلیمی اداروں سے منسلک رہے۔ اس درمیان کئی تعلیمی ادارے قائم کئے۔ صحافت سے بھی تعلق رہا لیکن ان کی افتاد طبع نے صحافت کو پسند نہیں کیا چنانچہ نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازمت اختیار کی اور 29 سال گزارنے کے بعد بینک سے باعزت طور پر سبکدوش ہو گئے لیکن "بزم ادب نیشنل بینک آف پاکستان رجسٹرڈ" جو بینک کے ایگزیکٹوز اور افسران کی واحد نمائندہ ادبی تنظیم ہے اس کے تاحیات سیکریٹری جنرل ہونے کی حیثیت سے نیشنل بینک سے ان کا تعلق قائم و دائم ہے۔

شمس وارثی یوپی کے ایک معزز سید گھرانے کے فرد ہیں۔ ان کے والد سید فخرالحسن وارثی مرحوم کا شمار ضلع بارہ بنکی کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا جو متحدہ ہندوستان میں مقامی مسلم لیگ کے صدر تھے مرحوم قصبہ کھولی کے متمول اشخاص میں خاصی اہمیت رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے لکھنؤ جا کر تعلیم حاصل کی، جہاں تعلیمی اخراجات خاصے تھے کیونکہ سینٹ جوزف جیسے مشنری اسکول میں داخلہ لینا کچھ آسان نہیں تھا۔ ان کے والد محترم کو بھی ایسی کوئی پریشانی نہیں تھی کہ وہ ہندوستان میں رہ کر بقیہ زندگی نہ گزار سکتے مگر ان کے دو بڑے بھائیوں کی پاکستان میں آمد کے بعد اور پاکستان کی محبت میں انہیں بھی ترک وطن کرنا پڑا۔

انہوں نے شاعری کے علاوہ ادب کے جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ شمس نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی، جہاں مذہبی اور اخلاقی اقدار زندہ و تابندہ تھیں اور ان کے اردگرد کا ماحول بھی دینی تھا، لہٰذا ان کی بیشتر شاعری اسلامی مکتبۂ فکر سے متاثر ہے۔ ویسے انہوں نے دوسرے مکاتیب فکر سے تعمیری پہلوؤں کو بھی سامنے رکھا ہے۔ وارثی صاحب کا

کلام ملک اور بیرون ملک سے شائع ہونے والے جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے' جن میں ماہنامہ ساقی' ماہ نو' نقش' بیسویں صدی' روزنامہ جنگ کراچی اور قومی آواز لکھنؤ قابل ذکر ہیں۔ دو شعری مجموعے حرف و نوا' حرف معتبر کے علاوہ طیبہ کے جانے والے (نعتیہ کلام) گلہائے وارث (منظوم تذکرہ) اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سوانح حیات ان کی تخلیقات میں شامل ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے بہت سی نظمیں' گیت' خاکے' منظوم خاکے' مشاعرے' بیت بازیاں اور کہانیاں ریڈیو کے لئے اور بڑوں کے لئے بھی بہت سے خاکے اور مضامین بھی تحریر کئے ہیں۔

اردو کے حوالے سے کہتے ہیں..... "بجا طور پر اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے۔ میں ذاتی طور پر اس کے تابناک مستقبل کے لئے پر امید ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اردو پوری دنیا میں جس طرح سے متعارف ہو رہی ہے' وہ اس کی مقبولیت اور شاندار مستقبل کی ضمانت ہے۔" پہلے شاعری کے لئے غزل گوئی کو اظہار خیال کے لئے بہتر سمجھتے تھے لیکن حج کی سعادت بعد صرف نعت گوئی کی صنف کو اظہار خیال کے لئے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ نثری نظم کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ چند بیمار اور پسماندہ ذہنوں کی اختراع ہے۔ اس پر تفصیلاً اظہار خیال کرنے کو بھی تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں آج کے مشاعرے ادب کی تخلیق میں قطعاً معاون نہیں ہیں خصوصاً عالمی مشاعرے تو ورائٹی پروگرام بن کر رہ گئے ہیں۔ البتہ مخصوص اور مختصر شعری اور تخلیقی نشستیں ادب کے فروغ میں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

اگلے سوال کے جواب میں وارثی صاحب نے کہا یہ حقیقت ہے دور حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے اور قاری سے اس کا رشتہ کمزور ہی نہیں بہت کمزور ہو گیا ہے۔ چنانچہ ادب کا قاری آج کے ادب کے مطالعہ سے کوئی اثر قبول نہیں کرتا اور وہ ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے۔

سلسلہء کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا..... "میں مستند ادیبوں کی اس رائے سے متفق ہوں کہ ہم مغرب کے رجحانات اور اس کے ادب کی تقلید کرکے وہاں کے ادبی فیشن اپنے ملک میں درآمد کر رہے ہیں جو ایک غیر فطری اور نامناسب عمل ہے۔ اس لئے کہ ہمارے مسائل حسیت اور احساس و شعور ان سے بالکل مختلف ہیں' لہٰذا بیرونی فیشن کی پیروی کرنے سے اچھا ادب تخلیق نہیں ہوتا' البتہ مغرب کی تکنیک سیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔"

واقف ہوا جو منزل عرفان ذات سے
وہ کرب آگہی کے تصور سے مرگیا

عکس فن

غزل

کسی سے کوئی نہ شکوہ نہ کچھ گلہ رکھئے
دراز اپنی محبت کا سلسلہ رکھئے

فراق و ہجر کی منزل وصال یار نہیں
کہ قربتوں میں بھی لازم ہے فاصلہ رکھئے

جو بات دل کی ہو محدود وہ رہے دل تک
نظر سے صرف نظر کا معاملہ رکھئے

یہ خوف ہے کہ نہ کھل جائے دوستی کا بھرم
حضور دوست کوئی بھی نہ مسئلہ رکھئے

جہاں پہ ہوش و خرد ساتھ چھوڑ دیتے ہیں
تصورات میں اپنے وہ مرحلہ رکھئے

غلط ہے آپ ہر اک کارواں میں شامل ہوں
نظر میں شہرت سالار قافلہ رکھئے

ملے گا آج وہ اے شمس پھر سر محفل
پھر اس سے مل کے بچھڑنے کا حوصلہ رکھئے

زندگی اک پھول ہے، پر موت ہے سو پتیاں
ایک وحدت کب بکھر جائے پتا کوئی نہیں

عبدالعلی شوکت

Syed Abdul Ali Shaukat
4- Manuher Street,
Sham Nagar , Chaubergi
Lahore, Pakistan

عبدالعلی شوکت

لاہور

عبدالعلی شوکت کی غزلوں میں کلاسیکی طرز احساس بھی ہے اور جدید انداز فکر بھی۔ ان کے کلام میں زندگی رواں دواں دکھائی دیتی ہے۔ وہ نثر نگار کی حیثیت سے بھی اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ ادبی کتب پر تبصرہ اور تنقید بھی لکھتے رہے ہیں جو لاہور کے ماہنامہ ''ماہ نو اور تخلیق'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی انگریزی سوانح عمری ''مشرق کی بیٹی'' کے نام سے ترجمہ عبدالعلی شوکت نے ہی کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

خورد بینوں سے نہ جانچو دوستوں کی دوستی
دوست چھٹ جائیں گے، تو تنہا کھڑا رہ جائے گا

یہ شعر ان کی ذات کا مکمل اظہار ہے۔ انہوں نے گرد و پیش کے مسائل سے بھی آنکھیں نہیں موندیں، کہتے ہیں۔

گرے گی چپ پہ تمہاری ستم زدہ لوگو
وہ برق جو ابھی مستور آسماں میں ہے

میں نے ان سے کہا۔ اپنے بارے میں کچھ بتایئے تاکہ ''سخن ور سوم'' کے قارئین آپ سے تفصیلی ملاقات کر سکیں۔ شوکت علی بولے۔

''میری تاریخ پیدائش 31 مارچ 1923ء ہے اور جائے پیدائش جالندھر شہر ہے۔ اسکول میں رجسٹرڈ نام محمد عبدالعلی تھا اور گھر میں علی برادران کی نسبت سے شوکت علی پکارا کرتے

تھے۔ آٹھویں جماعت میں شعر و شاعری سے شغف پیدا ہوا تو دونوں ناموں کو ملا کر عبدالعلی شوکت کو اپنی پہچان بنالیا۔ بی اے تک تعلیم کالج سے حاصل کی' بعد میں ملازمت کے دوران ایم اے (فلسفہ) کیا۔ ملازمت کا آغاز دہلی کی ایک عسکری یونٹ انڈین ابزور کور میں سویلین ٹیچر کے طور پر کیا۔ قیام پاکستان سے قبل روزنامہ "آزاد" لاہور میں نیوز ایڈیٹر عرصہ ایک سال تک رہا۔ بعد ازاں روزنامہ "المجاز" میں چھ ماہ تک چیف ایڈیٹر رہا۔ وسط 1948ء میں پاک فضائیہ کے شعبہء تعلیم سے منسلک ہوگیا۔ 1959 سے 1975ء تک انٹر سروسز سلیکشن بورڈ کوہاٹ میں بطور ماہر نفسیات متعین ہوگیا۔ سعودی عرب کی فضائیہ میں ڈیپوٹیشن پر تین سال گزارے۔ پھر پاک فضائیہ کے بھرتی کے دفتر لاہور سے 1984ء کے اوائل میں ملازمت سے سبکدوش ہوگیا۔ آج کل روزنامہ مساوات لاہور میں جنرل مینجر کے عہدہ پر متعین ہوں۔ لڑکپن سے ترقی پسند تحریک سے متاثر رہا ہوں۔ علامہ اقبال' جوش ملیح آبادی' فیض احمد فیض' مجاز لکھنوی' احمد ندیم قاسمی اور الطاف مشہدی کے کلام کو ہمیشہ پسند کیا۔ کوشش ہمیشہ کی کہ اپنے رویے معتدل اور متوازن رہیں۔ میری غزلوں میں جبر' گھٹن اور آمریت کے خلاف تلازمے بکثرت ملیں گے۔ میرا پہلا مجموعہء کلام "لرزاں ساعتیں" کے نام سے 1991ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس مجموعہ میں غزلیں اور ادبی نظمیں شامل تھیں۔ دوسرا مجموعہ "نور یقین" کے نام سے زیر طبع ہے۔ اس میں حمد' نعتیں' ملی نغمے' عسکری نظمیں اور قیام پاکستان سے قبل آزادیء ہند کی نسبت سے نظمیں شامل ہیں۔

شوکت کو جن لوگوں کی خطابت نے متاثر کیا ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری' آغا شورش کاشمیری' قاری محمد طیب اور مولانا حفظ الرحمان سوہاروی کے نام نمایاں ہیں۔ کہتے ہیں۔ قائداعظمؒ کی تقریر 1942ء میں مسلم اسٹوڈنٹس کے ایک جلسہ منعقدہ جالندھر سے بہت متاثر ہوا۔ ان کا انگریزی لہجہ نہایت دلکش اور دلپذیر تھا۔ ادبی سمت میں احسان دانش کاندھلوی' حفیظ جالندھری' جوش ملیح آبادی' احمد فراز' محسن احسان' احمد ندیم قاسمی اور جمیل الدین عالی سے متاثر ہیں۔ مظفر علی سید ان کے ساتھ پاک فضائیہ میں ہم نشیں رہے۔ ان کے وسیع مطالعہ اور حوالہ جات نے بہت متاثر کیا۔ تنقید میں ان کا نام ادبی شان بڑھاتا ہے۔

عبدالعلی شوکت اردو کے مستقبل سے پرامید ہیں' ان کا کہنا ہے کہ مشرق و مغرب میں ہر جگہ اردو مقبول ہے اور جب سے پاکستانی اور ہندوستانی ادباء اور شعراء امریکہ' کینیڈا' یورپ' متحدہ عرب امارات اور اسی طرح مشرق بعید کے ممالک میں جانے لگے ہیں۔ اردو کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے۔

شوکت غزل کو شاعری کا جھومر کہتے ہیں۔ نظم میں معرا اور آزاد نظم کو اچھا سمجھتے ہیں مگر نثری نظم سے متفق نہیں۔ نظم میں بحر اور اوزان سے بالکل لاتعلق ہوجانا انہیں گوارا نہیں۔

ان کا خیال ہے کہ مشاعرے ادب کی تخلیق میں معاون ہیں مگر تخلیقی نشستیں یعنی حلقہ ء ارباب ذوق ایسی انجمنیں ادب کی تخلیق میں بہتر کردار ادا کر رہی ہیں۔ رائٹرز گلڈ اور اکیڈمی ادبیات کو اپنی تخلیقی حیثیت منوانے کے لئے بھرپور سعی کرنی چاہیے۔
ہمارے اگلے سوال کے جواب میں شوکت کہتے ہیں کہ دور حاضر کا ادیب زندگی کو قریب سے دیکھنے کا خواہاں ہے۔ اپنے داخل سے متاثر ہو کر لکھتا ہے مگر خارج سے لاتعلق نہیں ہوتا۔ ادب برائے زندگی کا نعرہ اب بھی اسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ موضوعی علامتوں کا سہارا لینے کے باوجود معروضی حقائق سے صرف نظر نہیں کرتا۔ آج کے ادب کی اثر آفرینیوں سے انکار حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ اسی طرح مغرب کے ادب کا مطالعہ ممنوعہ شے تو نہیں۔ اچھی شاعری، اچھی کہانی اور اچھے خیالات جہاں سے بھی ملیں اپنانے چاہئیں۔ انہیں اپنے اندر جذب ہونے دیجئے اور پھر اپنے ماحول کی مناسبت سے اپنے مسائل کو اپنے احساس وشعور کے مطابق تخلیقی لباس پہنایئے یقیناً" نتائج خوش کن مرتب ہوں گے۔
ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

عکس فن

غزل

نیند میں موروں کے پر چنتا رہا ہوں دیر تک
خواب کے رنگوں میں الجھایا گیا ہوں دیر تک

سنبل و ریحاں کی خوشبو پھیلنے دو کو بکو
دامن امید مہکاتا رہا ہوں دیر تک

کیسے جنگل کی کھلی مہکی فضاؤں میں اڑوں
زیر دیوار قفس پھولا پھلا ہوں دیر تک

درد کی اندھی ہوائیں چیختی ہیں ہر طرف
دل کے دروازے کو جب بھی کھولتا ہوں ہر طرف

سوئے دریا، دشت پیما پیاس کے مارے چلے
میں بھی "ان صحراؤں میں" شوکت جلا ہوں دیر تک

میں اپنے آپ کو کچھ سمجھ رہا ہوں
اک سانپ سا آستیں میں پل رہا ہے

شہاب کاظمی دہلوی
۱ر نومبر سنہ ۹۷

Shahab Kazmi
90 1st Ave.Port Reading.
NJ 07064
U.S.A

شہاب کاظمی

نیو جرسی

میں "سخن ور حصہ سوم" کا سوالنامہ جب مرتب کر رہی تھی، اس وقت میرے ذہن میں اردو زبان کے مستقبل سے متعلق ایک سوال شامل کرنے کا خیال ابھرا۔ سخن ور حصہ دوم کے سوالنامے میں بھی اسی موضوع پر ایک سوال تھا۔ حصہ سوم کے سوالنامہ میں، میں نے لکھا کہ اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے۔ میری فائل میں اس کے متعلق ایک تفصیلی مضمون موجود ہے اور اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق انگریزی، چینی اور فرانسیسی زبان کے بعد اردو کا نمبر آتا ہے۔ پھر 1997ء کے مارچ میں، میں نے پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم خلیل اللہ کا مضمون پڑھا، جس میں انہوں نے اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے حوالے سے انگریزی اور فرانسیسی کے بعد اردو کو دنیا کی تیسری بڑی زبان لکھا ہے۔ نیو جرسی امریکہ کے معروف شاعر محترم شہاب کاظمی بھی اردو کو تیسری بڑی زبان کہتے ہیں۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ مینڈرین چائنیز اور انگریزی زبان کے بعد اردو کا نمبر آتا ہے۔ اس ضمن میں، میں مزید رجوع کروں گی اور ان اہل زبان صاحبان سے معلومات حاصل کروں گی، جن کی معلومات اس موضوع سے متعلق مستند ہیں۔ یہاں میں آپ کو شاعر شہاب کاظمی سے متعارف کرادوں، جنہوں نے جامعہ کراچی سے اردو ادب میں ایم اے کیا ہے۔ نام ان کا سید سخاوت احمد کاظمی ہے اور تخلص شہاب کاظمی۔ جائے پیدائش لکھنؤ یوپی ہندوستان ہے اور تاریخ پیدائش 17/ فروری 1942ء ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتوں میں سعودی عرب، شام، اردن، مصر، ترکی، لیبیا، دبئی اور ہندوستان کی سیاحت کی ہے۔ سینئر کلاس ون سے گزیٹیڈ عہدوں تک پہنچے ہیں۔ انگریزی زبان کے استاد بھی رہ چکے ہیں۔ دنیا گھوم کر اب نیویارک کے نیویارک سٹی ہاؤسنگ ڈیولپمنٹ کارپوریشن

میں سرگرم عمل ہیں۔

شہاب کاظمی کو شاعری کے ساتھ تنقیدی مضامین' مقالے' انشائیے' افسانے اور سوانح لکھنے اور پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ ہر مکتبہء فکر کا صحت مندانہ تاثر قبول کیا ہے مگر اپنا ایک الگ اسلوب قائم کرنے کی کوشش دانستہ جاری رکھی ہوئی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہیں۔ فرماتے ہیں۔۔۔

زباں سلیس تو الفاظ سادہ رکھتے ہیں
انیس سے شرف استفادہ رکھتے ہیں

کھڑے ضرور ہیں صف میں امام کے پیچھے
مگر نماز کی نیت خرادی رکھتے ہیں

شہاب کاظمی کے کلام کا مجموعہ "ترے تیر نیم کش کو" کے عنوان سے 1990ء میں شائع ہوچکا ہے۔ "زر خالص" کے عنوان سے شمالی امریکہ کے نعت گو شعراء کا طرحی اور غیر طرحی کلام امریکہ کی "مسلم فاؤنڈیشن" کے لئے تالیف کیا۔ سات مرثیوں پر مشتمل ایک کتاب کے علاوہ نعت' سلام اور قصائد کی ایک کتاب (زر خوش عیار) اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ بعنوان "یہ خلش کہاں سے ہوتی" زیر ترتیب ہیں۔ ہفت روزہ عوام (نیویارک) کے لئے "انشائیہ" کافی مدت تک لکھے۔ اب علالت کی وجہ سے سلسلہ بند ہے۔ شہاب امریکہ کی "انیس اکیڈمی آف اورینٹل لرننگ" کے بانی بھی ہیں۔

شہاب کہتے ہیں کہ "جو چیزیں ضرورت کے تحت وجود میں آتی ہیں' وہ جب تک مطلوبہ ضرورت پوری کرتی ہیں' ان کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ اردو زبان بھی انگریزی کی طرح نظریہ ء ضرورت کے تحت وجود میں آئی ہے۔ اس زبان سے آج بھی لاکھوں انسانوں کی معیشت اور مشاغل وابستہ ہیں۔ پھر یہ مشاغل اور ضرورتیں آئے دن ترقی پذیر ہیں۔ اس لئے بھی یہ زبان خطروں کی زد پر نہیں۔ حد یہ کہ بہت سے مغرب گزیدہ اور احساس کمتری کے شکار والدین کے نفرت اور تحقیر آمیز رویے کا شکار ہونے کے باوجود یہ زبان پروان چڑھ رہی ہے تو پھر ہماری اس کے کامیاب مستقبل سے مایوسی بے معنی ہے۔"

صنف شاعری میں شہاب کاظمی غزل کو اظہار خیال کے لئے بہتر اور موثر ذریعہ سمجھتے ہیں کیونکہ غزل وہ واحد صنف ہے' جس میں صرف دو مصرعوں میں وسیع تر معانی کو سمویا جاسکتا ہے۔ پھر بھی شاعر کی اپنی بصیرت اور موقع شناسی کی بات ہے۔ کہتے ہیں تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کی تعمیر میں جو کام نظم نے کیا' وہ غزل نہیں کرسکی۔ شاہنامہ فردوسی' میر انیس کے مرثیے' حالی کی مدو جزر اسلام' حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام' رامائن' مہابھارت اور اقبال

کا سارا کلام سامنے رکھ لیں تو اس بات کی تردید آسان نہ ہوگی۔ نثری نظم کے سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

شعر کو نثر اگر کہہ نہیں سکتے ہیں شہاب
نثر کو شاعری کیسے کہا جاسکتا ہے

شہاب اس بات سے متفق ہیں کہ تخلیقی نشستیں گو کہ آٹے میں نمک کا درجہ رکھتی ہیں پھر بھی تخلیق کاروں کی تربیت گاہ کا کام دیتی ہیں اور باوجود اس کے کہ مشاعرے اب شعراء اور بانیان مشاعرہ کے معاشی مسائل کے بڑی حد تک کفیل ہیں کل بھی اردو ادب کی ترویج کا باعث تھے اور اب بھی ہیں۔ اگر ہم اردو ادب کی ارتقا کا تاریخی جائزہ لیں تو صاف ظاہر ہے کہ ادب کی ترویج میں معیشت کا غیر مرئی دخل رہا ہے۔ دلی اجڑی تو لکھنؤ آباد ہوا۔ لکھنؤ کی روشنی ماند ہوئی تو حیدر آباد کی رونقیں دوبالا ہوئیں۔ اردو کے شیدائی سلامت رہیں یہ چراغ جلتے ہی رہیں گے۔

شہاب کاظمی کا کہنا ہے کہ دور حاضر ہو یا گذشتہ......... ادب کا تعلق عمل سے کبھی نہیں رہا۔ بڑھتی ہوئی معاشی مصروفیات اور لہو ولعب کی دیگر دلچسپیوں میں اضافے کے سبب اس کا رشتہ بے شک قارئین سے کمزور پڑگیا ہے لیکن آج بھی سلجھے ہوئے اور سلیم الطبع لوگ سوتے وقت شاعری کے نرم پروں کا تکیہ ہی پسند کرتے ہیں۔ الجبرا یا سائنس کی کتاب نہیں۔

شہاب کہتے ہیں ''مغربی شعری ادب سے ہمارے ہاں کوئی تیکنیک ابھی تک تو قبول عام کا درجہ نہیں پاسکی اور نہ ہی ہمارے مزاج اور ہماری معاشرت میں اس کے لئے کوئی جگہ ہے نہ ضرورت۔ یہ محض ہمارا احساس کمتری ہے کہ ہم اور میدانوں کی طرح ادب میں بھی ان کی تیکنیک کو خود پر تھوپ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ مغربی عریانیت اور جنسی بے راہ روی کو ہمارا معاشرہ ''ریختی'' کے روپ میں کب کا دھتکار چکا ہے۔ ہاں اگر تنقید کو ادب میں شامل کرکے یہ بات کہی جائے تو یقیناً'' لائق ستائش ہوگی کہ ہم اس تیکنیک کو اپنے ہاں درآمد کریں اور تراش خراش کرا کے اپنے قابل بنالیں ورنہ مغرب زدہ نقاد جناب حکیم الدین احمد جیسے نقاد پیدا ہو کر (جو میر تقی میر کو ان کے بہت سے اشعار پر جوتے لگائے جانے کی بات کرتے ہیں) اور جانے کتنے لوگوں کے لئے ایسی نازیبا سفارشات مرتب کریں۔''

عکس فن

غزل

شہاب کاظمی

ہمارے شعر کی شہرت کا باعث بن گیا آخر
کسی کے نام کی نسبت سے کچھ تحریر ہو جانا

یہ حسن ظن ہمیں بھی تھا شباب آنے تک لیکن
کہ ہیں باتیں ہی باتیں زلف کا زنجیر ہو جانا

کھلا یہ جب نہ مضمون تبسم بندھ سکا ہم سے
شعاع مہر کا ممکن نہیں زنجیر ہو جانا

نہیں تھا چور اگر دل میں تو پھر بتلائیے کیا تھا
ہمارا دیکھنا اور آپ کا تصویر ہو جانا

شہاب اپنا تشخص ہے جدا منظور دل ورنہ
بڑا اعزاز ہے اس شاعری میں میر ہو جانا

"ریڈی ایشن"
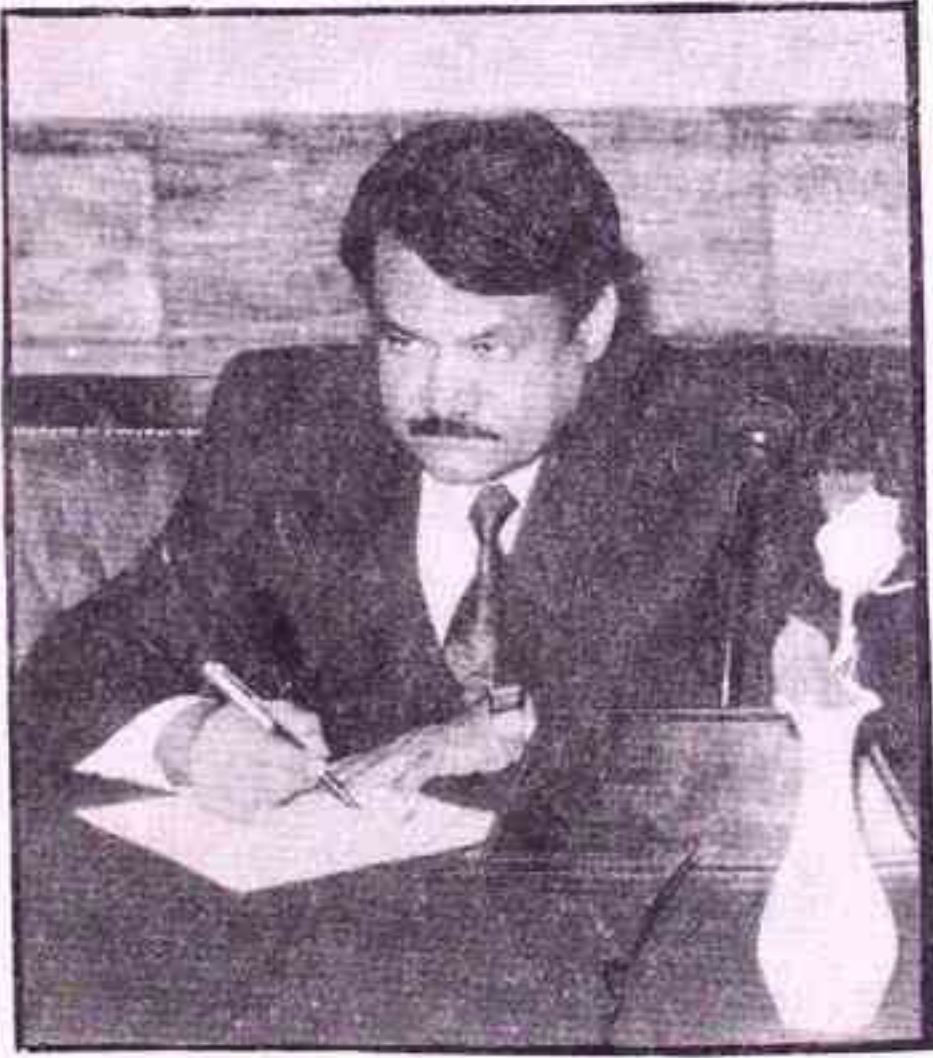
وہ چپ چپ تھی
میں بھی چپ تھا
لیکن آنکھوں کی سرگوشی سے سناٹا گونج رہا تھا

۱۱ر فروری ۱۹۹۸ء

M. Subuktagin Saba
B-1, C.E & S.T. Officers Colony,
Block-11, Gulshan-e-Iqbal
Karachi, Pakistan

محمد سبکتگین صبا
کراچی

میں کام سے کبھی نہیں تھکتی۔ مشقت چاہے جسمانی ہو یا ذہنی۔ اور پھر لکھنے پڑھنے کے کام نے تو میرے جذبوں کو ہمیشہ سرشار رکھا لیکن یہی جذبے جب دوسروں کی بے توجہی اور کاہلی (جسے عرف عام میں مصروفیت کا نام دیا جاتا ہے) سے مجروح ہوں تو پھر قلم ہاتھ میں ہو تو بھی لفظ ناراض ہو جاتے ہیں اور حرف منہ چڑانے لگتے ہیں۔

ایسا ہی 13 فروری 1998ء کے دن بھی ہوا۔ سخن ور حصہ سوم کے لئے شعراء و شاعرات کی مقررہ تعداد سے گنتی تجاوز کر چکی تھی اور صفحات بڑھ گئے تھے۔ ایک مشورہ یہ ملا کہ میں شعراء و شاعرات کی تعداد کم کروں مگر جو تعارف مل چکے تھے' اب انہیں شامل نہ کرنا دوسروں کی دل آزاری اور توہین کے مترادف ہوتا۔ پھر یوں ہوا کہ جو لکھا گیا ہے' انہیں کاٹ پیٹ کر مختصر کردوں مگر دل اس پر بھی راضی نہ تھا کہ جنہوں نے بڑی محنت' لگن اور پیار سے میرے بھیجے ہوئے سوالوں کا جواب دیا ہے' انہیں کاٹ پیٹ کر ان کو نچوڑ دوں؟ تب میں نے اخراجات پر قابو پانے کے لئے سوچا ایک دو در کھٹکھٹا لئے جائیں۔ دو اشتہارات اور لے لئے جائیں۔

ہمت کر کے صبح ہی گھر سے نکل گئی۔ اسی وقت میں' ایک شاعر کا تعارف بھی ان کے پاس سے لینا تھا۔ سوالنامہ انہیں ڈیڑھ ماہ قبل دے دیا تھا۔ وہ مصروفیت کی وجہ سے آج کل پر ٹال رہے تھے۔ پھر 13 فروری کے دن کا وعدہ کیا۔ میں چاہتی تو کہہ دیتی کہ بھجوا دیں مگر میری طبیعت کی انکساری نے کہا کہ ادھر ہی کو جانا ہے' میں خود لے لوں۔ سوا گیارہ بجے راہ سے ایک فون تلاش کر کے انہیں اطلاع دینا چاہی کہ میں آرہی ہوں تو ان کے پی اے نے کہا وہ

راہیں خود تراشتا ہے، لہٰذا گرد و پیش کے مشاہدات اور تجربات سے جو محسوس کرتے ہیں، اسے اشعار کا جامہ پہنا دیتے ہیں اور نظم کے ساتھ نثر میں بھی فکاہیہ و طنزیہ مضامین لکھتے ہیں۔ چھپنے چھپانے کے معاملے میں کاہل ہیں۔ دوسرے معنوں میں شہرت پسند نہیں۔ چپکے چپکے کام کرنے کے عادی ہیں، لہٰذا اپنے کلام کی اشاعت سے پہلے دوسروں کا کلام شائع کر کے اپنے ذوق شعری کو تسکین دیتے ہیں۔

اردو کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اردو زبان کی تخلیقات کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح عالمی ادب کا ترجمہ اردو میں ہو رہا ہے۔ مستشرقین کی تعداد میں کمی تو نہیں آئی اضافہ ہی ہو رہا ہے لیکن اگر اپنوں نے اس کی محبت سے منہ موڑ لیا تو اردو سے محبت کرنے والے آٹھ آٹھ آنسو روئیں گے۔"

صبا نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ انہوں نے خود کو مخصوص اصناف تک محدود نہیں رکھا بلکہ شاعری کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی۔ نثری نظم کے لئے کہتے ہیں کہ یہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ اردو کو وسعت دینے کے لئے ضروری ہے کہ جو لوگ شاعری کی جس صنف میں بھی طبع آزمائی کریں، ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور کونسی صنف مستقبل میں قبول عام کی سند حاصل کرتی ہے، اسے وقت پر چھوڑ دیا جائے۔

صبا تنقیدی نشستوں کو مشاعرے سے بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ مشاعرے کا تصور ایک عوامی تقریب کا سا ہے لیکن تنقیدی نشستوں میں سنجیدگی برتی جاتی ہے، جہاں سے کچھ نہ کچھ سیکھنے سکھانے کا موقع ملتا ہی ہے۔ شرکاء کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں اور کچھ نہ کچھ تخلیق کرنے کی قوت کو نمو ملتی ہے۔

قاری سے ادب کا رشتہ کمزور پڑنے کی بات پر انہوں نے کہا کہ یہ بات کسی حد تک تو درست ہے مگر اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ ہمارے ہاں ہر دور میں معاشرے کی ایک مخصوص نوعیت رہی ہے اور اسی طرح ہر دور میں ادب بھی ایک مخصوص نوعیت کے ساتھ معاشرے میں اپنا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا، جب ادب ایک مخصوص طبقے کے تصرف میں تھا۔ اصناف سخن بھی گنی چنی تھیں۔ تفریح کے دیگر ذرائع اور مواقع چونکہ میسر نہ تھے، اس لئے ادب کو حظ کی خاطر مافوق الفطرت اور رومانی عناصر سے مزین کیا جاتا تھا جبکہ زندگی اور اس کے مسائل کو شعوری طور پر درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ درباری، سرکاری، سرپرستی اور راجوں، نوابوں کی دریا دلی نے ادب و فن کو طبقات سے بالاتر تصور کر کے اسے محض ایک مخصوص طبقے کی اقدار کا ترجمان بنا دیا گیا۔

اس دور میں عیش و نشاط کی نشہ کو مہمیز کرنے اور طرب انگیز لمحات میں خواہشات نفسانی کو برانگیختہ کرنے میں ریختی کا بڑا ہاتھ ہے۔ اسی طرح غزلیں بھی فرصت، تن آسانی اور

چاہئے تھی لیکن اپنے احساسات کا اظہار سنجیدہ شاعری میں بہتر طور پر کرپاتے ہیں۔ یکم جنوری 1951ء یا 1952ء کو پرانے لاہور میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی اسکول مصری شاہ اور ملتان روڈ سے میٹرک کیا۔ گورنمنٹ سائنس کالج لاہور سے بی ایس سی کرنا چاہا مگر طبیعت آرٹ کی طرف راغب تھی' اس لئے 1970ء میں بی۔ اے کیا پھر 1972ء میں سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی۔ ایڈ کی سند حاصل کی۔ ایک سال بعد ایم۔ اے اردو کا امتحان دیا۔ 1972ء میں دیئے گئے امتحان کا نتیجہ 1975ء میں نکلا۔ اسی دوران محکمہ تعلیم پنجاب کی طرف سے پبلک سروس کمیشن کے توسط سے لیکچرار کی آسامیاں مشتہر ہوئیں۔ صبا نے قسمت آزمائی کی اور منتخب ہوگئے۔ 6 جنوری 1976ء سے گورنمنٹ ڈگری کالج رحیم یار خان سے بطور لیکچرار شعبہ ء اردو عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ روزنامہ امروز لاہور کے عزیز اثری اور نوائے وقت لاہور کے محمد قیوم اعتصامی کی حوصلہ افزائی اور عطاء الحق قاسمی جیسے دوستوں کی رہنمائی نے نثر اور شاعری کے میدان میں ان کے لئے راہیں ہموار کیں۔ پہلا مشاعرہ ظہیر کاشمیری (مرحوم) کی مہمان نوازی کے سائے میں اور جناب مسکین علی حجازی کی صدارت میں لاہور میں پڑھا جو ایک طرح سے ادبی نشست تھی۔

رحیم یار خان میں درس و تدریس کے ساتھ ایک ادبی ادارے "ایوان ادب" کی بنیاد رکھی۔ 1984ء میں مقابلے کا امتحان پاس کرکے درس و تدریس کو خیرباد کہہ کہ بطور اسسٹنٹ کلکٹر کسٹمز اینڈ ایکسائز اپنی عملی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز کیا۔ اس سے قبل 12/ ستمبر 1978ء کو صوفیہ شیریں کے ساتھ رشتہ ازدواج کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔

یکم ستمبر 1986ء کو حیدر آباد سندھ میں پوسٹنگ ہوئی اور یہیں سے ادبی زندگی کو عروج ملتا چلا گیا۔ ضیاء الحق قاسمی کے ماہنامہ ظرافت کے اعزازی مدیر رہے۔ ستمبر 1989ء میں ان کا تبادلہ اسلام آباد ہوگیا۔ فروری 1992ء میں پھر کراچی آئے۔ 1993ء میں پہلا عالمی مشاعرہ کراچی میں پڑھا' اس میں پڑھی گئی غزل کے دو شعر یہ ہیں۔۔

لمبا رستہ دھوپ کڑی ہے
اپنی منزل کیا پوچھو ہو

جو ضربیں تقسیم ہوئی ہیں
ان کا حاصل کیا پوچھو ہو

صبا اب تک بھی کسی مکتب فکر سے خصوصی طور پر خود کو وابستہ نہ کرسکے کیونکہ ان کے قول شاعری تو ایک وہبی تقاضا ہے جو عصری تجربوں اسماجی رویوں اور فطری جبلتوں کے تال میل اور صاحب کلام کے کمال بصیرت اور جمال بصارت کے حوالے سے اپنے اظہار کی

تکلف کی غماز ہیں۔ قصیدے میں انعام و اکرام کے لالچ کی غرض سے حد درجہ غلو' خوشامد اور جھوٹ سے کام لیا گیا۔ مرثیوں میں بھی مبالغہ اور خواب دکھانے والی کیفیت زیادہ ہے۔ مثنوی سے بھی کم و بیش ریختی کا ہی کام لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ڈرامہ بھی اسی دور انحطاط کی پیداوار ہے۔ داستانیں تو اس سے بھی بڑھ کر تھیں کہ ماروائی کردار اور مافوق الفطرت واقعات قاری کو حقیقی دنیا سے فرار کا رستہ دکھاتے ہیں۔ در حقیقت اس زمانے کا ادب عوام کی زندگی اور ان کی محرومیوں اور روزمرہ زیست کی تلخیوں سے بے نیاز نظر آتا ہے کیونکہ اس میں عام طور پر فارغ البال طبقے کی نمائندگی کی گئی ہے۔

پھر زمانے نے کروٹ بدلی' تخت و تاج' راج پاٹ خواب و خیال ہوئے۔ ماورائی دنیا کی دلفریبیوں کی جگہ زندگی کی تلخ حقیقتوں نے لے لی۔ جنگ آزادی 1957ء کے بعد اردو ادب ایک نئے انداز سے سامنے آیا۔ اس مرتبہ ادیبوں اور شاعروں نے ادب کو شعوری طور پر اپنے زمانے کے سماج اور اس کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ استدلال' مقصدیت اور اصلاحی جذبے کے ساتھ ساتھ علم الکلام کی ضرورت کا احساس بھی ہوا۔ بعد کی دو عالمی جنگوں اور برصغیر کے دگرگوں حالات نے ایک بار پھر ادب کی جہتوں کا نئے سرے سے تعین کیا۔ ترقی پسند ادب نے استحصالی نظام اور اس کی اقدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ایک ایسے مثالی سماج کا تصور پیش کیا' جس میں استحصال کی گنجائش نہ ہو۔ سمٹا ہوا انسانی سماج پھیلنے لگا اور فاصلے سمٹنے لگے۔ ایک ملک دوسرے ملک اور ایک قوم دوسری قوم سے مربوط ہوتی چلی گئی اور رائے کے اظہار نے نئی نئی راہیں تلاشنا شروع کردیں۔ مختصر کہانی' افسانہ' ناول اور شاعری میں کیے گئے نئے نئے تجربوں نے ادب کی ہیئت ہی بدل کر رکھ دی اور اس طرح ادیب اور قاری میں ایک براہ راست تعلق بھی قائم ہوگیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ادب کی تخلیق ایک وجدانی فعل ہے' جو آفات و انقلابات میں زیادہ عمدگی سے پروان چڑھتا ہے۔ اب دن بدن بڑھتی ہوئی سائنسی ترقی نے فرد کی تقریباً" نفی کردی ہے۔ کتابوں کی جگہ بھی مشینوں نے لے لی ہے۔ فرد اپنی ذات کی تلاش کرتے کرتے اس گورکھ دھندے میں خود گم ہوگیا ہے اور اسے اپنی گمشدگی کا شدید احساس بھی ہے۔ وہ اب اس ادب کو پڑھنا پسند کرتا ہے جو اسے اس کا پتہ دے' اسے خود کو کھوجنے میں مدد دے۔ سماجی زندگی کے انتشار نے حیات انسانی کی بے حاصلی کے کرب کو شدید تر کردیا ہے۔ اعتماد کی فضا کے خاتمے نے انسان کے ہونے کا احساس ختم کرکے رکھ دیا ہے اور نہ ہونے میں زیادہ لطف آنے لگا ہے۔ فراریت کا یہ عنصر ادب میں بھی نمایاں ہورہا ہے۔ لا' بے معنویت' اجنبیت' تنہائی' افسردگی' بے چارگی اور یاسیت کے رویے ادب میں عام ہیں۔ ہمیں ان رویوں کو بدلنا ہوگا جو انسانی زندگی کے مثبت اقدار کے منافی ہیں' تب ہی ادب' ادیب اور قاری کے زندہ رہنے کی ضمانت دی جاسکے گی۔

آخری سوال کے جواب میں محمد سبکتگین صبا نے بتایا غالباً" تیس بتیس برس کی بات ہے۔ فیض احمد فیض نے لینن امن پرائز سے واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب کے طالب علموں سے گفتگو کرتے ہوئے یورپی اہل فکر کی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ مغربی دنیا کے پاس ادبی سانچے اور تکنیک ہے جبکہ نو آزاد قوموں کے پاس ان کا تاریخی شعور اور تازہ انسانی تجربہ ہے۔ دراصل ہمارا ادب نقل و تقلید کو کسی طور نہ تو برداشت کر سکتا ہے اور نہ قبول کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ تخلیقی عمل کی نشوونما کے لئے بین الاقوامی اثرات کی رفت و آمد بے حد ضروری ہے۔ عالمی ادب کی جانب سے آتے ہوئے افکار اور اصناف' تخلیقی عمل کے لئے غور و فکر اور اختراع و ایجاد کے نئے مواقع بہم پہنچاتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مغربی دنیا کے مسائل کو اپنے ادب میں جگہ دیں جیسا کہ ہو رہا ہے۔ اچھا ادب وہی ہے' جو اپنی مٹی سے جنم لے اور جس کی جڑیں مضبوط اور گہری ہوں۔ ادب کا اور خاص طور پر ہمارے ادب کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ادبی اور فکری حوالے سے لکھنے والوں کی دشواریاں کس نوعیت کی ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہمارا ادب اپنی انفرادیت یعنی تشخص اور تاریخ اور تخلیقی شعور کے ساتھ آنے والے زمانے میں اور کیا کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے' لہٰذا میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ ہمیں مغرب سے تکنیک ضرور سیکھنا چاہئے لیکن مسائل' حسیت اور احساس و شعور ہمارے اپنے ہونا چاہئیں۔"

کہتے ہیں "مرد کا وجود عورت کے لئے سائبان ہے" لیکن اگر صوفیہ شیریں جیسا ہم سفر میسر آئے تو مرد کو نہ صرف سائبان میسر آجاتا ہے بلکہ زندگی کی راہوں پر ہردم چاندنی چھٹکی نظر آتی ہے۔ اس کی رفاقت سے ناسازگار موسم میں بھی پھول مہکتے ہیں اور زندگی اندھیروں سے منہ موڑ کر خود ہی توانائی کے چراغ روشن کرتی نظر آتی ہے۔
سبکتگین صبا! آپ کو صوفیہ جیسی عظیم شریک حیات کی رفاقت مبارک ہو۔

عکس فن

نعت

عجب اک نشۂ خود آگہی ذہنوں پہ چھاتا ہے
محمد مصطفیٰؐ کا نام جب ہونٹوں پہ آتا ہے

میں شب کی ساعتوں کو انؐ پہ جب قربان کرتا ہوں
مجھے لگتا ہے جیسے مجھ میں کوئی جاگ جاتا ہے

انہیؐ کی ذات سے ملتا ہے منزل کا نشاں سب کو
انہیؐ کا نور ہے جو راستہ سیدھا دکھاتا ہے

نہ خواہش محل کی مجھ کو نہ حسرت ہے مناروں کی
مجھے تو سبز گنبد کملی والےؐ کا ہی بھاتا ہے

کبھی بھی زندگی میں کوئی مشکل پڑ نہیں سکتی
وہؐ اپنے چاہنے والوں سے یوں رشتہ نبھاتا ہے

اسی سے جان لو رتبہ محمدؐ کا جہاں والو
کہ وہ ایسی حقیقت ہے قسم رب جس کی کھاتا ہے

مجھے ہو فکر کیوں اپنی صبا پھر روز محشر میں
محمدؐ سے جو رشتہ ہے، محمدؐ سے جو ناطہ ہے

شہرِ خوباں اب ترے معیار سے بھی گر گیا
قامت و زلف و لب و رخسار سے بھی گر گیا

عبدالقوی ضیا

Prof. Abdul Qavi Zia
961 Auger Street
Sudbury, Ontario P3A 4A7
Canada

پروفیسر عبدالقوی ضیاء

اونٹاریو

میں اصول پرست تو ہوں اور وقت کی پابند بھی۔ اگر اپنے کردار میں یہ خوبیاں پیدا نہ کرتی تو اپنی منزل تک پہنچنے کی میری ساری جدوجہد اکارت جاتی۔ اسی وجہ سے میں نے "سخن ور حصہ سوم" کے انٹرویوز کی وصولی کی ایک قطعی آخری تاریخ مقرر کردی تھی۔ پروفیسر عبدالقوی ضیاء کا تعارف مجھے اس مقررہ تاریخ کے ایک دن بعد ملا۔ رجسٹرڈ لفافہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کسٹم میں چیک ہوا ہے۔ تعارف کے ساتھ جو خط منسلک ہے' اس پر 3 فروری 1998ء کی تاریخ پڑی ہے۔ لفافہ مجھے 17 فروری کو موصول ہوا (میں نے آخری تاریخ 16 فروری 98ء مقرر کی تھی) پروفیسر عبدالقوی ضیاء کے لئے مجھے رعایت سے کام لینا پڑا۔ کبھی کبھی اپنے اصول توڑنے میں بڑی سرشاری بھی محسوس ہوتی ہے اور اس وقت تو اس سرشاری کی کیفیت دوبالا ہوجاتی ہے' جب سامنے علم و ادب کی ایک دیو قامت شخصیت کا بت استیادہ ہو لیکن اس انٹرویو کے لئے رعایت یوں بھی ضروری تھی کہ ہمارے پیارے پاکستان کی ڈاک کا نظام بھی ہمارے ملک کے دیگر نظاموں کی طرح "اعلیٰ وارفع" ہے۔ پروفیسر ضیاء کا لفافہ سینسر کے بعد بھی بروقت مل گیا' غنیمت ہے ورنہ ہم کس سے فریاد رساں ہوتے؟

عبدالقوی ضیاء کا تعارف اتنا آسان بھی نہیں کہ ان کا ادبی کام ربع صدی سے بھی زیادہ مدت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی نامور ہستیوں نے ان کی شخصیت و فن کے متعلق اپنی گرانقدر رائے کا اظہار کیا ہے۔ اردو کے شیدائی اور اہل سخن ان کے ادبی کارناموں سے آگاہ ہیں اور بلا مبالغہ پروفیسر عبدالقوی ضیاء کا نام آج دنیائے ادب کا ایک معتبر حوالہ اور ان کی شخصیت ایوان ادب کا ایک آہنی ستون ہے۔

عبدالقوی ضیاء 11 نومبر 1925ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا آغاز بھی انہوں نے وہیں سے کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کی سند لینے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور کچھ مدت تک وہیں پڑھایا بھی۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد انہوں نے بھی ہجرت کی۔ یہاں آکر سندھ یونیورسٹی کے شعبہء تاریخ سے خاصے عرصے تک منسلک رہے۔ 1966ء میں فلبوائٹ اسکالر شپ اور ایسٹ ویسٹ سینٹر کلچرل ایکسچینج گرانٹ ملنے پر یونیورسٹی آف ہوائی ہونولولو چلے گئے۔ (جزیرہ ہوائی امریکہ کی ریاستوں میں شامل ہے) وہاں سے اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کرنے کے لئے اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز جانس ہینکر یونیورسٹی واشنگٹن ڈی سی سے وابستہ ہوگئے۔ 1963ء میں کینیڈا منتقل ہوگئے' جہاں وہ ایک عرصے تک لارینشن یونیورسٹی (Laurentian Uiniversity) کے شعبہء تاریخ میں درس و تدریس کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ آج بھی عبدالقوی ضیاء علم کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر در نایاب نکال لاتے ہیں مگر جب ان سے ان کی تعلیم کے سلسلے میں پوچھا جائے تو مسکرا کر کہتے ہیں۔۔

عمر اک چاہئے قطرے کو گہر ہونے تک

انکی لکھی کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ "تاریخ انڈس" جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں' اس پر علامہ نیاز فتح پوری (مرحوم) نے نگار کے مارچ 1958ء کے شمارہ میں سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اس موضوع پر اس سے پہلے بھی اردو میں کتابیں لکھی جاچکی ہیں لیکن وہ زیادہ تر انگریزی کتابوں کا ترجمہ یا اقتباس تھیں جبکہ پروفیسر ضیاء کی کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلی چیز ہے اور تاریخی لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہے۔"

علاوہ اس کے انہوں نے جو دیگر کتابیں تخلیق کیں' ان میں "مختصر تاریخ تہذیب و تمدن جو فی الوقت نایاب ہے" جنوبی ایشیاء تنازعات اور بحران (انگریزی) پاکستانی امریکی روابط' پانچویں دہائی میں (انگریزی) عصر اردو شاعری تاریخی پس منظر' برف زار (شعری مجموعہ) وژن اینڈ وژن (انگریزی) اردو ادب میں نئے جہات (انگریزی) وہ آئیں ہمارے گھر (خاکے) شامل ہیں۔ تنقیدی' ادبی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ اور دیگر کئی کتابیں زیر ترتیب ہیں۔

پروفیسر عبدالقوی ضیاء پاکستان میں انجمن ترقی اردو پاکستان' سندھ ادبی مرکز حیدر آباد اور سٹی کالج ادبی سوسائٹی کے اہم رکن رہے۔ اسی طرح کینیڈا میں کئی تنظیموں کے نائب صدر و صدر رہ چکے ہیں' جن میں تنظیم حقوق انسانی' کینیڈین ایسوسی ایشن آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز' نیشنل فیڈریشن آف پاکستانی اسٹڈیز' میموریل سوسائٹی آف سڈبری' پاکستان کلچرل سوسائٹی' کونسل آف جنوبی ایشیاء مطالبات اور متعدد انجمنیں اور درسگاہیں شامل ہیں۔ انہیں دیئے گئے وظائف' عطیات' اعزازات و اکرامات کی فہرست بھی بے حد طویل ہے۔

ڈاکٹر مہندپال آنند کہتے ہیں' ان کی موجودگی کینیڈا میں اردو زبان کے لئے ایک نیک

فال ہے۔ "وژن اینڈ وژن" میں انہوں نے کینیڈا میں آباد اہل قلم کا تعارف اور ایسے جامع مضامین لکھے ہیں کہ کینیڈا میں اردو زبان کی ایک پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق اعظمی نے لکھا ہے کہ پروفیسر ضیاء کا شمار ان ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے شمالی امریکہ میں اردو کے خدوخال نکھارنے اور اس کے گیسو سنوارنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا حالانکہ وہ مترجم، مضمون نگار اور مورخ ہیں، تاریخ کے استاد ہیں لیکن اردو دوستی کو اپنے دھڑکتے سینے سے لگا رکھا ہے۔ دیار مغرب میں اردو کی بقا اور آبرو ایسے ہی مخلص محبان اردو زبان و ادب کے ہاتھوں محفوظ ہے، جنہوں نے اپنے خون جگر سے اس اجنبی دیار میں گلشن ادب کو شادابی اور تازگی بخشی ہے۔ انہوں نے انگریزی زبان میں متعدد کتابیں لکھ کر اردو کو نہ صرف غیر اردو دان طبقہ سے متعارف کرایا ہے بلکہ برصغیر سے ہجرت زدہ لوگوں کی آنے والی نسل جو اسی دیار میں پل بڑھ کر جوان ہوئی، اردو کی نزاکتوں اور ندرتوں سے آگاہ کیا ہے۔"

اب ہم پروفیسر ضیاء سے "سخن وہ حصہ سوم" کے حوالے سے کچھ پوچھتے ہیں۔ ایک سوال تو یہ ہے کہ وہ شاعری کے کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جواب میں انہوں نے بتایا.... "میرے نزدیک ادب اور زندگی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلتے ہی رہتے ہیں۔ اردو ادب اپنے ارتقائی سفر سے بہت سی تحریکوں اور مکاتیب فکر سے متاثر ہوا مگر انہیں زیادہ فوقیت اور سبقت ترقی پسند تحریک سے رہی اور میں اس سے بڑی حد تک متاثر رہا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس تحریک اردو ادب کو بہت سے افکار، اذکار، نظریات اور رجحانات سے آشنا کیا جو اس سے قبل ممکن نہ ہو سکا تھا اور ادب کے سماجی اور ثقافتی کردار کا رخ ہی ایک مختلف سمت موڑ دیا اور اسے حیات انسانی کے بہت سے مسائل سے روشناس کر دیا۔ اس کے علاوہ میں دوسرے مکاتیب فکر کا اس حد تک پرستار ضرور ہوں، جس میں کلاسیکیت ہو، ادب کی بہت قدیمی روایات نے بھی میرے ذہن پر بہت سے مثبت اثرات مرتسم کئے۔

اردو کے مستقبل پر گفتگو ہوئی تو پروفیسر ضیاء نے یہ شعر دہراتے ہوئے کہا۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

یہ کل کی بات ہے، جب داغ دہلوی کا یہ زباں زد خاص و عام شعر ایک لطیف شاعرانہ تخیل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا لیکن آج وہی نازک تخیل ایک حقیقت کا ایسا روپ اختیار کر چکا ہے جو نکھرا ستھرا بھی ہے۔ سنورا سنورا بھی۔ جاوداں بھی پیہم رواں دواں بھی۔ آج اگر داغ زندہ ہوتے تو انہیں اپنے شعر کے صحیح مطالب و مفاہیم عالمی تناظر میں مل جاتے اور جو خواب انہوں نے اس شعر کے پیکر میں دیکھا تھا، اس کی تعبیر بھی مل جاتی۔ آج اردو

برصغیر سے باہر نکل کر دنیا کے ہر ہر حصہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے' جہاں جہاں پاک و ہند کے اردو بولنے والے پہنچے' سب وہاں وہاں وہ اپنے ساتھ اپنے ثقافتی اقدار' معاشرتی اطوار اور اپنی زبان و ادب کی چاہت بھی لے گئے اور انہوں نے اردو کے بیج ان نئی بستیوں میں ایسی محنت اور محبت سے بو دیئے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان بیجوں کے طفیل ایک ہرا پودا نمودار ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک شاخ آور تناور اور سایہ دار درخت بن گیا اور آج اردو (بشمول ہندی) چینی' انگریزی' فرانسیسی زبانوں کے بعد سب سے زیادہ مقبول اور بولی جانے والی زبان ہے۔ اس کی تصدیق ورلڈ المناک World Almanac سے کی جاسکتی ہے۔

آج اردو آسٹریلیا سے لے کر برطانیہ' اسکینڈی نیویا سے لے کر شمالی امریکہ (بشمول کینیڈا) مشرقی اور وسطی عرب ممالک' متحدہ عرب امارات' جزائر ہند مشرق و مغرب' شمالی اور جنوبی افریقہ' بحرین او قیانوس اور الکاہل کے جزائر میں جگہ بہ جگہ' ملک بہ ملک اردو کے لئے کچھ نہ کچھ کام کسی نہ کسی نوع دلجمعی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ کل تک برطانیہ اردو کا پاک و ہند کے بعد تیسرا سب سے بڑا ادبی مرکز سمجھا جاتا تھا' آج یہ مرکزیت سارے کرہ ارضی پر منقسم ہو گئی ہے۔ بقول جناب جمیل الدین عالی آج ٹورنٹو (کینیڈا) کو اردو کی سرگرمیوں کے تعلق سے وہی اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے' جو کراچی کو (کہ اب تو کراچی کا پڑ جائے گا ٹورنٹو نام)۔

شاعری میں اظہار خیال کے لئے کس صنف کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کے جواب میں ضیاء کہتے ہیں۔۔۔۔ "ہماری شاعری میں جتنی بھی اصناف مروج و مستعمل ہیں' وہ سبھی خرد افروز اور فکر انگیز خیالات کو خوش اسلوبی اور خوش سلیقگی سے پیش کرنے کی سکت رکھتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت سی اصناف جو فکر کو اظہاریت بخشنے کی صلاحیت نہیں رکھتی وہ مفقود ہو جاتیں ہر لکھنے والا اپنی ضرورت اور افتاد طبع کے تحت کسی صنف شعری کو اپنے تفکرات اور محسوسات کے ابلاغ کا ذریعہ بنا لیتا ہے مثلاً" مراثی واقعہ کربلا کے لئے ملت و قوم کے احساسات کے تعلق سے مسدس' مثلث' مخمس وغیرہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ منظوم کہانی کے لئے مثنوی' قصیدہ نگاری کے لئے پابند نظم کی شکل۔ ان کے علاوہ جذبات اور داخلی کیفیات کے بیان کے لئے غزل انتہائی موزوں اور مناسب صنف ہے اور رہتی دنیا تک اس کو یہ عظمت اور اہمیت حاصل رہے گی۔ پچھلی کئی دہائیوں سے ہم نے مغرب سے بہت سی اصناف مستعار لیں مثلاً" نظم معراء' نظم آزاد' سانیٹ وغیرہ۔ فرانس سے ہم نے ترائیلے' جاپان سے ہائیکو' ہندوستان سے دوہے' ماہیے' کافیاں' بھجن اور بہت سی ہندی یا بنگالی اصناف وغیرہ قبول کیں جو اردو میں مقبول بھی ہوئیں۔ ادھر کچھ عرصہ سے کچھ نئے تجربات بھی ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ثلاثیاں مختصر منظوم افسانے ان تمام تجربات اور رجحانات کے مقبول ہونے میں ذرا وقت لگے گا۔ دلی جذبات' قلبی محسوسات اور رومانوی خیالات کے اظہار کے

لئے غزل کو جو عظمت ملی وہ کسی اور صنف کا مقدر نہ بن سکی اور اس سے بہتر شعری ادب شاید ہی کسی اور زبان میں تخلیق کیا گیا ہو۔ البتہ آج کل جو غزل معراء اور آزاد غزل کا چلن چل پڑا ہے' اس سے میں متفق نہیں ہوں۔ اس نوع کی غزل گوئی کب تک مروج رہے گی' اس کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا۔

اس ضمن میں نثری نظم بھی آتی ہے' نئی نسل کے کئی ذہن اس سے متاثر ہیں خصوصاً" کشور ناہید کہ جنہیں جمیل جالبی نے بحیثیت نثری نظم گو کے سند بھی دے دی۔ یہ بھی ایک خوشگوار تجربہ ہے اور مغرب کی دین ہے۔ اس میں نہ تو ہمہ گیریت ہے اور نہ ہی گہرائی اور گیرائی۔ نثر کے چند خوشنما اور خوبصورت ٹکڑے پڑھنے کو ضرور مل جاتے ہیں۔ نثری نظم حسین جذبوں' قلبی اور داخلی احساسات اور فکر کی توانائی سے محروم ہے' یہی سبب ہے کہ اس کی مقبولیت روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔"

مشاعروں اور ادبی نشستوں کے حوالے سے انہوں نے بتایا.... "مشاعروں کا رواج کسی نہ کسی نوع میں قدیمی بھی ہے اور بنیادی بھی کہ شاعر اور سامع کا رشتہ بہت ہی قدیم ہے اور ان دونوں کا ساتھ جیب و دامان کا سا ہے۔ ہر چند کہ افلاطون شاعروں کو ادب میں ممتاز مقام دینے کا قائل نہیں تھا پھر بھی قصیدہ گوئی' یونانیوں کے خود ساختہ خداؤں کی توصیف' منظوم تاریخ گوئی کا قائل تھا اور ھومر اور اس کی دو معروف تصنیفات ILIAD....ODYEESY کا مدح خواں تھا اور اس کو پڑھنے اور با آواز بلند پڑھنے اور دوسروں کو سنانے اور گوش بر آواز کرنے کے عمل کو فطری قرار دیتا تھا۔ اہل عرب نے اپنی زبان میں شاعر کی اصطلاح شعری مقابلے کے لئے وضع کی تھی اور لفظ مشاعرہ اسی سے ماخوذ ہے۔ یہ مقابلہ ہر سال مکے میں عکاظ کے نام سے ہوتا تھا' جس میں اطراف سے لوگ اپنی تخلیقات لے کر آتے تھے اور اس موقع پر حسن و خوبی کے ساتھ پیش کرتے تھے اور داد طلب ہوتے تھے' جس تخلیق کو خوب داد ملتی تھی' اسے اس سال کی بہترین تصنیف قرار دیا جاتا تھا اور وہ خانہ کعبہ کے دروازے پر کچھ اس طرح چسپاں کی جاتی تھی کہ چاہے باد و باراں ہوں یا طوفان اسی طرح لٹکی رہتی تھیں۔ ایام جہالت میں آنحضرتؐ کی پیدائش سے قبل یہ اعزاز امراؤ القیس کو سال بہ سال ملتا رہا۔

دور مغلیہ میں مشاعرہ کا رواج عرب سے عجم کی راہ سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا اور پھر کئی جہات میں تقسیم ہو گیا۔ دربار شاہی میں قصیدہ گوئی کا رواج عام ہوا لیکن شعری ادب کو فروغ دینے کے لئے مشاعروں کا اجتماع بھی شروع ہوا' جس میں کبھی کبھار ایران سے آئے ہوئے شعراء بھی مہمان کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے' رفتہ رفتہ طرحی مشاعروں کو فروغ حاصل ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک ایسا ادارہ بن گیا' جس میں شعراء کی تخلیق اور فکری کاوشوں کو جانچا اور پرکھا جاتا تھا۔ شعراء کے اس اجتماع نے جب بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی تو مشاعرہ

ایک محفل نشاط و انبساط کی صورت بھی اختیار کرگیا۔ بیسویں صدی میں مشاعروں کی روایت شاہی، درباروں اور جاگیرداروں کے محلوں سے نکل کر نجی محفلوں، تعلیمی اداروں اور ادبی انجمنوں کی تحویل میں چلا گیا، جس کی بناء پر بالواسطہ یا بلاواسطہ ادب کو مقبولیت اور فکری، فنی، شعوری اور تخلیقی کاوشوں کو تقویت ملتی رہی۔ یوں یہ روایت ہماری تہذیب کا اہم ورثہ اور ثقافتی اقدار کا حصہ بن گیا۔ اس کے ذریعے ایک طرف تو شعراء کی شعر کہنے کی استعداد اور رجحان کو پنپنے کا موقع ملا دوسری طرف شاعر کا کلام حسِّ سماعت کو متاثر کرتا گیا۔ یہ سامع کو لسانی طور پر الفاظ کی نشست و برخاست، درست تلفظ بہت سے استعارات، تشبیہات اور اصطلاحت سے بھی واقف کراتا گیا۔ جو کردار مشاعروں نے اردو کے فروغ اور نشو ونما میں ادا کیا اور فن شعر گوئی کو اس سے جو تقویت ملی، ادبی نشستوں کے ذریعے ممکن نہ تھی کہ ایسی محفلوں میں اول تو شرکاء کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ دوسرے اس میں شعر سماعت سے سننے والی حس سے زیادہ قوت تجزیہ محاکم، محاسبہ کو چھیڑتا اور کھنگالتا ہے کہ ایسے ادبی جلسوں کا انعقاد نقد و نظر کی خاطر ہوتا ہے اور شعر کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ آج کے مشاعروں میں پچاس ساٹھ ہزار کا اجتماع شعراء کے کلام سننے کے لئے کوئی غیر معمول بات نہیں ادبی نشستوں میں جہاں بحث و مباحثہ اور تنقیدی موشگافیاں اصل مقصد ہوتا ہے۔ اردو کی نئی بستیوں میں تو مشاعرے ایک مخصوص اہمیت اور درجہ افادیت رکھتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ تفریح کا سامان بہم کرتے ہیں دوسرے خرد مندی اور خرد افروزی کو بھی مہمیز لگاتے ہیں۔ عموماً" یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی محفلوں میں شعر شناسی اور سخن فہمی پر انبساطی کیفیات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ سامع کے ذہنی، فکری یا لسانی کارکردگی کے بجائے قلبی تاثرات، جذباتیت یا طرزِ ادائیگی کے ذریعے اس کے محسوسات کو چھونے اور چھیڑنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ایسی محفلوں میں جو کلمات تحسین ادا کئے جاتے ہیں، خصوصیت سے شاعرات کے لئے (جو صورتی اور صوتی طور پر اثرات منظم کرتی ہیں) ان میں عقل و فہم کو کم استعمال کیا جاتا ہے اور کیف و نشاط کو زیادہ شعری بلاغت سے زیادہ لطافت اور وضاحت سے زیادہ سلاست ارتکاز توجہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بھی ان مشاعروں میں بعض شعراء اپنے کلام کے ذریعے سامع کے دل و دماغ پر ایسے تاثرات چھوڑ جاتے ہیں، جن کا اثر دیرپا ہوتا ہے اور یوں غیر شعوری طور پر اردو کی دیارِ غیر میں سب مقبولیت اور قبولیت کا سبب بن جاتا ہے۔
"

کہا جارہا ہے کہ دورِ حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے اور قاری سے اس کا رشتہ کمزور پڑگیا ہے چنانچہ آج کا ادب ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے آپ کیا کہیں گے؟ انہوں نے جواب میں کہا۔ "ہمارے ادب پر اس قسم کا گراں اور نازک مقام آج سے پہلے

کئی بار آچکا ہے' جب اس پر کبھی یہ الزام لگایا گیا کہ اس پر جمود طاری ہے۔ کبھی یہ الزام دہرا گیا کہ ادب پسماندگی کی طرف رواں دواں ہے۔ کبھی اسے تفنن طبع کا ذریعہ کہا گیا۔ آج اس پر یہ بہتان بھی لگا کہ ہمارے ادب کا رشتہ عمل سے منقطع ہو جانے کی وجہ سے قاری سے کٹ گیا ہے۔ یہ بے اثر اور بے مزہ ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ گویا یہ ایک اور کلیشے ہے جسے تراش خراش کر کے ادب سے منسوب کرایا گیا ہے۔"

جن لوگوں کے مطالعہ میں Richards کی معروف تصنیف عملی تنقید Criticism Practical آئی ہے وہ اس رمز سے واقف ہیں کہ ادب خصوصیت سے تنقید کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ عقلی' جذباتی' ساختیاتی' عملی و غیر علم' عقلی ادب اور تنقید کو وہ استدلال' فہم و ادراک افہام و تفہیم کے دائرے میں ڈالتا ہے۔ جذباتی کو فکر کے زمرے میں شمار کرتا ہے۔ ساختیاتی کو معاشرتی ساخت' تجریدی' لسانی نظام اور نشانیات کے صف میں جگہ دیتا ہے اور عملی ادب کو زندگی سے قریب بلکہ قریب تر لانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ غور و فکر کا عمل انفرادی بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی بھی۔

ادیب یا شاعر جب شعوری یا Inspiration کے تحت ادب تخلیق کرتا ہے تو اس کا مقصد اپنے قاری سے براہ راست پر اثر رشتہ قائم کرنا ہوتا ہے کہ ادب کسی زبان کا بھی کیوں نہ ہو۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے' جس میں لکھنے والے کے تجربات' مشاہدات' تاثرات کا فنکارانہ اظہار کچھ اس طرح سے ہو کہ قلمکار اور قاری کے درمیان جو ناطے ہیں وہ ہموار بھی رہیں اور استوار بھی۔ اس اعتبار سے ادب اور قاری اور اس لحاظ سے زندگی سے رشتہ اٹوٹ بھی ہے انمٹ بھی' جو ادب قاری کو متاثر نہ کر سکے اور زندگی سے قریب نہ ہو حیات انسانی کے مسائل اور مصائب کا تجزیہ اور احاطہ نہ کر سکے' وہ ادب کسی بھی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکتا اور نہ ہی اس کے پڑھنے کے درمیان کوئی محکم اور مستحکم رشتہ قائم کر سکا ہے۔ ادب کے مختلف ارتقائی منازل کا جائزہ لینے کے لئے زندگی کے ارتقائی مراحل کا مطالعہ لازم ہے۔ پچھلے دو سو سال میں ہمارا ادب بہت سے تلخ و ترش ادوار سے گزرا ہے اور متعدد ادبی تحریکوں نے اس کو نکھارنے اور سنوارنے میں قابل ذکر حصہ لیا ہے اور ہماری تہذیب کے بہت سے عناصر کی ہم رشتگی میں شعر و ادب کو فکری توانائی اور تخلیقی شعور عطا کیا۔ ساری تحریکوں کا ذکر تو یہاں ممکن نہیں لیکن ترقی پسند تحریک کے ہمہ گیر اثرات سے انکار کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ ایک طرف تو اس تحریک نے ہمارے ادب کو بہت سے انقلابی نظریات اور رجحانات سے ہمکنار کیا دوسری طرف اسے ہمارے سماج اور معاشرے اور تہذیبی اقدار کو پوری طرح متاثر کیا اور ادب کو زندگی سے بہت قریب لے آیا۔

اس کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے رفتہ رفتہ اپنا مقام ادب میں بنانا شروع کیا۔

پھر تو جدیدیت پسندوں کے ہاتھوں ادب کو عمارت کے بالائی خانے (ATTIC) میں مقید کردیا گیا اور اسے صرف ایسے تخلیق کاروں کا حصہ بنادیا جو ان کے نزدیک اعلیٰ تعلیم یافتہ، مغرب زدہ ادبی Elite طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ان قلم کاروں نے جو ادبی شہ پارے ہماری نظروں کے سامنے بکھیرے ان سے صرف چند آنکھیں تو خیرہ ہو سکتی تھیں جو ادبی خواص کا مرتبہ رکھے ہیں مگر عوام الناس کی آنکھوں کو کوئی روشنی نہیں بخش سکتے تھے۔ جدت پسندوں کے نزدیک عوام کو چشم ٹھہرائے گئے ان کی ادبی انائیت پسندی نے اساطیری، دیومالائی، تجریدی، دانشورانہ موضوعات کو اپنی تحریر کا حصہ بنا کر غیر مقصد ادب کی تخلیق کو اپنا مقصد بنالیا۔ نتیجتاً" جدت پسندوں اور مابعد جدت پسندوں نے ادیب اور قاری اور سامع کے درمیان جو رشتے تھے انہیں نہ صرف کمزور بلکہ منہدم کرکے رکھ دیا۔ جدیدیت کے خانوں سے نکل کر جو شعری یا نثری ادب اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا وہ غالبا" اعلیٰ معیار کا تو ہو سکتا ہے مگر مقبولیت کا درجہ اور مرتبہ نہیں حاصل کرسکتا۔ ادب کو اپنی پرورش پانے اور پنپنے کے لئے جس سازگار فضا کی ضرورت ہوتی ہے وہ کسی قدر مفقود ہوگئی۔ ایسا ادب بے مزہ تو نہیں ہوا مگر بے اثر ضرور ہوگیا کہ انسانی ذہن کی تعمیرو تشکیل میں اس نے کوئی اہم رول ادا نہیں کیا اور اس کو مقصدیت اور افادیت کے احاطے سے نکال کر ادب برائے انا پرستی کا مظہر بنادیا اور مولانا حالی کے وقت سے جو ادب اور سماج کے مابین، باہمی رشتہ اور ناطے کی فضا ہموار اور استوار ہوئی تھی اسے کمزور سے کمزور تر کردیا۔

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا...."پہلے تو میں یہ عرض کرنے کی جرات کروں گا کہ آپ نے جو ادیبوں کو سینئر اور جونیئر کے خانوں میں تقسیم کردیا ہے، مجھے یہ تخصیص بھی نہیں معلوم ہوئی جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ آج بھی بہت سے جونیئر لکھنے والے ہزاروں سینئر تخلیق کاروں سے بہتر اور معیاری ادب تخلیق کررہے ہیں۔

بلاشبہ ہمارے بہت سے ادباء اور شعراء جو خاصی شہرت اور منزلت کے مالک ہیں، وہ مغربی فکر و فن سے متاثر ہیں اور بیرون برصغیر پاک و ہند جو تخلیقی کرشمہ سازیاں وجود میں آرہی ہیں یا آتی رہیں گی ان سے استفادہ کرنا معیوب نہیں سمجھتے۔ اس کے برخلاف بہت سے ایسے تخلیق کار بھی ہیں جو مغربی خیالات اور رجحانات کی پیروی کرنا لائق تعزیر سمجھتے ہیں اور مغربی ادب کے نظریات کا جو سایہ ہمارے ادب پر پڑا ہے، اسے تاریکی سے تعبیر کرتے ہیں یہ بھی صحت مند نظریہ نہیں ہے۔ اردو ہمیشہ سے اپنے مولدو مسکن سے دوسرے ممالک کی تہذیبی، تمدنی اور ادبی روایات سے متاثر رہی ہے۔ اس زبان کے حروف تہجی، املا، الفاظ، گرامر، عروض و بحور، اصطلاحات، استعارات، تشبیہات عرب و عجم کے مرہون منت ہیں۔ بہت سے تلازمات، قواعد و ضوابط ترکی سے مستعار لئے گئے۔ خود لفظ اردو ترکی زبان کا لفظ

ہے، جس کے معنی لشکر کے ہیں اور شاہ جہاں کے زمانے سے اس ہندوی یا ہندوستانی زبان کو یہ Title عطا کیا گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ابتداء ہی سے اردو کے دامن میں جو تجربات، مشاہدات اور افکار و نظریات تھے، وہ ہندوستان سے باہر کے ممالک سے حاصل کئے گئے اور اس پر ہم قطعاً" ناک بھوں نہیں چڑھاتے۔ ہماری ادبی زندگی کی ترجمانی، تفسیر اور اصلاح ہندوستان سے باہر کے ادب سے ہوتی رہی اور آج بھی ہو رہی ہے۔ وہ تمام مکاتیب فکر ہمارے ادب پر حاوی رہے۔ وہ ہندی کم تھے، عربی اور عجمی زیادہ۔ ہم اس سے بددل نہ ہوئے بلکہ ہندی، سنسکرت، بنگالی اور دوسری پراکرتوں سے اپنے ادب کو مالا مال کرنے سے گریز کرتے رہے۔

جب ہمارے اوپر برطانوی سامراجیت تھوپی گئی تو حالی کے ہاتھوں ایک نئی تنقید کی داغ بیل پڑی۔ آج ہم سب کو یہ بخوبی علم ہے کہ حالی نے اردو تنقید کو نیا رخ، ایک نئی جہت، مغربی ادب خصوصیت سے انگریزی ادب سے متاثر ہو کر عطا کی۔ "مقدمہ شعر و شاعری" سے اردو تنقید کا ایک نیا باب اور اس "مقدمہ" میں تمام تر تنقیدی عناصر مغربی تھے۔ اس رجحان کو سرسید کے ہاتھوں اور بھی تقویت اور تازگی ملی۔ مغربی اثرات کے تحت ان دونوں کے ہاتھوں جو اردو تنقید کو فروغ اور رتبہ حاصل ہوا، اس سے کون واقف نہیں، اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی تحریک نے اردو نثر کو نئی راہیں عطا کیں اور نئے امکانات پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر جان **گلکرائسٹ** اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں اردو نثر کو مشکل گوئی اور ادق نگاری سے نجات ملی۔ انداز نگارش میں سادگی، سلاست اور نفاست آئی اس مغربی اثر نے اردو نثر کو متحرک اور قابل پسند بنا دیا۔ ہم اس پر منہ نہیں چڑھاتے ہیں۔ انجمن پنجاب تحریک نے مغرب سے متاثر ہو کر غزل کے شانہ بشانہ نظم کو بھی ممتاز حیثیت دی۔ اردو شاعری کو نئے نئے موضوعات اور نیا مواد ملا اور یوں شعری روایات کو ایک نیا راستہ اظہار کا ملا۔ ہم اسے بھی قابل معتوب نہیں سمجھتے، ترقی پسند تحریک نے اردو میں نظم معراء اور نظم آزاد کی بنیاد رکھی۔ یہ عمل بھی قابل قبول ٹھہرا۔ یہ تحریک روس کی مرہون منت تھی اور ہمارے ادب میں اس کو ایک ممتاز مرتبہ آج بھی حاصل ہے۔

آج جبکہ دنیا سکڑتے سکڑتے ایک عالمی گاروں کی شکل اختیار کر چکی ہے اور دوسرے ممالک سے ہمارا ناطہ میلوں کے حساب سے نہیں بلکہ گھنٹوں سے ناپا جاتا ہے کہ ہم دہلی یا کراچی سے لندن چھ گھنٹے میں پہنچ سکتے ہیں۔ یا لندن سے نیویارک کا سفر 6 یا 7 گھنٹے کا ہے۔ ایسے دور میں مغربی اثرات کو رد کر دینا اور ان کو محض ادبی فیشن کی طرح قبول کرنے پر معترض کوئی صحت مند نظریہ اور دانش مندانہ نکتہ نظر نہیں ہے۔ ذرا دل کو ٹٹول کر دیکھئے اور بتلایئے کہ ہمارے شعبہ حیات کا کون سا عنصر ہے جو مغربی اثرات سے بے نیاز ہے۔ وہ چاہے

سائنس ہو یا ٹیکنالوجی، طب، فارمیسی، طبی ٹیکنالوجی انجینئرنگ، طبیعات، عمرانیات، نفسیات۔ Space ٹیکنالوجی غرضیکہ کس کس کا نام لوں، جن کے اثرات ہمارے معاشرے پر ثبت نہیں ہوسکے۔ آج ہمارے ادیب، شاعر، دانشور دنیا کے کونے کونے میں اپنے قدم مضبوطی سے جمائے ہوئے ہیں اور جہاں جہاں ان اہل نظر نے تازہ بستیاں آباد کر رکھی ہیں، وہ ان ممالک کے معاشرتی، ثقافتی نظام اور ادبی روایات سے بہت کچھ سیکھ رہے ہیں۔ ہماری زبان میں ہزاروں الفاظ انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، جرمنی، اسکینڈین نیوئن زبانوں سے بڑی خوبصورتی سے در آئے ہیں اور ہماری زبان کا ایک ایسا حصہ بن گئے جیسے ہمیشہ سے اردو لسانیات کا حصہ تھے۔ ہم نے ان سے بہت سے نئے اصناف بھی مستعار کرلئے ہیں اور اپنی مشق سخن میں ان اصناف کو خاصی ترجیح دے رہے ہیں۔ ترائیلے، سانیٹ، ہائیکو ہمارے شعری ادب کی تسبیح میں دانے کی طرح پرو دیئے گئے۔ ہم اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھے۔ آج ہمارے مسائل اور معاشرتی نظام کے بہتیرے اقدار مقامی یا ملکی نہیں رہے ہیں بلکہ بین الاقوامی بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے کائناتی بن گئے ہیں۔ فکری، نظری، فنی اعتبار سے بیرونی ممالک کی روایات سے رابطہ اور رشتہ قائم کرکرے ہم نے اپنی زبان کے Spectrum اور Perspective کو وسیع سے وسیع تر کررہا ہے۔ ہماری حسیات، ہمارے احساسات اور ہمارا شعور بین الاقوامی زندگی کی نیرنگیوں اور بوقلمونیوں سے بے گانہ رکھ کر ہمارے محدود دائروں میں مقید رہیں، اس عالمی گاروں میں یہ کیسے ممکن ہے جبکہ ہمارے معاشرتی مسائل اور مشکلات محض مقامی نہیں رہ گئے کہ ہمارے ادب میں جو طرز احساس، طرز نگارش اور حسیت ہے، وہ بھی عالمی تناظر میں جلوہ گر ہوں کہ اب ہم پوری دنیا سے قطع تعلق نہیں کرسکتے اور اگر ایسا کریں گے تو ہمارا اسلوب حیات گھسے پٹے دیمک کے سانچے میں گھٹ کر دم توڑ دے گا۔ ایک ایسی یکسانیت کا شکار ہوجائے گا جو ناقابل برداشت ہوگی آج ہمارا ادب جن دشوار گزار راہوں سے گزر رہا ہے، اس میں مغرب کی تقلید اندھا دھند انداز میں ہو رہی ہے بلکہ شعوری اور دانستہ طور پر اور میرے نزدیک یہ انتہائی دانش مندانہ اور صحت مندانہ قدم ہے۔۔

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں! ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

(پروفیسر ضیاء سے گفتگو بے شک طویل ہوگئی لیکن خوشی ہے کہ "سخن ور" کے قارئین کو معلومات کا بیش بہا خزانہ بھی ان سے عطا ہوا ہے۔ سلطانہ مہر)

عکسِ فن

رحمت کونینؐ کے حضور

کون ہے روحِ ہر دو سرا
بزمِ کون و مکاں کس کی خاطر ہے آراستہ
کس کو بخشا گیا تاجِ ختم الرسلؐ
کس کی خاطر سجائی گئی بزمِ کل
کون خالق کا مطلوب و مقصود ہے
کس کے پیکر میں نورِ خداوند موجود ہے
جس کو کہتے ہیں آئینہ مدعا کون ہے
کون ہے مظہرِ کبریا، جانِ ارض و سما کون ہے
کس نے فاراں کی چوٹی پہ اعلانِ وحدت کیا
کون ہے، جو مجسم ہے رحمت ادا
قاصدِ معتبر کون ہے
ہے، جو خیر البشر کون ہے
نام پر جس کے انسان و جن و ملک
از زمیں تا فلک
از سما تا سمک
پڑھتے رہتے ہیں صدیوں سے صلِ علیٰ
کون ہے وہ بھلا
دل سے آئی صدا مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ

میرے پڑوسی نے اپنی دیوارِ کبر و نخوت کو ڈھایا جب سے
شجر انا کا تھا میرے آنگن میں میں نے فوراً گرا دیا ہے

ضیاء الحق قاسمی
12.1.98

Ziaulhaq Qasmi
A-205, Ghaziani Heights
Scheem 33, Main University Road,
Karachi-75270, Pakistan

ضیاء الحق قاسمی

کراچی

ضیاء الحق قاسمی کو سچ بات سلیقے سے کہنے کا ہنر آتا ہے۔ گو وہ مزاحیہ انداز میں معاشرتی ناہمواریوں کی نشاندہی کرتے ہیں مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ اس میں پھکڑپن کا تاثر نہ ملے۔ اور یہی ان کے کلام کی خوبی ہے۔ ان کے کلام میں ابلاغ کی نئی جہتیں ہیں اور ان کی ذہنی رسائی محرومیوں کے احساس کو نئے سانچے میں ڈھال کر کلام میں ندرت پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔۔

حج ادا کرنے گیا تھا قوم کا لیڈر کوئی
سنگ باری کے لئے شیطان کی جانب گیا
ایک کنکر پھینکنے پر یہ ندا اس نے سنی
تم تو اپنے آدمی تھے تم کو آخر کیا ہوا

ضیاء الحق قاسمی 5 مئی 1935ء کو امرتسر (مشرقی پنجاب ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور قرات سیکھی کیونکہ گھر کا ماحول کٹر مذہبی تھا۔ وزیر آباد پنجاب پاکستان سے میٹرک کیا اور گریجویشن کراچی سے کیا۔ فاضل فارسی کا امتحان لاہور سے دیا۔ شاعری کے علاوہ کالم نگاری سے دلچسپی ہے۔ کہتے ہیں "میں شاعری میں اکبرالہ آبادی کے جانشین دلاور فگار (مرحوم) اور سید ضمیر جعفری سے ہمیشہ سے متاثر ہوں مگر شاعری کا رنگ ڈھنگ میرا اپنا ہے۔"

صنف شاعری میں غزل، نظم اور قطعات تینوں پسند ہیں اور تینوں اصناف میں اظہار

کرتے ہیں۔ نثری نظم پر اظہار خیال کے سلسلے میں کہتے ہیں..... ”قمر جمیل صاحب سے رجوع کیا جائے کہ وہ خود کو اس کا بانی کہتے ہیں“۔ ضیاء صاحب کا کلام روزنامہ جنگ ‘نوائے وقت ‘ جسارت ‘خبریں ‘شگوفہ ‘ سیارہ ‘معاصر ‘ماہ نو‘ اور دیگر جرائد میں شائع ہوتا ہے۔

ان کی تصانیف میں رگ ظرافت (طنزیہ و مزاحیہ شاعری) ہرے بھرے زخم (سنجیدہ شاعری) چھیڑ خانیاں (منظوم خاکے) ضیاء پاشیاں (اخباری کالم) اور ضیائے حق (شعراء کی نظموں کا مجموعہ ء انتخاب) شامل ہے۔ ان دنوں ماہنامہ ظرافت اور ماہنامہ خاکے اور کارٹون کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اردو کے مستقبل سے ضیاء قطعی مایوس نہیں۔ بڑے اعتماد سے انہوں نے کہا کہ ”میرا دنیا کے بیشتر ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے ہر جگہ اردو کا ہی چلن دیکھا ہے۔ یہ یقیناً“ ایک بڑی زبان ہے۔ اس زبان کو کسی کی سرپرستی کی بھی ضرورت نہیں۔ دنیا میں یہ اپنا مقام خود بنا رہی ہے کیونکہ یہ عوام الناس کی زبان ہے۔ دوسری زبانوں کے مناسب الفاظ اس میں شامل ہوتے رہنا چاہئیں اور لسانیات کے ماہرین کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہئے کہ الفاظ کی صحت اور معیار کا خیال رکھیں۔

مشاعروں اور تخلیقی نشستوں کے حوالے سے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا..... ”دونوں ہی وقت کی ضرورت ہیں۔ مشاعرے عوام الناس کے لئے اور تخلیقی نشستیں خواص کے لئے لیکن اب مشاعرے ایک کاروباری حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ بیرون ملک جو منتظمین شعراء کو بلاتے ہیں وہ انہیں پابند کرتے ہیں کہ بغیر منتظمین کی اجازت وہ کسی اور کی نجی محفل میں شرکت نہ کریں۔ اس طرح اردو کی خدمت تو کیا ہوتی ہے۔ ہاں گروپ بندی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے گذشتہ سال لاس اینجلس کے عالمی مشاعرے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایک شاعر مشاعرے کے بعد ایک شاعرہ کی کتاب کی اختتامی تقریب میں شریک ہوئے۔ نتیجے میں منتظمین نے انہیں واپسی کے ٹکٹ سے محروم کر دیا اور صاحب کتاب شاعرہ نے ان کی واپسی کا ٹکٹ ادا کیا۔“

اس قسم کا واقعہ نیویارک کے عالمی مشاعرے میں بھی رونما ہوا لیکن وہاں معاملہ سلجھا لیا گیا۔ اس مسئلے کا حل یہ ہونا چاہئے کہ شعراء کو ایک کنٹریکٹ کے ذریعے پہلے سے وضاحت کے ساتھ پابند کر دیا جائے کہ وہ جس کے بلاوے پر آئے ہیں‘ ان کے مشاعرے سے قبل وہ کسی اور کی شعری محفل میں شریک نہ ہوں۔ ظاہر ہے جو منتظم ٹکٹ دے کر بلائے گا اس کا مشاعرہ متاثر نہیں ہونا چاہئے لیکن مشاعرے کے اختتام پر شاعر کو قید نہ کیا جائے کہ وہ کسی اور محفل میں شریک نہ ہو۔

ضیاء الحق قاسمی کے خیال میں ادب سے قاری کا رشتہ کمزور نہیں پڑا اور نہ ادب بے اثر

بنا ہے۔ ہمارے ہاں آج بھی وہ ادب لکھا جا رہا ہے، جس کی جڑیں ہماری دھرتی میں گڑی ہیں البتہ رسائل و جرائد اور کتب کی خرید بوجھ بنتی جا رہی ہے۔

مغربی رجحانات در آمد کرنے کے سوال پر انہوں نے کہا.... "یہ کوئی بری اور قابل مذمت بات نہیں۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے۔ ہر زبان کے ترجمے ہمارے ادب میں شامل ہونے چاہئیں۔ اگر ہمارے ادب میں جان ہے تو وہ قاری کو متاثر کرے گا۔ آج دنیا سمٹ رہی ہے۔ بیرونی فیشن بھی ہمارے ادب کو ہمارے کلچر کو متاثر کریں گے اور ہمیں کھلے دل سے انہیں قبول کرنا چاہئے۔"

پچھلے دنوں ایک المیہ یہ ہوا کہ 21 جنوری 98ء بروز بدھ پاکستان کے نامور مزاح گو شاعر دلاور فگار اچانک دل کی دھڑکن بند ہو جانے کے سبب انتقال کر گئے۔ اس موقع پر دوران گفتگو ضیاء الحق قاسمی نے بتایا کہ انہوں نے اپنی بزم ضیائے ادب کے تحت 1986ء میں حیدر آباد سندھ میں محترم رئیس امروہوی (مرحوم) کی صدارت میں جناب ضمیر جعفری اور دلاور فگار کو بالترتیب بابائے ظرافت اور شہنشاہ ظرافت کے خطابات سے نوازا۔ اس جشن میں انہیں تعریفی اسناد پیش کی گئیں۔ ان کے سر سندھ کی روایتی پگڑی باندھی گئی اور تب سے یہ دونوں مایہ ناز معروف شاعر انہی القابات کے تحت یاد کئے جاتے ہیں۔ قاسمی صاحب نے اکبر ثانی شہنشاہ ظرافت دلاور فگار کی رحلت کے موقع پر اپنے ان اشعار کا نذرانہ پیش کیا۔

مزاح و طنز کی محفل سجانے کون آئے گا
دکھی انسانیت کو اب ہنسانے کو آئے گا

ظرافت کے سمندر کا وہی تو اک شناور تھا
ہماری ڈوبتی کشتی بچانے کون آئے گا

ظرافت کی صباحت اور ملاحت اس کے دم سے تھی
نقاہت اپنے چہروں سے مٹانے کون آئے گا

ضیاء کی عمر ساری اب تو رو رو کر ہی گزرے گی
اسے اب دیکھتے ہیں چپ کرانے کون آئے گا

عکس فن

غزل

یہ بادل کل سے پھر منڈلا رہے ہیں
ارے چھوڑو یونہی بہکا رہے ہیں

یہ رستہ بھول بیٹھے تھے سفر میں
پرندے لوٹ کر جو آ رہے ہیں

اجڑ جائے گی محفل پھر نہ کہنا
انہیں روکو جو اٹھ کر جا رہے ہیں

یہ دعوے کیسے ان کا مان لوں میں
سیاست میں شرافت لا رہے ہیں

انا کی دھوپ سے نکلوں میں کیسے
مرے سائے تو بھاگے جا رہے ہیں

مرے سائے میں ان کو بیٹھنے دو
مرے سائے میں جو ستا رہے ہیں

سعید الظفر جعفری

(اوکلاہاما)

امریکہ کی ریاست اور خوبصورت شہر اوکلاہاما کے معروف شاعر جناب سعید الظفر جعفری اردو زبان کے ان شعراء و ادباء کے وارث ہیں، جن کے نام سے تاریخ ادب میں اردو کا چراغ روشن ہے، ان میں علی سردار جعفری، رئیس امروہوی، صادقین، ظریف، جبل پوری، سید محمد جعفری اور کمال امروہوی کا نام بھی شامل ہے۔ ان کے استاد قمر نقوی ہیں، جنہوں نے اردو اور فارسی کی تاریخ میں بقول ظفر جعفری وہ مقام حاصل کیا ہے، جو ان سے قبل خالی تھا۔ موصوف پہلے شاعر ہیں، جن کی زندگی میں ان کے اشعار پر مصوری ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ ان سے پہلے یہ مقام صرف عمر خیام اور غالب کو مرنے کے بعد حاصل ہوا ہے۔ نقوی صاحب کو اردو، انگریزی، عربی اور فارسی پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی اب تک 36 سے زیادہ کتابیں انگریزی اور اردو میں شائع ہوئی ہیں، جن میں نثر، نظم، شکاریات، ناول، سیرت وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی ایک نظم "ہمالہ" نو جلدوں پر مشتمل ہے جو ہندوستان میں محمد بن قاسم سے ضیاء الحق تک کی منظوم تاریخ ہے۔ نقوی صاحب علم کا ایک ایسا سمندر ہیں، جس کا کنارہ ڈھونڈنا یا گہرائی کا اندازہ کرنا ایک غیر معمولی بات ہے۔ یہ تاریخ، قرآن، حدیث، فقہ اور سیرت کے عالم ہیں۔ لوگ انہیں علامہ قمر نقوی کہتے ہیں۔

اپنے استاد کے بارے میں ایک شاگرد کی یہ موتی لٹاتی رائے قابل قدر ہے۔ ظفر کہتے ہیں کہ انہیں ایک حادثہ نے 1989ء میں 46 سال کی عمر میں شاعر بنا دیا۔ ان کے بڑے بھائی سید محمد جعفری جو ان کے دوست بھی تھے، ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس سانحے نے ان کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ اس وقت دل برداشتگی کے عالم میں چند اشعار کی آمد ہوئی۔۔

جب کلیجے پہ چوٹ لگتی ہے
دل سے اک آہ سی نکلتی ہے

اس زمانے میں انہیں قمر نقوی جیسی عظیم ہستی کا سہارا مل گیا۔ ان کی شفقت اور غیر معمولی قوت برداشت نے ظفر کو سہارا دیا اور یوں ظفر کی شعری آمد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جناب قمر نقوی اب بھی ان کے کلام کی اصلاح کرتے ہیں۔ ظفر جعفری کا پورا نام سعید الظفر جعفری ہے اور تخلص ظفر۔ 1943ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ 1964ء میں جامعہ کراچی سے ارضیات (Geology) میں امتیاز کے ساتھ بی ایس سی کیا۔ اس کے فوراً بعد برطانیہ اور امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے 1970ء سے 1982 تک مختلف آئل کمپنیوں میں ملازمت کی۔ 1982ء میں اپنی ایک چھوٹی سی آئل کمپنی کا آغاز کیا اور اب تک اس سے منسلک ہیں۔ امریکہ کی حکومت کے انرجی ڈپارٹمنٹ نے ان کے دس سے زائد ریسرچ پیپرز کی اشاعت کی ہے۔ ان کے والد ڈاکٹر سید ابو طالب سابق ڈائریکٹر ہیلتھ نے بمبئی سے 1922ء میں اول پوزیشن کے ساتھ ایم بی بی ایس کیا اور اعلیٰ تعلیم برطانیہ سے حاصل کی۔ والدہ ام رباب کے دو مجموعہ کلام "گریہ زبان اور سوز رباب" کے نام سے 1930ء میں شائع ہوئے۔ ظفر کی اہلیہ ثریا جعفری بیٹے عباس جعفری اور بیٹیاں فاطمہ اور زہرہ ہیں۔

ظفر کا اردو سے لگاؤ فطری ہے۔ انہیں اساتذہ کا کلام از بر تھا اور اسے ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ شاعری کے آغاز کے ایک سال بعد ان کے پاس ان کی اپنی تیس چالیس غزلیں تھیں۔ پھر ظفر چار سال کے لئے پاکستان چلے گئے تو یہ سلسلہ رک گیا۔ بمشکل چار پانچ غزلیں اور ایک نظم کا سرمایہ جمع ہوا لیکن 1994ء میں واپسی کے بعد پھر اس سلسلے کو راہ مل گئی۔

ظفر کہتے ہیں کہ شاعری نہ تو سیکھی جاسکتی ہے اور نہ ہی مارے باندھے شعر کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ شعراء میں جگر مراد آبادی، فیض احمد فیض، قابل اجمیری اور قمر جلالوی کا نام نامی نمایاں ہے۔ اقبال اور جوش کے عقیدت مندوں میں سے ہیں کیونکہ اسلام کو اقبال اور انسان کو جوش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میر، غالب اور انیس کے لئے کہتے ہیں کہ یہ اردو کے تین ایسے کلاسک شاعر ہیں کہ ان سے تمام شعراء نے فیض حاصل کیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی جدید شاعری کے موجد ہیں۔ نظیر نے ڈھائی سال قبل جو شاعری کی، اس کی تقلید موجودہ نسل کر رہی ہے۔

ظفر انیس کی شاعری کے شیدا ہیں۔ کہتے ہیں روحانیت، پاکیزگی، روانی الفاظ کی بندش اور الفاظ کی مصوری کی وجہ سے انیس نے وہ مقام حاصل کیا ہے جو کسی بھی زبان کے شاعر کو حاصل نہیں ہوا۔ ان کا مقام فردوسی، شیکسپیئر اور چوسر وغیرہ سے کہیں بلند ہے۔

ظفر جعفری کو اردو سے عشق ہے۔ یہ ظفر کی مادری زبان ہے لیکن ایسے بھی لوگ ہیں،

جن کی مادری زبان اردو نہیں مگر وہ اردو کی بقا کے لئے کام کرتے رہتے ہیں۔ مگر اکیلا چنا کیا بھاڑ بھونے گا کے مصداق "تم" اور "میں" کے تحت یہ کام نہیں ہو گا۔ یہ کام تو اجتماعی طور پر بھی کامیابی کی حدوں کو چھو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشاعرے ہماری ثقافت کے آئینہ دار ہیں اور ان سے زبان کی ترویج و اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ اس موقع پر میں اردو کے مشہور ادیب ستیہ پال آنند کی رائے کا اظہار کردوں تو مناسب ہو گا جو انہوں نے مشاعروں کے سلسلے میں اپنے مضمون اردو کی نئی بستیاں (امریکہ کے حوالے سے) میں لکھا ہے۔ یہ مضمون جنوری 1997ء کے "کتاب نما" میں شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "شمالی امریکہ میں آئے دن اردو کے مشاعرے ہوتے رہتے ہیں جبکہ ہندی کے کوی سمیلن کے بارے میں شاذ و نادر ہی سننے میں آتا ہے۔ ان مشاعروں میں مدعو کئے گئے شعراء اشتہاری طور پر مشاعروں کے مقبول شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان شعراء کو مشاعروں کی ایک لڑی میں پرو کر بڑے شہروں میں مشاعرے پڑھنے کے لئے گھمایا جاتا ہے۔ منتظمین کون ہیں؟ امریکہ کی سطح پر تو کچھ ٹرسٹ اور انجمنیں ہیں' جو یقیناً" اچھا کام کر رہی ہیں لیکن ہندوستان یا پاکستان سے ان کے ناموں کا انتخاب کرنے والے وہی اصحاب ہیں' جو ہر برس کمرشل سطح پر اسے اپنی آمدنی کا مستقل ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں کہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان مشاعروں میں ہارڈ کرنسی کی کشش سے کھنچے چلے آنے والے کچھ شاعر وہ بھی ہوتے ہیں' جن کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ جب یہ قد آور شعراء ان گلوکار شاعروں کے ساتھ جو سطحی عشقیہ اور سفلی جذبات ابھارنے والے اشعار پڑھنے میں ملکہ رکھتے ہیں' اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو ایک عجیب سا منظر پیش ہوتا ہے۔ تصور کیجئے ایک متشاعر کا یا ایک متشاعرہ کا جو لہک لہک کر ایک ماہر فن طوائف یا قوال گلوکارہ کی طرح بھاؤ بتاتی ہوئی "مرکیاں" ڈالتی ہوئی وہ غزل گاتی ہے' جس کو "تیار" کرنے میں اس نے ریہرسل کے کئی رت کاٹے۔ داد وصول کرتی ہوئی ساتھ ہی یہ اعلان کرنے سے بھی نہیں چوکتی کہ ان کی یہ غزل جس مجموعے میں شامل ہے' اس کی جلدیں بھی فروخت کے لئے ساتھ موجود ہیں۔ اب تصور کیجئے انہی محترمہ کے ساتھ اسٹیج پر جلوہ افروز برصغیر کے کسی ایک مقتدر شاعر کا جو مشاعرے کے کلچر کو زندہ رکھنے کے لئے نہ صرف ان محترمہ کو داد سے نوازنے پر مجبور ہیں بلکہ مشاعرے کے ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے خود بھی اسی قبیل اور قماش کا کلام سنانے پر مجبور ہیں۔

یہ تو ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ ڈاکٹر احمد سہیل کے سوشیالوجیکل سروے میں تو اور بھی عبرتناک تفصیل موجود ہے۔ بات کہنے کی صرف اتنی ہے کہ ان سب تفریحات کے ساتھ اگر اردو کی بقاء کے لئے سنجیدگی سے یہ ادارے نئی نسل کو اردو پڑھانے کے لئے سنڈے اسکولوں کا قیام بھی عمل میں لائیں تو یقیناً" اردو کے مستقبل سے ہماری مایوسی کے اندھیرے چھٹ

عکسِ فن

غزل

سعید الظفر جعفری

کدورت ہو اگر دل میں رہ کامل نہیں ملتی
سفر جاری بھی رہتا ہے مگر منزل نہیں ملتی

اگر چاہت دلوں میں ہو تو راہوں میں مرے ہمدم
کوئی دیوار ' کوئی شے کبھی حائل نہیں ملتی

فریب و مکر کی باتیں بہت آسان ہیں لیکن
سکون قلب جیسی شے در باطل نہیں ملتی

ہزاروں محفلیں دیکھی ہیں ہم نے رنگ رلیوں کی
محبت ہو جہاں بے لوث وہ محفل نہیں ملتی

کہاں سے لائیں بہلانے کو تیرے کوئی شئے آخر
بہت ڈھونڈا ہے دنیا میں مگر اے دل نہیں ملتی

خدا کی معرفت پائی تو طوفانوں میں پائی ہے
یہ کشتی ایسی کشتی ہے لب ساحل نہیں ملتی

اگر ہو ہم سفر اچھا تو منزل جلد آتی ہے
اگر ہو وہ برا تو پھر ظفر منزل نہیں ملتی

زندگی بھر کی کمائی یہی مصرعے دو چار
اس کمائی پہ تو عزت نہیں ملنے والی

افتخار عارف
۲۶-۱-۹۸ء

Iftikhar Arif
H-4/8
Pitras Bukhari Road
Islamabad, Pakistan

افتخار عارف

اسلام آباد

قصہء دو درویش میں سے ایک درویش اپنی داستان کے ایک باب کو وا کرتے ہوئے کہتی ہیں۔ بہت پہلے یعنی ربع صدی پہلے کا قصہ ہے، جب میں پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام "کسوٹی" میں قریش پور کے ہمراہ بیٹھی تھی۔ میرے سامنے دو دانشور افتخار عارف اور عبید اللہ بیگ تھے۔ وہ میری فراست کا امتحان لے رہے تھے کہ میں "بوجھو تو جانیں" کا جھومر ماتھے پر سجائے کس شخصیت کو ان کی پرکھ کی کسوٹی پر رکھتی ہوں۔ میں نے مولانا محمد حسین آزاد کے استاد مولوی علی بخش کو پوچھا تھا۔ بیس سوال ختم ہو چکے تھے اور میرے چہرے پر میری پہلی "جیت" کی افشاں دمک رہی تھی۔

پھر غالباً سال دو سال بعد میں دوبارہ کسوٹی پروگرام میں مدعو تھی۔ اس بار میزبان قریش پور کی بجائے حمایت علی شاعر تھے۔ میں نے اپنے ہیرو حسن ناصر کو پوچھا تھا۔ بیس سوال ختم ہو رہے تھے۔ بیس سوال ختم ہو گئے.... اب بھی وہی دونوں دانشور کچھ حیرت میں کچھ افسوس میں ہاتھ مل رہے تھے کہ وہ حسن ناصر کو بوجھتے بوجھتے رہ گئے اور میں اپنی جیت پر خوش تھی بے حد خوش کیونکہ انہوں نے تو ممتاز مفتی کے بقول ان کا بھی پھلکا اڑا دیا تھا اور آج پھر میں اسی طرح کی خوشی سے ہم کنار ہوں۔ ایسی سچی خوشی کم کم نصیب ہوتی ہے۔ یہ خوشی بس ایسی ہی ہوتی ہے جیسے لہروں پر ہاتھ مارتے ہوئے ایک سچے موتی سمیت کوئی سیپ ہاتھ لگ جائے۔ اب کے بھی میری ملاقات بعد مدت ادب کی ایک بے حد معتبر شخصیت سے ہوئی ہے۔ بہت طویل مسافت کے بعد شاعری کے سمندر سے ایک آبدار گوہر دستیاب ہوا ہے۔ دوسری درویش نے سانس لینے کے لئے کچھ وقفہ کو خاموشی اختیار کی اور پھر گویا ہوئیں۔ اس پہلے

درویش افتخار عارف کو میں نے اس ملاقات کے بعد سے ازبر کرنا شروع کیا۔ (افتخار عارف کو درویش میں نے ہی نہیں کہا۔ ممتاز مفتی (مرحوم) اسے پہلے ہی "بوریا نشیں" کا خطاب دے چکے ہیں) پھر میں ان کے اس شعر۔

تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان بہت شرمندہ ہیں

سے لے کر ان کے نواسے اظہر محمود کی ولادت پر ان کے اس الہام۔

اچانک کیسی روشن ہوگئی ہے رات میری
محمدؐ کے نواسے کی غلامی کا تصدق
مرے معبود نے آگے بڑھادی بات میری

ان کے خوشبو بکھراتے حرف حرف سے مالائیں گوندھ کر شاعری کے ایوان سجاتی اور مہکاتی رہی اور پھر..... دوسری درویش کچھ اور کہنے کو تھیں کہ ہم نے قلم دان سلطانہ مہر کے سامنے رکھ دیا۔ سلطانہ مہر نے سخن ور حصہ سوم میں شرکت کے لئے عارف افتخار کو مدعو کیا تھا اور عارف تھے کہ اپنی بیورو کریسی مصروفیات میں سے وقت ہی نکال نہ پاتے اور سلطانہ مہر کے بقول پاکستانی شعراء کے اس تذکرہ سوم کی محفل عارف کی شرکت کے بغیر ادھوری رہتی چنانچہ دوسری درویش کی مدد کام آئی۔ عارف آئے' انہیں آنا ہی تھا۔ سچے دوستانہ جذبات بھی تو جادو جگاتے ہیں۔

افتخار عارف کے اشعار میں بھی ایسا ہی جادو چھپا ہے جو دل کے نہاں خانوں میں جا اترتا ہے اور نرم ونازک لطیف جذبوں کو اس طرح چھولیتا ہے کہ روح اس کے نشے سے سرشار ہوجاتی ہے۔ جھوم اٹھتی ہے۔ اس کا اعتراف ڈاکٹر طاہر تونسوی بھی کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ "افتخار عارف کے شعر پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ ایسا شعر تو میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں مگر مجھے قسم ہے پیدا کرنے والے کی کہ جس کے قبضہ ء قدرت میں میری جان بھی ہے اور میری زبان بھی' میرا علم بھی ہے اور میرا قلم بھی...... میں نے افتخار عارف کی غزل کے ہر شعر میں ایک نیا اور تازہ ذائقہ محسوس کیا ہے اور مجھے یوں لگا ہے کہ جیسے اس موضوع پر میں نے پہلی بار ایسا شعر پڑھا ہے اور یہی افتخار عارف کا کمال ہے اور اس کے اظہار ہنر کا جواز افتخار بھی کہ اس نے اپنے دیئے خود روشن کئے ہیں اور انہیں خود ہی روشنی عطا کی ہے۔"

افتخار عارف کو جینے کا سلیقہ آتا ہے اور بات کہنے کا ہنر بھی۔ ہجرتوں کے دکھ اس نے بھی سے ہیں مگر بے بسی کا رونا رو کر اور ترحم کی تصویر بن کر نہیں' وہ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں۔

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

اور

ذرہ ہوں منسوب ہوا یوں مہر کے ساتھ
روشن رہنا مجھ پر واجب آتا ہے

زندگی کی تلخ خامیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عارف کو ان کے نانا جان کی محبت نے دیا تھا کیونکہ وہ خود بھی محنت کش تھے اور محنت سے کمائی ہوئی روٹی کی لذت سے آشنا تھے۔ پھر سونے پہ سہاگہ ان کی علم سے محبت تھی۔ عارف نے یہی کچھ ورثہ میں پایا۔ اس نے کمیٹی کی لالٹین کی دھندلی روشنی میں کسب نور کیا۔ روکھا سوکھا کھا کر بھی کتاب سے دوستی برقرار رکھی۔ حامد اللہ میرٹھی اور علی عباس حسینی جیسے اساتذہ اسکول میں ملے تو کالج اور یونیورسٹی میں احتشام صاحب، ڈاکٹر شبیر الحسن اور غلام مصطفیٰ علوی کا ساتھ تھا۔ پروفیسر مکرجی فلسفے کے عظیم استاد جو عالمی شہرت رکھتے تھے، ان سے ہندو سوشل سسٹم پڑھا اور یوں افتخار نے لکھنؤ یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ماسٹرز کیا۔ اس لکھنؤ سے جس کی چھاتی پر 21 مارچ 1943ء کو افتخار نے جنم لیا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد یاور مہدی (جو دوسروں کی مدد کے لئے ہمیشہ ہی کمربستہ رہتے ہیں) کی کوششوں سے ریڈیو پاکستان میں آڈیشن ہوا اور انہوں نے خبریں پڑھنا شروع کیں۔ یہ 1965ء کا زمانہ تھا، جب افتخار 22 سال کے تھے۔ انہیں یہیں ان کے دو پیارے پیارے ذہین دوست ملے۔ عبید اللہ بیگ اور قریش پور۔ یہیں سے "کسوٹی" کی تکڑم نے جنم لیا۔ پھر 1968ء میں جب کراچی ٹی وی کا آغاز ہوا تو ریڈیو کے سلیم گیلانی اور ٹی وی کے اسلم اظہر نے ان کی صلاحیتوں کو آزمایا اور یوں پاکستان ٹیلی ویژن کو اس وقت کے تین بہترین دماغوں کی سرپرستی نصیب ہوئی کہ پھر ان کے بعد پاکستان ٹی وی یتیموں، یسیروں کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔

سینئر پروڈیوسر اور اسکرپٹ رائٹر کا عہدہ چھوڑ کر 1977ء میں ٹی وی کو الوداع کہہ کر عارف لندن کے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس میں آفیسر تعلقات عامہ کا کردار ادا کرنے پہنچے۔ وہاں اردو مرکز کی بنیاد ڈالی جس کے نگراں الطاف گوہر اور مشتاق قمر ڑسٹی تھے۔ چیرمین آغا حسن عابدی تھے۔ یورپ میں کہا جاتا تھا کہ پاکستان و ہندوستان کے بعد برطانیہ اردو کا تیسرا بڑا مرکز ہے کیونکہ بلاشبہ اردو مرکز کے ذریعے اردو زبان کی ترویج کے لئے بے اندازہ خدمات ادا کی گئیں۔ 1980ء سے 1990ء تک افتخار نے تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن میں بی بی سی آئی کے نمائندے کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ 19 مئی 1991ء سے جولائی 1995ء تک ڈائریکٹر جنرل اکیڈمی ادبیات پاکستان رہے۔ 9 فروری 1995ء سے تاحال بحیثیت چیرمین مقتدرہ قومی زبان (کابینہ ڈویژن) اسلام آباد سے وابستہ ہیں۔

ان کے پہلے شعری مجموعہ "مہر دو نیم" کو 1984ء میں پاکستان رائٹر گلڈ آدم جی ایوارڈ ملا۔ اس کتاب کے تیرہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کو نیشنل ہجرہ ایوارڈ 1403ء ہجری بہترین شاعری کی سالانہ کتاب کے طور پر بھی ملا ہے۔ 1988ء میں فیض انٹر نیشنل ایوارڈ برائے شاعری دہلی (بھارت) کی عالمی اردو کانفرنس میں ملا۔ تمغہ حسن کارکردگی برائے ادب 1989ء میں صدر پاکستان کی جانب سے یوم آزادی کے موقع پر ملا۔ 1994ء میں وثیقہ اعتراف ہمدرد فاؤنڈیشن 1995ء میں، نقوش ایوارڈ برائے شاعری اور 1996ء میں بولان انٹر نیشنل میرٹ ایوارڈ برائے سال کا بہترین شاعر اس کے علاوہ ہیں۔ ان کی نظموں کے ترجمے انگریزی کے علاوہ روس، جرمن اور دیگر زبانوں میں بھی کئے جا چکے ہیں۔ عارف کے کلام کا دوسرا مجموعہ "حرف باریاب" 1994ء میں شائع ہوا ہے۔

آپ کو بھی کبھی عارف کی گفتگو سننے کا موقع ملا ہو گا۔ ممتاز مفتی کہتے ہیں جیسے برکھارت میں بادل...... یعنی رم جھم ہلکی ہلکی ہو تو بھی شرابور کر دے کیونکہ ان کے برتاؤ میں روایتی کلچر کی مٹھاس ہے۔ پھر آج اسی روایتی کلچر کی مٹھاس سے لطف اٹھاتے ہیں لیکن سوال و جواب کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے میں آپ کی خدمت میں عارف کا ایک شعر ضرور نذر کرنا چاہوں گی کہ ماں کی عظمت کا یہ ایک بڑا ہی دل نواز اعتراف ہے اور میں بھی ایک ماں ہوں۔ ۔

دعا کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے لرزتا ہوں
کبھی دعا نہیں مانگی تھی ماں کے ہوتے ہوئے

میں نے پوچھا.... شاعری کے علاوہ اور کس صنف سخن میں طبع آزمائی کی؟ بولے.... "شاعری کے علاوہ کبھی کبھی تنقیدی نوعیت کے تاثراتی مضامین لکھنے کا اتفاق ہوتا ہے مگر میرے نزدیک یہ اس معیار کے نہیں ہوتے جیسے ہونے چاہئیں۔ تقریبات اور منصبی ذمہ داریوں کے تحت اس طرح کے مضامین لکھنے ہوتے ہیں اور اپنی بساط بھر کوشش بھی رہتی ہے کہ حق ادا ہو جائے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ میدان بہت زیادہ وقت اور بہت زیادہ توجہ اور ایک خاص وضع کی ذہنی تربیت کا مطالبہ کرتا ہے سو میں اس کو اپنا میدان نہیں سمجھتا۔"

عارف ذرا رکے پھر چہرے پر مزید سنجیدگی طاری کی اور کہا۔ "شاعری بلکہ ادب میرے نزدیک خیر کی نمائندگی سے متعلق ہے۔ میں لفظ کو اللہ کی نعمت اور انعام سمجھتا ہوں۔ اس کی توفیق ہی سے لفظ "اثر" کی نعمت سے مالامال ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "لفظ" خلق خدا کی نعمت ہوتا ہے اور اس کو خیر کے فروغ و ترویج کے راستے اور عدل و مساوات کا فیض قائم کرنے کی جدوجہد میں اور مظلوموں اور مجبوروں کے حقوق کی بحالی کی جدوجہد میں شریک کرنا ہوتا ہے۔ اجتماعی آرزوؤں اور امنگوں کی ترجمانی، اجتماعی خوابوں اور امیدوں کی صورت گری، اجتماعی مستقبل کی آئینہ بندی اہل قلم کا بنیادی فریضہ ہے۔ ذاتی روداد کا بیان کتنا ہی

اہم کیوں نہ ہو مگر ہمارے جیسے معاشروں میں ترجیحات کے اعتبار سے اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ میرے نزدیک تو آزاد ملکوں کے استحصالی معاشروں میں جب تک مجموعی انسانی صورتحال بہتر نہیں ہوتی ذاتی خدمت پر واویلا کرنا محل نظر ہے۔"

"اور عارف آپ کا کلام کن جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے؟" "میری شاعری کا بڑا حصہ فنون' اوراق' پاکستانی ادبیات' سیپ' افکار اور دیگر رسالوں کے ساتھ ساتھ "جنگ" میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ عارف نے آہستگی سے کہا۔ میرا اگلا سوال اردو زبان کے مستقبل سے متعلق تھا۔" عارف نے پر امید لہجے میں کہا۔

"اردو زبان کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو آپ دیکھیں گی کہ اس زبان نے بہت کم عرصے میں انسانی تاریخ کے شعبوں کے قبیلے میں بہت ترقی کی ہے اور اپنے ارتقائی سفر کو جس رفتار سے طے کیا ہے وہ خود ایک مثالی صورت ہے۔ اس کا چلن اور عوامی رواج عالمی سطح پر دن بدن بڑھتا جا رہا ہے جو اس کی اس بنیادی قوت نمو کی نشاندہی کرتا ہے جو قدرت کی طرف سے اسے عطا کی گئی ہے۔ عالمی سطح پر جس طرح سے اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے' وہ حیرت انگیز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ یہ صورتحال مزید بہتر ہوگی۔"

مشاعروں کے سلسلے میں افتخار نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا.... "مشاعرہ میرے نزدیک ایک معاشرتی' ثقافتی ادارہ ہے چنانچہ اس کو ایک کلچرل پروگرام ہی کی شکل میں دیکھا جانا چاہئے۔ یہ ضرور ہے کہ مشاعرے ادب کی عمومی دلچسپی رکھنے والوں میں وہ ذوق پیدا کر دیتے ہیں جو ان کو ادب کے خالص صاحبان ذوق کے حلقے میں لے جاتا ہے اور کبھی کبھی ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ شعراء کے لئے مشاعرہ بعض دفعہ مفید کم ہوتا ہے مضر زیادہ ہوتا ہے۔ بین الاقوامی معاشروں کا تسلسل ان کی معاشی اور معلوماتی صورتحال کو بہتر تو ضرور بناتا ہے مگر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت زیادہ مشاعرے بازی تخلیقی عمل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مشاعرے میں بہت شرکت کرنے والے لوگ اکثر سامعین کی پسند کا خیال رکھتے رکھتے ایک خاص طرح کی اساس شاعری کے عمل پر چل پڑتے ہیں اور ظاہر ہے اس سے ان کے تخلیقی امکانات محدود ہو جاتے ہیں۔ ادبی نشستیں جس میں تخلیق کار شامل ہوں مفید بھی ہو سکتی ہیں اور نقصان دہ بھی۔ بیس اذکار رفتہ لکھنے والے بیٹھ کر ایک دوسرے کو شعر سنا لیں تو مجموعی صورتحال خرابی ہی پہ منتج ہوگی۔ اگر دس دانش و بینش مقالے کی منزل میں ہوں تو وہ ایک دوسرے کے لئے بار آور ثابت ہو سکتے ہیں۔"

نثری نظم کے متعلق عرض کروں گا کہ "نثری نظم کا سوال اب پرانا ہو چکا ہے' جب بھی کوئی نئی صنف شعر یا ادب میں روشناس کی جاتی ہے روایتی حلقوں سے اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اصل بات دیکھنے کی یہ ہے کہ آیا نثری نظم میں وہ عناصر ہیں جو شاعری کا

لازمہ ہوتے ہیں یا نہیں۔ صرف کلام موزوں کو شعر سمجھ لینا میرے خیال میں درست نہیں ہے اور جہاں تک ادب کی موجودہ صورتحال کا تعلق ہے' اس بارے میں ایک سے زیادہ آراء دی جاسکتی ہیں۔ ادب جن قدروں کی ترجمانی کرتا ہے' وہ قوموں کی اور معاشروں کی زندگی کی ترجیحات میں کس منزل پر ہیں۔ اگر خیر کی' فروغ حسن کی' نیکی اور عدل اور محبت اور امن کی قدریں کمزور پڑیں گی اور خواب دیکھنے والے صاحبان ثروت و دولت سے ہار ماننے لگیں گے۔ چیزیں خیال پر غالب آجائیں گی' دنیا کی آسودگی دل کی آسودگی پر مقدم سمجھی جائے گی تو ظاہر ہے کہ ادب بھی کمزور پڑے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ وقتی طور پر یہ صورتحال جسے جمود و انحطاط سے تعبیر کیا جاتا ہے' پیدا تو ہوتی ہے مگر زیادہ دیر قائم نہیں رہتی۔ آخر کار حاضر و خیر کی مثبت قوتیں غالب آکر رہتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ عامہ کی یلغار نے کچھ برسوں سے ادب کو پسپا کر رکھا ہے مگر یہ صورتحال اب رفتہ رفتہ تبدیل ہو رہی ہے چنانچہ سنجیدہ ادب کی کتابوں کی اشاعت پر ایک نظر ڈالنے سے اس مواد کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔"

کوچ

جس روز ہمارا کوچ ہوگا
پھولوں کی دکانیں بند ہوں گی
شیریں سخنوں کے حرف دشنام
بے مہر زبانیں بند ہوں گی

پلکوں پہ نمی کا ذکر ہی کیا
یادوں کا سراغ تک نہ ہوگا
ہمواری ہر نفس سلامت
دل پر کوئی داغ تک نہ ہوگا
پامالی خواب کی کہانی
کہنے کو چراغ تک نہ ہوگا

معبود! اس آخری سفر میں
تنہائی کو سرخرو ہی رکھنا
جز تیرے' کوئی نہیں نگہدار
اس دن بھی خیال تو ہی رکھنا
جس آنکھ نے عمر بھر رلایا
اس آنکھ کو بے وضو ہی رکھنا

عکسِ فن

غزل

فضا میں گرد زمان و مکاں کے ہوتے ہوئے
زمیں بلند ہوئی آسماں کے ہوتے ہوئے

جہانِ خیر میں ایک حجرہ قناعت و صبر
خدا کرے کہ رہے جسم و جاں کے ہوتے ہوئے

قدم قدم پہ دلِ خوش گماں نے کھائی مات
روش روش نگہ ء مہرباں کے ہوتے ہوئے

میں ایک سلسلہ ء آتشیں میں بیعت تھا
سو خاک ہوگیا نام و نشاں کے ہوتے ہوئے

میں چپ رہا کہ وضاحت سے بات بڑھ جاتی
ہزار شیوہ ء حسنِ بیاں کے ہوتے ہوئے

الجھ رہی تھی ہواؤں سے ایک کشتی صرف
پڑی ہے ریت پہ آبِ رواں کے ہوتے ہوئے

بس ایک خواب کی صورت کہیں ہے گھر میرا
مکاں کے ہوتے ہوئے لامکاں کے ہوتے ہوئے

دعا کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے لرزتا ہوں
کبھی دعا نہیں مانگی تھی ماں کے ہوتے ہوئے

غریب شہر تو فاقے سے مر گیا عارف
امیر شہر نے ہیرے سے خودکشی کر لی

عارف شفیق

Arif Shafique
SP/1, Block-1, Maznine Floor-9,
Al-Karam Square, F.C. Area
Karachi, Pakistan

عارف شفیق

کراچی

کراچی کی سرزمین پر 31/ اکتوبر 1956ء کے دن ایک بچے نے جنم لیا' جب وہ شعور کی دنیا میں آیا تو اس نے اپنے خوابوں کی دنیا اور حقیقی دنیا میں بڑا تضاد پایا۔ وہ اکثر کسی گوشہ ء تنہائی میں بیٹھ کر سوچتا کہ میں جس دنیا کے خواب دیکھتا ہوں' وہ کہاں آباد ہے۔ پھر انسانی تاریخ کے مطالعے نے اسے بتایا کہ وہ جس دنیا کے خواب دیکھ رہا ہے' وہ اس کے ماضی کا عکس ہے۔ بہت پہلے اس کے خوابوں کی دنیا جیسی ایک دنیا اس زمین پر آباد تھی۔ اس وقت انسان کا سفر زندگی کی جانب نہ تھا۔ تب اس بچے نے سچ کا علم اٹھایا اور اپنے آپ سے عہد کیا کہ وہ ایسے سفر کرے گا جو اس زمین پر ایک انقلابی تبدیلی لائیں گے۔ اس زمین کا نظام بدلیں گے۔ اس نے کہا۔

مجھے یقین ہے عارف میں ایک سورج ہوں
ہوا کے دوش پہ رکھا ہوا چراغ نہیں

کل کا وہ سہما ہوا بچہ عارف شفیق آج کا ایک باشعور شاعر ہے۔ قائداعظم کے حکم پر 1947ء میں ہجرت کرکے پاکستان آنے والے قلم کے سپاہی شفیق بریلوی کے صاحبزادے عارف شفیق کو قلم اپنے والد سے ورثے میں ملا۔ وہ ایک طویل عرصہ تک کراچی سے ماہنامہ "خاتون پاکستان" شائع کرتے رہے۔ عارف نے اپنی کم عمری سے ہی اس کرپٹ دور اور بے راہ رو معاشرے کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ بی اے کرنے کے بعد صحافت کے رشتے سے وابستہ ہوگئے۔ ہفت روزہ سینٹرل نیوز' ماہنامہ وقت' ایشین آرٹ' اور "ماہنامہ اردو مورچہ

اور ترقی پسند" کے چیف ایڈیٹر رہے۔ آج کل ماہنامہ کرائم اسٹوری اور ادبی دنیا کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ اس کے علاوہ روزنامہ "قومی اخبار" میں ادبی کالم' روزنامہ جرات' اور پرچم میں سیاسی کالم لکھ رہے ہیں۔ حالات حاضرہ پر قطعات لکھنے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ "قومی اخبار" میں تین سال تک قطعات لکھتے رہے۔ اب دو سال سے روزنامہ "پرچم" میں قطعات لکھ رہے ہیں۔

عارف نے شاعری کے علاوہ افسانے بھی لکھے ہیں جو طلوع افکار' اخبار جہاں' منشور اور دوشیزہ ڈائجسٹ میں شائع ہوتے رہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'مٹی کے کھلونے زیر ترتیب ہے۔ 488 صفحات پر مشتمل ان کا مجموعۂ کلام "میں ہواؤں کا رخ بدل دوں گا" اور اپریل 1997ء میں دوسرا مجموعہ "مرا شہر جل رہا ہے" شائع ہو چکا ہے۔

عارف کہتے ہیں۔ "میری شاعری عوامی شاعری ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ۔

ہر ایک ہاتھ میں ہتھیار ہوں جہاں عارف
مجھے قلم سے وہاں انقلاب لانا ہے

اور یہ انقلاب لانے کا عمل ایک جہد مسلسل ہے۔ میری زندگی کا اہم ترین دن اور واقعہ وہ ہوگا' جب میرے خواب حقیقت کا روپ دھار کر اپنی منزل کو چھو لیں گے۔ ابھی تو میں اپنی کردار سازی کے عمل سے گزر رہا ہوں۔"

اردو کے مستقبل سے عارف شفیق پر امید ہیں کیونکہ اردو شاعری کی کشش اس زبان کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ شاعری کی صنف سخن میں عارف اظہار کے لئے غزل کو سب سے زیادہ موثر صنف مانتے ہیں۔ نثری نظم کے تجربے ان کے خیال میں کسی حد تک کامیاب ہیں۔ کہتے ہیں' میں بھی جو بات غزل میں نہیں کہہ پاتا' وہ نثری نظموں میں کہتا ہوں۔ میری نثری نظموں کا مجموعہ "جب زمیں پر کوئی دیوار نہ تھی" 1987ء میں شائع ہو چکا ہے۔

مشاعرے کے سلسلے میں ان کہنا ہے کہ ادب کی تخلیق میں اس اعتبار سے مشاعرے معاون ہیں کہ مختلف شعراء کو سننے کے بعد لکھنے کی تحریک ہوتی ہے۔ دور حاضر میں تخلیقی اور تنقیدی نشستیں بہت کم منعقد ہوتی ہیں لیکن ان نشستوں سے شاعری سے زیادہ افسانے' کہانیاں یا ناولٹ لکھنے میں زیادہ مدد ملتی ہے۔

ادب اور قارئین کے درمیان فاصلے پیدا ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ادب میں تجریدی تجربات نے یہ فاصلے پیدا کیے ہیں۔ اگر ادب میں ایسی تحریروں کی بھرمار ہونے لگے جو قارئین کی ذہنی سطح اور ذوق سے بہت بلند ہو کر لکھی گئی ہوں تو یقیناً" قارئین کی ادب سے دلچسپی کم ہوتی چلی جائے گی لیکن سمجھنے سمجھانے والا ادب آج بھی دلچسپی سے

پڑھا جاتا ہے۔
عارف اس دلیل سے متفق ہیں کہ بیرونی فیشن کی پیروی سے اچھا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ اپنی فکر اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ہمارے ہاں تنقید بھی مغربی ادب سے ہی آئی ہے۔ شارٹ اسٹوری کے تجربات بھی اچھے رہے۔ آزاد نظموں نے بھی اردو کے شعری سرمائے میں اضافہ کیا جبکہ نثری نظم اور ہائیکو ابھی تجرباتی دور سے گزر رہے ہیں اور یقیناً" کوئی بڑا تخلیق کار اور تخلیقی قوت رکھنے والا شاعران تجربات کو ایک تازہ اور نئی سمت دے سکتا ہے۔"
عارف کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں۔ یہ اشعار اس کی سوچ اور اس کے احساسات کا آئینہ ہیں۔۔

جو آج لکھتے نہیں سچ وہ بھول جاتے ہیں
چراغ دن میں نہیں رات میں جلاتے ہیں

محاصروں کا' گرفتاریوں کا بچوں کے
دلوں سے خوف نکلنا بہت ضروری ہے

جانے کس خوف سے گم صم سی ہیں
مائیں بچوں کو جوانی کی دعائیں دے کر

اس آگ میں جلوں گا اسی خاک میں ملوں گا
اسے کیسے چھوڑ جاؤں مرا شہر جل رہا ہے

جس نے بچوں کے ہاتھوں سے چھینے قلم کتاب
بانٹ رہا ہے شہر میں وہ ہی مہنگائی اور خوف

عکس فن

غزل

ہر ایک ظلم کا اس کے حساب کروں گا
امیر شہر کا جینا عذاب کروں گا

بسوں کا دل میں ترے میں بھی خوشبوؤں کی طرح
میں تیرے چہرے کو کھلتا گلاب کروں گا

اسی لئے تو مجھے بولنے نہیں دیتا
وہ جانتا ہے اسے لاجواب کروں گا

کتاب عشق جو لکھوں گا خون سے اپنے
میں تیرے نام اسے انتساب کروں گا

میں تیرے شہر میں ہوں سر پھری ہوا کی طرح
ہر ایک چہرے کو میں بے نقاب کروں گا

شعور دوں گا وہ محنت کشوں کو میں عارف
زمیں پہ برپا نیا انقلاب کروں گا
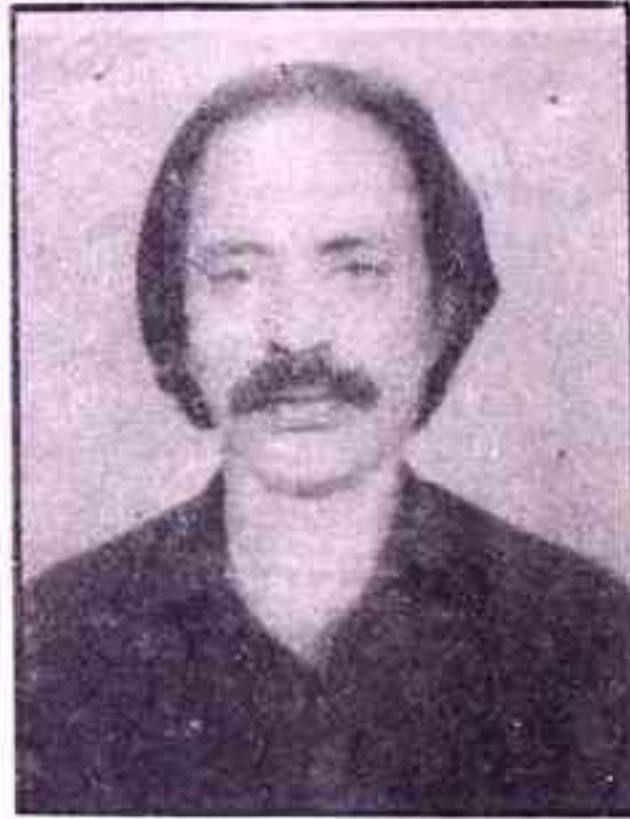
"اپنے چھوٹے بیٹے محمد سیف اللہ کے دوسری منزل سے گر پڑنے
کے دل خراش واقعے پر کہ دیکھنے والے ہجوم نے اسے معجزہ قرار دیا تھا"

فرازِ بام کوتاہی کی نخوت سے بھی پریشاں ہے
گرا تو بے گزند ایسا کہ حیرت بھی پریشاں ہے

لیاقت علی عاصم
19/7/94
کراچی

Liaquat Ali Asim
A-4, UP Centre, 11-H,
North Karachi -75850
Karachi, Pakistan.

لیاقت علی عاصم
کراچی

لیاقت علی عاصم سے میری ملاقات بہت دیر میں ہوئی مگر اپنی مصروفیات کے باوجود عاصم نے مجھ سے بھرپور تعاون کرتے ہوئے وقت دیا اور بڑے دل نشیں پیرائے میں جواب دیئے۔ عاصم 14/ اگست 1951ء کو کراچی کے جزیرہ نما منوڑا میں پیدا ہوئے۔ والد (مرحوم) حاجی علی شرگاؤ نکر نے ان کا نام لیاقت علی رکھا۔ انہوں نے بعد میں عاصم تخلص اپنایا۔ ان کا آبائی تعلق شیوردھن بمبئی (بھارت) سے ہے اور مادری زبان کوکنی ہے۔ ابتدائی تعلیم ظفر حسین پرائمری اسکول منوڑا اور بعدازاں اظہار عباسی سیکنڈری اسکول سے حاصل کی۔ میٹرک کے ایم اے اسکول کھارادر کراچی سے اور انٹر ایس ایم کالج اور اسلامیہ سائنس سے پاس کیا۔ کے پی ٹی میں سگنل مین کی حیثیت سے ملازمت کے دوران پرائیویٹ طور پر بی اے کیا۔ اس کے بعد نوکری چھوڑ کر جامعہ کراچی سے ایم اے اردو باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے پاس کیا۔

عاصم نے بتایا کہ شعر گوئی کا آغاز انہوں نے بہت کم عمری میں کیا مگر باقاعدہ غزل نویں جماعت میں 1967ء میں کہی۔ پہلا مشاعرہ این ای ڈی کالج 1969ء میں پڑھا اور اپنے کالج کی نمائندگی کی خوشی حاصل کی۔ ان کے عزیز ترین دوست اور شاعر ہم جماعت محمد صادق راز میرٹھی نے 1971ء میں "سبد گل" کے نام سے ان کا ابتدائی منتخب کلام شائع کیا اور انہیں صاحب کتاب ہونے کی سند دے دی۔ جزیرے میں رہنے کے سبب شہر کی ادبی صحبتوں، نشستوں اور مشاعروں میں بہت ہی کم شرکت کے مواقع ملے۔ 1980ء میں عاصم نے اردو لغت بورڈ میں اسکالر کی حیثیت سے کام شروع کیا اور ترقی کرتے ہوئے مدیر کے عہدے تک

پہنچے۔ 1981ء میں شادی کی سنت ادا کی اور چھ ماہ بعد شہر منتقل ہو گئے۔ ایک بیوی' دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے کفیل ہیں اور کہتے ہیں بہرحال خوش ہوں۔ ان کا دوسرا مجموعہ ء کلام شاعر دوست شاہد حمید اور معروف صحافی مجاہد بریلوی کی سرپرستی میں "آنگن میں سمندر" کے نام سے 1988ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے عزیز ترین دوست' مربی عتیق احمد کی مساعی جمیلہ کے طفیل "رقص وصال" الحمد پبلی کیشنز (لاہور) سے شائع کیا گیا۔ چوتھا مجموعہ ء کلام سال رواں میں شائع کروانے کا ارادہ ہے۔

عاصم نے سلسلہ ء کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "شاعری کے علاوہ موسیقی اور مصوری سے ان کا وراثتا" تعلق ہے۔ ایک زمانے تک گاتے اور تصویریں بناتے رہے۔ ان کے والد صاحب کے بقول عاصم سے پہلے ان کے خاندان میں شاعری کے فن سے کسی کو کبھی شغف نہیں رہا اور عاصم پہلے شاعر ہیں۔ ویسے جزیرے میں بھی کوئی شاعری نہیں کرتا تھا چنانچہ یہ اطلاع عاصم کو بہرحال تسکین نشاط پہنچاتی ہے اور اکثر سوچتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ "آخر میں شاعر کیسے بن گیا؟"

کہتے ہیں.... "میں نے شاعری کے علاوہ ادب کی کسی صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ بہت پہلے چند کہانیاں لکھی تھیں لیکن جی نہیں لگا۔ میں شاعری میں کسی نظریے کا بھی قائل نہیں ہوں۔ اس لئے ترقی پسندی' جدیدیت' رومانیت وغیرہ کی بحث میں نہیں پڑتا۔ البتہ ان کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر رکھتا ہوں اور ہر طرح کی پارٹی بازی اور گروپ بندی سے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ترقی پسندوں اور جدیدیوں سے ذاتی مراسم کے باوجود اختلاف رائے کو مثبت معنوں میں بس استعمال کرتا ہوں اور مزاجا" میرا جھکاؤ ترقی پسندی کی طرف ہے لیکن شاعری میں سب سے زیادہ شاعری ہی کا قائل ہوں۔ شاعری میری نظر میں داخلی صداقت کا جمالیاتی اظہار ہے۔ خواہ کسی صنف سخن کو اختیار کیا۔ عموما" شاعری میں انہی کیفیات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں' جن میں روح کو جھنجھوڑ دینے والی شدت ہو۔ اظہار کے بعد ابلاغ کی منزل آتی ہے اور اس منزل پر میں ابہام اور اہمال کی بھول بھلیوں سے بچنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہوں۔ کلام کی اشاعت کے سلسلے میں خاصا لاپروا واقع ہوا ہوں' لہٰذا ملکی جرائد اور رسائل میں بہت کم شائع ہوا ہوں۔ البتہ روزنامہ جنگ اور نوائے وقت میں گاہے بہ گاہے احباب کے اصرار پر تازہ تخلیقات بھیج دیتا ہوں۔ غزل میری محبوب صنف سخن ہے لیکن آزاد نظم اور ہائیکو بھی کہتا ہوں مگر صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے نہیں بلکہ تخلیقی رو کے بہاؤ میں بہہ کر کبھی کبھی اس جانب طبیعت کو مائل پاتا ہوں اور اسی شدت سے لکھتا ہوں' جس شدت سے غزل کہتا ہوں۔ دراصل میرے مزاج کو اختصار پسندی بہت راس آتی ہے اور اختصار پسندی رمزو کنایہ کا تقاضا کرتی ہے' اس لئے زیادہ تر غزل ہی کہتا

ہوں۔"

اور نثری نظم کے بارے میں کیا کہیں گے؟ عاصم سنجیدگی سے بولے...... "میں نثری نظم کا ہرگز مخالف نہیں مگر ذاتی طور پر یہ صنف مجھے پسند نہیں' آزاد نظم یوں زندہ رہ گئی کہ اسے ن م راشد جیسا شاعروں کا شاعر میسر آگیا مگر نثری نظم اب تک ایسے کسی مکمل شاعر سے محروم چلی آئی ہے۔ دو چار نظمیں ہر اچھے شاعر کے ہاں مل جاتی ہیں مثلاً" کشور ناہید' ندا فاضلی سارہ شگفتہ' قمر جمیل احسن سلیم وغیرہ کے ہاں۔ مختصراً" یہ کہ جو لوگ مغربی ادبی رجحانات سے متاثر ہیں' وہ بھول گئے ہیں کہ ان کا تعلق مشرقی تہذیب و تمدن اور معاشرت سے ہے۔ مشرق سے ہار کر مغرب کو جیتنے کی کوشش کرنا انہیں کہیں کا نہ رکھے گی اور موجودہ ادبی تاریخ گواہ ہے کہ بعض شاعر کہیں کے نہیں رہے۔ ہر انسان پر اس کے خطے کے موسمیاتی اور ثقافتی اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی مٹی ہی سے نئے گل و گلزار اگائیں اور اپنی اصناف کو اتنا وقیع اور ترجمے کے ذریعے اس لائق بنادیں کہ مغربی دنیا اسے اپنانے پر مجبور ہوجائے۔ ہم کب تک تضادات کا شکار رہیں گے۔"

تھوڑی دیر رک کر انہوں نے کہا۔ "میں اس بات کی حمایت کروں گا کہ ہمیں اپنے مسائل' حسیت اور احساس و شعور ہی کو نئے انداز میں اپنی شاعری میں جگہ دینا چاہئے اور ساتھ ساتھ مغربی ادب کا مطالعہ بھی جاری رکھنا چاہئے کہ بہرکیف خیال کی سطح پر مغربی ادب مشرقی ادب سے بہت آگے ہے۔ اب رہا سوال مشاعروں اور نشستوں کا تو ان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ آج عظیم الشان مشاعرے' میلوں' ٹھیلوں میں بدل گئے ہیں اور نشستیں انجمن ستائش باہمی کا کردار ادا کررہی ہیں۔ یہ بات میں کسی معزولی کے زیر اثر نہیں کہہ رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہر دو جگہ میری شاعری نے سامعین کو متوجہ کیا ہے۔ میں اجتماعی صورتحال کی بات کررہا ہوں۔ کراچی شہر اپنی وسعت اور وحشت میں اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ اب اس کی واپسی کا بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔ سیاست ہماری جڑوں میں بیٹھ گئی ہے اور ہم صرف اپنے نکتہ ء نظر کے حامی آدمی کا نام لیتے ہیں خواہ وہ تخلیقی سطح پر کتنا ہی کم درجہ کیوں نہ ہو۔ لہٰذا میرے خیال میں مشاعرے ادب کی تخلیق میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کرتے۔ البتہ ان سے تھوڑی بہت ادب کی ترویج میں معاونت مل جاتی ہے۔ ہزاروں لوگ مشاعروں میں صرف تفریح کی غرض سے شریک ہوتے ہیں اور اپنے ویک اینڈ کی فرصت کو رنگین بنالیتے ہیں مگر مجھے پورا یقین ہے کہ انہی ہزاروں میں سے دو چار ضروری ایسے نئے لوگ ہوتے ہوں گے جو مشاعروں کی حد تک سہی ادب سے بے خیالی میں اپنا تعلق جوڑ لیتے ہوں گے اور رفتہ رفتہ کتاب کی طرف آتے ہوں گے۔"

ادب سے قاری کے رشتے کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے کہا...... "اور پھر ہمارے ملک

میں خواندگی کا تناسب ہی اتنا شرمناک ہے کہ اگر کوئی دو روپے والا اخبار ہی پڑھ لے تو بہت ہے۔ بھلا ادب پڑھنے کا کسی کے پاس حوصلہ یا علم کہاں۔ پھر اس زمانے میں جسے میں Disposable Age سے تعبیر کرتا ہوں۔ وی سی آر' ڈش اور کیبل سسٹم نے جہاں ہماری سماجیات' اخلاقیات وغیرہ وغیرہ کو تہس نہس کردیا ہے' وہیں قاری اور کتاب کے درمیان ایک تھکا دینے والا فاصلہ پیدا کردیا ہے۔ اس ایزی گوئنگ (Easy Going) معاشرے میں معاشی مسائل' زندگی کی بنیادی سہولتوں کا فقدان اور روزگار کے مصائب اور اسی طرح کے کتنے ہی آسیب ہیں جو ہمیں ادب سے دور رہنے پر مجبور کرتے ہیں اور ہمیں جنگل کا آدمی بنانے پر تلے ہوئے ہیں مگر میرا دعویٰ ہے کہ ان باتوں سے نہ ادب بے اثر ہوتا ہے اور نہ مرتا ہے۔ لکھنا جن کی مجبوری ہے' وہ لکھتے رہتے ہیں اور جنہیں مطالعے کا شوق ہے' وہ کتاب سے اپنا تعلق باقی رکھتے ہیں۔"

اردو کے مستقبل کے بارے میں عاصم بہت پرامید ہیں' بہت جوش سے بولے۔ "چونکہ اردو دنیا کی چوتھی زبان تسلیم کی جاچکی ہے تو ہمیں اس کے مستقبل کے بارے میں خوش گمان رہنا چاہئے کہ یہ آئندہ دنیا کی نمبرون زبان بن جائے گی۔ البتہ سرکاری سطح پر جب تک اردو کو بحیثیت قومی زبان اس کا جائز حق نہیں مل جاتا' ہماری خوش گمانی محض خوش گمانی رہے گی۔"

دو واقعات عاصم کی زندگی کے اہم موڑ ہیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ”میری زندگی میں یوں تو کئی اہم واقعات سرزد ہوئے ہیں مگر دو واقعات کا ذکر ضرور کروں گا کہ یہ ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں ہیں۔ اول یہ کہ 10-9 سال کی عمر میں جبکہ میں تیرنا بالکل نہیں جانتا تھا' دوستوں کے اکسانے پر بہت گہرے پانی میں (بندرگاہ کے علاقے میں) چھلانگ لگا دی۔ اتفاق سے ایک ماہر تیراک پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ ان کی گردن میری ٹانگوں میں پھنس گئی اور وہ ہڑبڑا کر سطح پر آئے پھر دوسروں نے مجھے پکڑ کر ساحل پر پہنچایا۔ اس طرح مجھے نئی زندگی مل گئی۔ دوسرا واقعہ زیادہ دل خراش اور حیران کن ہے کہ میرا دو سالہ بیٹا سیف اللہ فلیٹ کی بالکنی سے جو دوسری منزل پر واقع ہے' نیچے گرا اور اسے خراش تک نہیں آئی۔ لوگوں نے اسے معجزہ کہا۔ ڈاکٹروں نے 24 گھنٹے نگرانی میں رکھا اور تمام ٹیسٹ درست پا کر مجھ سے پوچھا کیا آپ نے اسے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ اس پر اللہ کا کرم تھا۔“

عکس فن

ہائیکو

ہجر نے کھینچا طول
بیٹھے بیٹھے ٹہنی پر
تتلی بن گئی پھول

رو کو ظلم کے پاؤں
پیڑ کو آگ لگانے سے
جل جاتی ہے چھاؤں

قاتل اندھا ہے
عینی شاید سب گونگے
منصف بہرا ہے

تتلی کی ہے بھول
شیشہ توڑ کے چومے گی
پیپر ویٹ کا پھول

خوب ہے یہ تصویر
ہاتھوں میں گلدستہ ہے
پیروں میں زنجیر
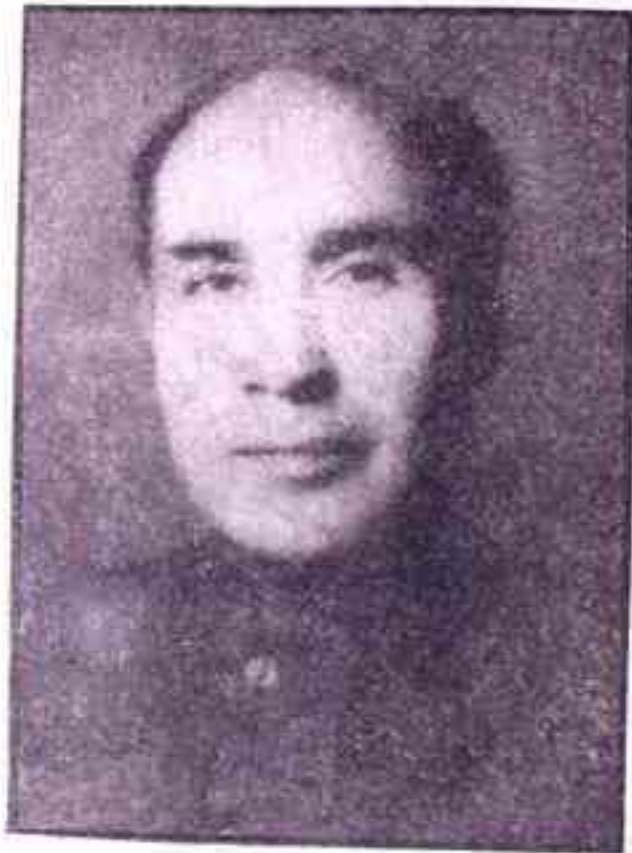
کچھ ایسے کام کر لو جو تم کو زندہ رکھیں

صدیاں کشید کر لو لمحوں کی زندگی سے

عاصی کرنالی

۳۰ جنوری ۱۹۹۸

Aasi Karnali
45 Shalimar Colony
Multan, Pakistan

عاصی کرنالی

ملتان

عاصی کرنالی سے میں کسی مشاعرے میں 1969ء کے اوائل میں ملی تھی۔ ان کا انٹرویو روزنامہ "جنگ" کراچی کے صفحہ ء خواتین پر 14 / اپریل 1969ء کے دن "آج کا شاعر" کے کالم میں شائع ہوا ہے۔ آج میں جب اپنے ان انٹرویوز کو پڑھتی ہوں تو اپنی محنت، لگن اور انتھک جدوجہد کے لئے خود ہی اپنی پیٹھ تھپتھپانے کی کوشش کرتی ہوں۔ واقعی میرا سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے کہ میں نے صفحہ ء خواتین پر بہت سے ادبی کارنامے انجام دیئے جبکہ اس وقت صفحہ ء خواتین پر صرف گھریلو سجاوٹ، باورچی خانہ کی صفائی، پکوان اور بچوں کی پرورش و تربیت کے موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ "جنگ" سے پہلے میں "انجام" میں تھی۔ وہاں بھی میں نے اپنی ایک الگ راہ بنائی۔ قلمی مشاعرے منعقد کروائے، ان کی رپورٹس لکھیں اور اس انداز میں کہ پڑھنے والوں کو گمان ہوتا تھا اور وہ فون کرکے پوچھتے تھے کہ یہ مشاعرے کس جہاز پر اور کہاں منعقد ہوئے تھے کیونکہ ایک فلمی مشاعرہ اپنے تخیل کی پرواز کا سہارا لے کر میں نے کسی فرضی جہاز کے عرشے پر منعقد کیا تھا اور اس کی رنگا رنگ رپورٹ خود مرتب کی تھی۔ روزنامہ "انجام" کی فائلیں آج اس کی گواہ ہیں۔ اس وقت میرے ایڈیٹر (طفیل احمد جمالی مرحوم کے بعد) محترم ابراہیم جلیس (مرحوم) تھے۔

پھر جب میں روزنامہ "جنگ" سے وابستہ ہوئی تو وہاں بھی میں نے انفرادیت قائم رکھتے ہوئے خواتین کی ذہنی ادبی تربیت کے لئے شعراء کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا اور خواتین سے اس ہفتے کے شاعر یا شاعرہ کے منتخب اشعار منگوائے تاکہ وہ ان شعراء یا شاعرات کا کلام پڑھیں جن کا انٹرویو اگلے کسی ہفتے شائع ہونے والا ہوتا تھا۔ یوں گھریلو خواتین کا ادبی ذوق

نکھرنے کا سامان پیدا ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ بے حد مقبول ہوا۔ اتنا کہ محترم مشفق خواجہ نے مجھے بتایا کہ جب کبھی دہلی (ہندوستان) سے ڈاکٹر مالک رام کسی شاعر کے بارے میں تفصیلات مانگتے تو مشفق خواجہ صاحب انہیں میرے انٹرویوز کی فوٹو کاپی بھجوا دیتے۔

1979ء میں، میں نے ساٹھ شعراء کے انٹرویوز مرتب کرکے "سخن ور حصہ اول" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کئے۔ اتنے ہی شعراء کے انٹرویوز "جنگ" کے صفحات پر اب بھی موجود ہیں، جن کی فوٹو کاپی میرے پاس نہیں۔ ان تمام شعراء سے میری ملاقات مشاعروں میں ہوتی تھی۔ میں تیز تیز لکھتی تھی۔ (ٹیپ ریکارڈ میرے پاس نہیں تھا) نوٹس لیتی تھی۔ مشاعرے تو محض شعراء سے ملاقات کا بہانہ تھے۔

اس ضمن میں جہاں میری جدوجہد کو دخل تھا وہیں روزنامہ "جنگ" کے خالق اور چیف ایڈیٹر محترم میر خلیل الرحمان (مرحوم) کے تعاون کا بھی اتنا ہی حصہ ہے کہ میں جوش اور لگن سے کام کرتی رہی اور خواتین کا صفحہ اتنا مقبول ہوا تھا کہ پھر اس کے بعد سے ایسی محفل کبھی جمی نہیں۔ لوگ آج بھی اس دور کو یاد کرتے ہیں۔ حوالہ دیتے ہیں اور خواتین کہتی ہیں کہ جیسے وہ صفحہ ان کے لئے ایک "انسٹی ٹیوشن" تھا۔ میر خلیل الرحمان صاحب نے ہمیشہ میرے کام کو سراہا۔ میری حوصلہ افزائی کی۔ کبھی رعونیت کا مظاہرہ نہ کیا۔ ان کی محبت شامل نہ ہوتی تو آج "جنگ" بھی اس مقام پر نہ ہوتا۔

محترم عاصی کرنالی کا وہی انٹرویو آج میرے سامنے ہے۔ اس پر عکس تحریر کے لئے انہوں نے دو شعر لکھے تھے، جو ان کی تحریر میں اس صفحہ پر درج ہیں۔۔

کب خزاں چپکے سے آجائے، سوائے فصل بہار!
آ ترے ساتھ بھی اک شام منالی جائے

ایک دن چاند کی جانب بھی چلیں گے عاصی!
جس میں رہتے ہیں وہ بستی تو بسالی جائے

سو عاصی کرنالی اپنے قلمی جہاد سے اس بستی کو بسانے کی کوشش میں اب بھی سرگرداں ہیں۔ اردو اور فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد عاصی صاحب نے 30 دسمبر 1997ء کو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان میں اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان "اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر" رجسٹرڈ (Submit) کرایا ہے۔ عاصی جی خود بھی تدریسی پیشے سے وابستہ رہے۔ مختلف مدارس نیز کالجوں میں اردو فارسی پڑھائی، پروفیسر رہے اور آخر میں ایک گورنمنٹ کالج میں پرنسپل رہ کر ریٹائر ہوئے ہیں۔

انہوں نے ایک زندگی جدوجہد میں گزاری ہے۔ 31 جنوری 1927ء کو کرنال، ہندوستان

میں پیدا ہوئے۔ نام شریف احمد ہے۔ اپنے انٹرویو میں انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ "میں تو ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا، جہاں علم کم تھا اور دولت بالکل نہ تھی۔ بچپن اس طرح گزرا، جیسے بھری پری گلیوں میں تنہا ہوں۔ یوں سمجھ لیجئے سنگ ناتراشیدہ کے درمیان کندہ ناتراش۔ ہر طرف ان پڑھ لوگ تھے۔ میرے دل و دماغ کی تختی بے نقش تھی اور شعور و خرد کا صفحہ بے حرف تھا۔ انڈے کے خول میں مطمئن اپنے گھروندے کو کون و مکاں سمجھنے والا اور پھر ماحول کا یہی جمود ایک زبردست ذہنی رد عمل کا باعث بنا۔ عاصی اپنے ماحول کے گورستاں سے نغمہء اسرافیل بن کر جاگے۔ ہائے کتنا کٹھن تھا وہ وقت جب فیس کا انتظام نہ ہونے پر اسکول سے نام کٹ گیا اور جس روز نام کٹا ہے، اس روز بھی تین وقت کا فاقہ تھا۔ والد صاحب ضعیف و فانہ نشین تھے۔ کوئی حامی و مددگار نہ تھا۔ تب یہ خود حالات کی موج تند سے ٹکر لینے کے لئے پتوار بن گئے۔ خود ہی طوفان کاٹے اور خود ہی کنارے پہنچے۔

انہوں نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہی شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کرنال کے تنہا طالب علم شاعر تھے اور اسی دور میں بزم ادب کرنال کے سیکریٹری بھی مگر ان کے شعر و ادب کی ساری پونجی پاکستان بننے کے بعد کی ہے۔ ہجرت کے سفر کا اختتام ملتان کی منزل پر ہوا اور یہاں کی مٹی نے ایسے پاؤں پکڑے کہ ملتان کے ہی ہو رہے۔

عاصی شعر گوئی کے ساتھ نثر بھی لکھتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعہ رگ جاں 1956ء، جشن خزاں 1968، جاوداں 1986، حرف شیریں، جاوداں اور کلیات تمام و ناتمام کے علاوہ نثر میں لب خنداں، چہرہ چہرہ ایک کہانی، اپنی منزل کی طرف اور چراغ نظر شائع ہو چکی ہیں۔ یہ سب افسانے، طنز و مزاح، انشائیے، خاکے سفرنامہ تحقیق و تنقید پر مشتمل ہیں۔

اپنی زندگی کے یہ واقعات تو آج تک نہیں بھولے۔ یہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ انہوں نے "مسلم لیگ" کے عنوان سے ایک نظم کہی اور مولانا ظفر علی خان کی خدمت میں لاہور بھیج دی۔ انہوں نے "زمیندار" کے خاص ایڈیشن میں سرورق پر شائع کی۔ ایک اور نظم کہی جو غالباً" جہاد کے موضوع پر تھی۔ اسے اسکول کے جلسے میں پڑھا۔ اسکول کے ایک محترم استاد نے وہ نظم ان سے لی اور اپنے نام سے رہتک کے ایک اخبار میں چھپوا دی۔ عاصی کیا کرتے؟ چپ ہو کر رہ گئے۔

اردو کے مستقبل سے نہایت پر امید ہیں۔ اس لئے کہ ان کے کہے کے مطابق اس زبان کو بسا اوقات منفی اور ناسازگار فضا اور احوال سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس کی بڑھوتری جاری رہی۔ اس میں جذب و انجذاب کی ہمہ جہت بے پناہ صلاحیت اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی اور یہ برابر فروغ پذیر ہوتی رہے گی۔ عاصی کرنالی اظہار کے لئے غزل کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں موضوعات اور مضامین کا بے حد تنوع سما جاتا ہے اور ہر جذبہ و فکر اس کی سطح

سے نمودار ہو سکتا ہے۔

نثری نظم کے لئے ان کا کہنا ہے کہ یہ کوئی صنف نہیں بنتی' نہ شعری صنف' نہ نثری صنف۔ اس کا نام ہی "ربط یک شیرازہء وحشت" ہے۔ تاہم بعض لوگ اس کے تجربے میں مصروف ہیں۔ دیکھنا ہے کہ وہ لوگ "زمین شور سنبل بر نارد" کی حقیقت کو کیسے مسترد کرتے ہیں۔

مشاعرے اور تخلیقی نشستیں پہلو بہ پہلو چلنی چاہئیں کیونکہ مشاعرے ہماری تہذیب کا حصہ ہیں۔ جب کوئی وسیلہء ابلاغ' اظہار و نشر ہمارے پاس نہ تھا' یہی مشاعرے ابلاغ فکر کا واحد ذریعہ تھے۔ چند برسوں میں ان کی افادیت اس لئے کمتر ہو گئی ہے کہ سامعین کے لئے اہل ذوق ہونے کی شرط نظرانداز ہو گئی ہے۔ معیاری شعراء اور باذوق سامعین کا تلازمہ برتا جائے تو یہ مشاعرے دوبارہ ہمارے لئے تہذیبی مظاہر کے علاوہ ہماری مجلس تربیت اور فروغ ادب کا موثر وسیلہ بن سکتے ہیں۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "ادب بے اثر نہیں ہے۔ البتہ اس کی اثر پذیری کا گراف کم ہو گیا ہے۔ ادب کا قاری کم ہو گیا ہے' جس کے اسباب میں بعض معاشی اور معاشرتی عوامل کے علاوہ ہمارے یہاں شرح خواندگی ترقی معکوس پر مائل ہے۔ زیادہ لوگ جوہر تعلیم سے آراستہ نہیں رہے۔ علم جو شعور پیدا کرتا ہے' وہی شعور نکھر کر ذوق ادب میں ڈھلتا ہے۔ تعلیم کا ہمہ جہت فروغ اور علم کی توسیع و تنقید مناسب خطوط پر ہو گی تو قاری کا رشتہ ادب سے قائم اور مضبوط ہو گا اور وہ ادب سے اثر پذیر ہو سکے گا۔

عاصی کرنالی اس رائے سے متفق ہیں کہ "ہمیں مغرب سے تکنیک ضرور سیکھنا چاہئے لیکن مسائل' حسیت اور احساس و شعور ہمارے اپنے ہونے چاہئیں۔" کہتے ہیں "بلاشبہ مغرب کے ادب کا مطالعہ ہمیں ادب کی رفتار ارتقا کا پتہ دیتا ہے اور وہاں کے تخلیقی تجربوں نے ادب کے کینوس کو بے حد وسیع کیا ہے اور ہم نے وہاں کے مطالعہء ادب سے استفادہ بھی کیا ہے اور کر رہے ہیں لیکن ہمارے اپنے تخلیقی تجربوں کا بھی ایک سفر ہے۔ اس سفر کا تسلسل بھی رہنا چاہئے۔ ہمارا اپنا مشرقی ماحول اپنے مخصوص مطالبات و متقضیات رکھتا ہے' جس کے تحت سال ہا سال میں ہمارا اپنا ایک نظام فکر و احساس' ہماری حسیت' ہمارا احساس و شعور وجود میں آیا ہے اور برابر نمود پذیر ہے۔ اسی کو عصری رو کے ساتھ آگے بڑھانا چاہئے۔ مغرب سے ہمارا اخذ و استفادہ تقلیداً" اور پیروی کی سطح پر نہیں ہونا چاہئے۔ نیز وہاں سے ہمیں صرف وہی عناصر و لوازم قبول کرنے چاہئیں جو ہمارے مشرقی تخلیقی تجربوں میں جذب ہو سکیں۔ ایک اور رخ یہ بھی ہونا چاہئے کہ ہمارے تخلیقی تجربے اتنے توانا' اتنے ہمہ گیر اور اتنے موثر ہونے چاہئیں کہ ادبائے مغرب ان کے اثرات کو قبول کر سکیں۔"

عکسِ فن

یا حسینؑ

باغِ جنت میں لبِ کوثر کھلے ہیں جو گلاب
ان کا سہرا اپنے ماتھے پر سجا لو یا حسینؑ

آج تو شادی کا دن ہے آج تو خوشیوں کی رت
آج تو اپنوں میں ہو ہنس لو ہنسا لو یا حسینؑ

آج تو خوش رنگ سا جوڑا پہن لو یا امامؑ
آج تو کپڑوں کو خوشبو میں بسا لو یا حسینؑ

سیدی! اذنِ حضوری چاہتا ہے آئینہ
سرمے کو اعزاز دو، زلفیں بنا لو یا حسینؑ

گل فشاں دستار کو سر چومنے کا دو شرف
روئے روشن پانچ لڑیوں میں چھپا لو یا حسینؑ

چاند تارے، کہکشاں رکھے ہوئے ہیں طشت میں
اس نچھاور پر نگاہِ لطف ڈالو یا حسینؑ

آسماں پر ایستادہ ہیں فرشتوں کی صفیں
یہ براتی ہیں، انہیں در پر بلا لو یا حسینؑ

انبیاءؑ تشریف فرما، سرورِ دیںؐ جلوہ گر
سب کی تسلیمات، نانا کی دعا لو یا حسینؑ

کتنی شمعیں، کتنے فانوس ایک دن بجھ جائیں گے
آج تو جی بھر کے سب شمعیں جلا لو یا حسینؑ

موتیوں سے ایک دن پر ہوں گے آنکھوں کے صدف
اس سے پہلے چار دن تو مسکرا لو یا حسینؑ

اک امانت گود میں لینی ہے شامِ کربلا
عارضی خوشیوں کو سینے سے لگا لو یا حسینؑ

زندگی بھر کر بلا کی منزلیں کرنی ہیں طے
دو گھڑی جشنِ مسرت تو منا لو یا حسینؑ

بات کچھ بھی نہیں تھی

بس

کچھ تنہائی کو نیلامیں پھوڑنا چاہتی تھیں

کہ سورج

سمندر کے سینے پہ سر رکھ کر

رونے لگا۔

عذرا عباس

(عذرا عباس)

17.10.1992

Azra Abbas
B-7, 3rd Floor, Paradise Palace
255 Sarvar Shaheed Road
Karachi, Pakistan.

عذرا عباس

کراچی

یوں تو عذرا سے سرراہے اور ادبی تقریبات میں کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر عذرا کی شخصیت کے مختلف روپ تو اس تفصیلی ملاقات میں سامنے آئے' جب وہ اپنے بارے میں بے جھجھک بتا رہی تھی اور میں سن رہی تھی۔ یوں مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خطرناک حد تک بھی سچ بول جاتی ہے اور یہی اس نے اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔ میں نے اس کے مجموعہ "میں لائنیں کھینچتی ہوں" سے فی میل بل فائٹر' مجھے تقسیم کردو اور تم ہنستے کیوں ہو کے سلسلے میں اس سے پوچھا یہ نظمیں تم نے کیوں کہیں؟ عذرا نے جواب میں مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔ ان نظموں نے تمہیں نہیں بتایا؟

ہاں ان نظموں نے تو مجھ سے بہت کچھ کہا اور یہ بھی کہا کہ اردگرد محبت کرنے والی ہستیوں کی موجودگی کے باوجود زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں' جب انسان خود کو ازلی تنہا محسوس کرتا ہے اور پھر اگر وہ بہت ہی حساس شاعر ہو تو یہ تنہائی کبھی کبھی موت کی اندھی کھائیوں میں بھی دھکیل دیتی ہے لیکن عذرا نے احساس تنہائی کے اندھیروں میں بھی شعور کے چراغ جلائے رکھے اور قلم کو تھام کر اپنی رہ گزر کو تابناکی دی۔ اس نے اس عہد میں اپنے تجربات کو نثری نظم کے پیرائے میں ڈھالا اور بے تکان لکھتی چلی گئی چنانچہ 1981ء میں عذرا کی ایک طویل نظم "نیند کی مسافتیں" کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ دوسرا مجموعہ "میز پر رکھے ہاتھ" 1987ء میں اور تیسرا مجموعہ "میں لائنیں کھینچتی رہی" 1996ء میں شائع ہوا۔ بچپن کی یاد داشتوں پر مشتمل ان کی خودنوشت "میرا بچپن" بھی شائع ہوئی ہے' جس کا انگریزی ترجمہ بھی "Kiking up Dust" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔ ایک ناولٹ "میں اور

موسی" طباعت کے مراحل میں ہے۔ اب تک پندرہ افسانے لکھ چکی ہیں اور اپنی خود نوشت کے تین سو صفحات بھی لکھ رکھے ہیں۔

عذرا 1951ء میں کانپور (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ ایک ایسے پرائمری اسکول میں تعلیم پائی' جو عذرا کے خوابوں کا الٹ تھا۔ یہ پہلی مایوسی تھی' جس نے بغاوت کے جراثیم کو طاقت بخشی۔ میٹرک کے بعد سائنس لی اور ڈاکٹر بننے کا موڈ طاری کیا مگر ساتھ ہی ایتھلٹ بننے میں لگ گئیں۔ غنیمت ہے کہ انٹر سائنس کر لیا کہ طبیعت میں ضد اور لگن بھی بہت ہے۔ والد چاہتے تھے کہ بیٹی اسکول ٹیچر بن جائے لیکن عذرا نے بی ایس سی میں داخلہ لیا کیونکہ پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں جی کھپانا نہیں چاہتی تھیں۔

گریجویشن کے بعد والد نے انتہائی سختی کے ساتھ بی۔ ایڈ کرنے کا مشورہ دیا مگر عذرا بی۔ ایڈ جیسے خشک راستے پر قدم دھرنا نہیں چاہتی تھیں۔ ابا نے یونیورسٹی جانے پر پابندی لگادی' لہٰذا عذرا نے پرائیویٹ طور پر ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ پہلے سال کی مارکس شیٹ گھر پر پہنچی تو ابا کے رویے میں نرمی آگئی۔ یوں ایک سائنس کی طالبہ نے اردو ادب میں ایم۔ اے کر لیا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے اور اردو ادب کے حوالے سے کتابوں کی چھان پھٹک میں عذرا نے اتنا پڑھ لیا کہ اس کی سوچ اور فکر کو اعتبار مل گیا۔ اب عذرا نے "جدید شاعری میں مغربی اثرات" پر ایم فل کرنے کی سوچی لیکن جس طرح کالج کی تعلیم کے ساتھ کھیل کود کے میدان میں دھما چوکڑیاں مچائی تھیں یہاں بھی نچلی نہ بیٹھ سکیں اور ایم فل کرنے کی بجائے وہ زوردار عشق کیا کہ انور سن رائے کی بیوی بن کر ہی دم لیا لیکن بیوی بننے کا مرحلہ اتنا مشکل نہ تھا جتنا بیوی بن کر نباہنے کا۔ یہیں سے عذرا کے اصل امتحان کا مرحلہ شروع ہوا۔

کہتی ہیں "جدوجہد کسے کہتے ہیں۔ زندگی کسے کہتے ہیں۔ خواب' خواب اور خواب۔ یہ ساری باتیں چار بچوں کو پالتے ہوئے اور گھر کے روزمرہ کے کاموں میں اس کے معنی از خود ملتے چلے گئے۔ لغت میں ڈھونڈنا نہیں پڑا۔ پھر حصول ملازمت کا مرحلہ میری زندگی کا اہم ترین کلائمکس بھی ہے اور اس دور کی ایک تاریخ بھی کیونکہ ایم اے کرنے کے بعد خوابوں کے دھوئیں میں دوڑتے ہوئے پاؤں نہ جانے کہاں بھگائے لئے جا رہے تھے۔ کالج کی نوکری یا پھر اور کوئی بہتر ملازمت ہی یہ خواب پورے کر سکتی تھی لیکن آہستہ آہستہ دھوئیں میں اترتے ہوئے پاؤں' زمین سے جا ٹکرائے۔ ملازمت بغیر سفارش کے ناممکن تھی۔ اتفاقاً" بھٹو صاحب کی ایک اسکیم میں خود کو بھرتی کروالیا' جس میں والنٹیئری دو سال پڑھانے کے بعد ملازمت کسی بھی کالج میں یا اسی کالج میں جس میں پڑھانا شروع کیا تھا' مل جانے کا وعدہ کیا گیا۔ دو سال گزر گئے' تین چار اور پھر پانچ سال' والنٹری 300 روپے ماہوار لیتے رہے۔ شروع کا عزم و حوصلہ کمزور ہوتے ہوتے معدوم ہو گیا تھا۔ دوسری طرف گھرداری شروع ہو چکی تھی۔ 300 روپے ماہوار میں ضرورت جواب ضرورتیں میں بدل گئی تھی ناممکن تھیں۔

بھٹو صاحب کا زمانہ ختم ہوا۔ مارشل لا لگا۔ بھٹو صاحب کی شروع کی ہوئی تمام اسکیمز ختم ہونا شروع ہوئیں' لہٰذا والنٹیئری ہم سب کام کرنے والوں کو بھی ہری جھنڈی دکھائی جانے لگی۔ خاص طور پر کالجز میں پڑھانے والی خواتین کو یہ کہہ کر نکال دیا گیا کہ یہ عورتیں گھر سنبھالیں۔

یہاں سے پہلی بار عورت ہونے کا احساس بیدار ہوا اور وہ جنگ جو عورتوں کو کچلنے والوں کے لئے ہونا چاہئے تھی شروع ہوئی' لہٰذا ایک جلسے میں یہ طے ہوا کہ اسمبلی بلڈنگ کے سامنے مظاہرہ ہوگا اور ہوا' جہاں کالجز میں پڑھانے والی عورتوں پر لاٹھی چارج ہوا۔ ایک دو ڈنڈے پڑے تو سوئے ہوئے سارے جنگ جو جذبے کلبلا کر سر اٹھانے لگے۔ دوسرے دن سر سید کالج کے سامنے بغیر یونین کے مشورے کے میں نے تادم مرگ بھوک ہڑتال کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ وہ وقت میرے لئے انتہائی ناموزوں تھا' پانچ ماہ کی بچی جس کو میں فیڈ کرواتی تھی۔ اندھا دھند فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پیچھے گھر والوں نے اسے سنبھالا اور 3 دن کی بھوک ہڑتال کے بعد شہر میں بلوا شروع ہوگیا۔ صحافیوں نے خاصا نوٹس لیا۔ اخباروں نے ساتھ دیا لیکن شروع کا مارشل لا کہ جو تاریخی حوالے سے خاصا سنگین تھا۔ ملزموں اور مجرموں کو کوڑے مارے جارہے تھے۔ مجھے اور میرے ساتھ بیٹھنے والی لڑکیوں کو گرفتار کیا گیا اور زبردستی کھانا ہمارے حلق میں ٹھونسنے کی کوشش کی گئی لیکن اب اس بے لگام گھوڑے کو پکڑنا مشکل تھا۔ خود میں اپنے بس میں نہیں تھی۔ بے ہمت' بے بسی اور ناانصافی کے منہ پر تھوکنے کا اس سے اچھا اور کوئی موقع نہیں تھا' لہٰذا یہ بھوک ہڑتال' ایک ہسپتال لے گئی' جہاں دو دن ڈرپ چڑھائی گئی۔ ضیاء الحق کو عورتوں کی ضد کے آگے جھکنا پڑا اور ہمیں پبلک ہاؤس کمیشن میں بیٹھنے اور نوکری حاصل کرنے کے احکامات جاری کئے گئے لیکن اس دوران جن ذہنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' ان کی کہانی بہت طویل ہے۔ عدالت کے چکر' خودکشی کا' مقدمہ اور ملزموں کے کٹھہرے میں کھڑے ہوکر خود کو مجرم کہلوانے منظر۔ تو یہ ہے حصول ملازمت کی کہانی۔

شاعری کے حوالے سے عذرا کہتی ہیں ”میں روایت اور جدید دونوں سے ہم آہنگ ہونا چاہتی ہوں اور دونوں سے لطف لیتی ہوں۔ رہا جدیدیت تو اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اس لئے کہ حقیقت پسندی کے ساتھ آج کے عہد میں جو کچھ لکھوں گی وہ جدیدیت کے خانے میں جائے گا۔ ہر مکتبہ ء فکر میں رکے بغیر اور ان پر اتفاق کئے بغیر نئی راہیں نہیں مل سکتیں لیکن رکنا غلط ہے۔ لکھنا وہی ہے جو اپنے عہد کا تقاضا ہے۔ ورنہ پتہ کیسے چلے گا کہ ہم کس عہد کے ہیں اور جہاں تک نثری نظم کا تعلق ہے تو شاعری میں نے نثری نظم سے ہی شروع کی۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ بھی کوئی فارم ہے۔ دراصل میں لکھنا چاہتی تھی' وہ جو میں سوچ رہی تھی اور یہ سوچیں اپنے بہاؤ میں صرف نثری نظم کا جواز پیدا کرتی تھیں۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ جب میں نے شاعری شروع کی تو دوسری طرف نثری نظم ایک تحریک کی شکل

اختیار کررہی تھی اور یہ بھی میری خوش نصیبی تھی کہ میں اس ہی راستے پر چلی' جہاں وہ سب جمع ہورہے تھے' جو اس کا اقرار کررہے تھے۔ نثری نظم میرے عہد کا تقاضا ہے۔ غزل کا اعتبار رد نہیں کیا جاسکتا لیکن اب سے دو دہائی قبل نثری نظم شاعری کی ضرورت تھی۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ خدا نے مجھے اس فارم میں ایک طویل نظم "نیند کی مسافتیں" لکھنے کی صلاحیت دی اور میں نے اس طویل نظم سے نثری نظم کو تعصب کی نظر سے دیکھنے والوں کے لئے اعتبار دیا۔ یہ نظم میں نے نثری نظم کی تحریک کے ابتدائی دنوں میں ہی لکھ دی تھی اور ہندوستان تک میں میری اس نظم کو سب نے "شاعری" مانا۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس نظم میں شاعری کا موجود ہونا ضروری ہے۔ کراچی اور ہندوستان کے معتبر رسالوں نے میری نظمیں شائع کی ہیں' تراجم کئے ہیں۔ ہندوستان کے رسالہ "شب خون" نے خاص طور پر میری نظمیں چھاپی ہیں۔

میرا خیال پہلے یہی تھا کہ مشاعرے سنجیدہ شاعری کے لئے نہیں ہیں' جہاں سننے والے کی نیت صاف نہیں ہو اور صرف گروپ بازی شروع ہوجائے لیکن اب میں سوچتی ہوں نثری نظم اپنی فضا ہموار کرسکتی ہے اگر صرف اس فارم کے مشاعرے کروائے جائیں' اس لئے کہ نثری نظم میں اب تک جو شاعری ہوئی ہے' میں سمجھتی ہوں' اس کو ہی ہم بین الاقوامی سطح پر پیش کرسکتے ہیں اور جس طرح لوگ اب مجبور ہورہے ہیں اور دوسری زبانوں میں تراجم کئے جارہے ہیں' اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس فارم کو اعتبار حاصل ہوچکا ہے۔ کچھ لوگ خائف ہوکر اس کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک دن اس میں موجود شاعری اس مخالفت کو بھی ختم کردے گی۔ رہا تخلیقی نشستوں کا سوال تو وہ بہت ضروری ہیں' اس لئے کہ ان سے ہمیں بہت جلد پتہ چل جاتا ہے کہ کیا لکھا جارہا ہے کیونکہ رسالے اس ضرورت کو اتنی جلدی پورا نہیں کرپاتے۔

ادب اور قاری کے رشتے کے حوالے سے عذرا کہتی ہیں "دراصل آج اور کل کے فرق پتہ نہیں چل سکا ہے۔ کل بہت محدود تھا اور تفریحات کی سطح پر ہم صرف ادب کو کھوجتے تھے جبکہ آج بہت وسیع ہے۔ میڈیا نے جتنے چینل تفریح کے لئے کھول دیئے ہیں اور جو آسانیاں فراہم کردی ہیں' ان کی وجہ سے نئی نسل میں رجحانات تقسیم ہوگئے ہیں لیکن یہ کہنا ناانصافی ہے کہ ادب کا قاری سے رشتہ کٹ گیا ہے ادب پڑھا جارہا ہے لیکن اس کے پھیلاؤ کے چونکہ وہ طریقے نہیں ہیں' جو ہونا چاہئیں' لہٰذا دلچسپی لینے والے ان چیزوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں جن کی پبلسٹی ہورہی ہو۔ اب رہا عمل اور ادب کا تعلق تو کوئی بھی رجحان جس میں "عمل" کا ہی عمل دخل ہوتا ہے۔ ادیب بے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر لکھنے والا عہد حاضر میں حاضر دماغی سے رہ رہا ہو۔

آخری سوال کے جواب میں عذرا کہتی ہیں ”یہ سراسر بہتان ہے بلکہ نا سمجھی ہے۔ مغرب کے رجحانات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب ہم اپنی زندگی میں تمام حوالوں سے اس رجحان میں داخل ہو چکے ہیں تو ادب میں آنا تو ناگزیر ہے۔ رہا فیشن ' یہ ایک مہمل رویہ ہے۔ دراصل فیشن نہیں کہا جاسکتا' اسے ہم زندگی کے نئے رویے اور زندگی کو نئے زاویے سے دیکھنے کا طریقہ ء کار کہہ سکتے ہیں۔ اپنے عہد کا کوئی بھی جینئس ادیب اور شاعر اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ صرف سوالوں سے کام نہیں بنتا ہے اور نہ انکار سے۔ اگر پاکستان کے نئے ادب کو تعصب کی نظر سے دیکھنے والے محبت سے پڑھیں تو انہیں صاف نظر آئے گا کہ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک عہد اور ایک زندگی کا مطالبہ ہوتا ہے۔“

عکس فن

نظم

پھانسی لگنے والے افراد سے آخری ملاقات
آخری ملاقات
سے پہلے
ان کی انگلیاں ان انگلیوں سے
ٹکرائیں
جو انہیں رخصت کرنے آئی ہوئی ہیں
اور ان کے جسم
جو لفظوں کی کتھا۔ دل کی مٹھی میں
بند کئے کھڑے ہیں
کہاں اور کیسے کا اب سوال پیدا نہیں ہوتا
بس جانے سے پہلے
آخری بار ٹکراتی ہیں

آنکھیں بھی
بیچ وبیچ
ایک لمحہ کی رفاقت میں ٹھہرتے ہوئے
پھر واپس ہوتی ہیں
کبھی واپس نہ آنے کے لئے
مڑتے ہوئے اور دور جاتے ہوئے
قدموں کے ساتھ
جو بڑھاتے ہیں وہ فاصلہ
جو ناپا نہیں جاسکتا
کیا موت آسان ہے
یا اس ملاقات جتنی مشکل
جو آخری بار کے بوجھ کو اندھیرے سے
ملادیتی ہے

حرف کی طاقت بے پایاں ہر حرف میں امکان بہت
حرف نور زندگی رہا سیکھو پھر جانے تقدیر لکھو

الیاس عشقی

Ilyas Ishqi
16/B-5 Latifabad,
Hyderabad-71800 (Sindh)
Pakistan.

الیاس عشقی

حیدر آباد ۔۔۔ سندھ

نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا انہیں شعر کہتے ہوئے اور انسانیت کو سنوارنے کے خواب دیکھتے ہوئے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

عشقی صاحب لکھنا ہے تو کوئی نئی تحریر لکھو
اب تک تم نے خواب لکھے' اب خوابوں کی تعبیر لکھو

آپ بلاشبہ عشقی صاحب کا کلام پڑھیئے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے کلام میں انسان کے خوبصورت خوابوں کی تعبیریں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ نادر روزگار تعبیرات ناقدری کی دھول تلے دبی اور چھپی ہوئی ہیں۔

میں شکر گزار ہوں۔ مسعود جاوید کی کہ انہوں نے عشقی صاحب کا پتہ مجھے دیا اور میں اس محترم شاعر تک رسائی حاصل کر سکی۔ ویسے روزنامہ "جنگ" میں آج کا شاعر کے تحت میں نے ان کا تعارف لکھا اور شائع کیا تھا مگر اب اس کی کاپی نہ تو عشقی صاحب کے پاس ہے نہ میرے پاس۔

عشقی صاحب نے میرے خط کے جواب میں مجھ سے تعاون کرتے ہوئے اپنی شفقت اور محبت کے جس قیمتی خزانے سے مجھے نوازا ہے' اس کے شکریے کا احاطہ الفاظ تو کر نہیں سکتے۔ ہاں اس تعارف کے ذریعے اگر الیاس عشقی کے جلائے ہوئے چراغ کی روشنی آپ تک پہنچا دوں تو سمجھوں گی کہ میں نے اپنے حصے کا چراغ جلا کر کچھ اور علم دوست صاحبان کے دل میں اپنے اپنے حصے کے چراغ جلانے کی جوت جگا دی ہے۔ الیاس عشقی صاحب نے لکھا ہے

کہ.....

"محترمہ السلام و علیکم اچانک آپ کا کرم نامہ ملا۔ استعجاب آمیز مسرت ہوئی۔ آپ نے یاد رکھا یہی بڑی بات ہے۔ پچھلی ملاقاتیں یاد آگئیں۔ اللہ آپ کو صحت مند اور خوش و خرم رکھے۔ صحت ایسی ہے کہ قلم پکڑا نہیں جاتا۔ بیٹھتا ہوں تو اٹھنا محال کوئی اٹھا دے تو چند قدم کسی سہارے سے بمشکل چل سکتا ہوں۔ آپ کے خط کی برکت ہے کہ قلم کی گرفت بہتر ہوئی ہے ورنہ معذرت کرنی پڑتی۔ گردن کے مہروں کا فساد ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کی جراحی کے لئے دو ایک دن میں باہر جا رہا ہوں۔ اب قلم چلنے لگا ہے تو سوال نامے کا جواب بھی لکھ رہا ہوں۔ افسوس ہے کہ آپ نے جنگ میں میرا جو انٹرویو شائع کیا تھا' وہ محفوظ نہیں رکھ سکا۔ ذہن کی حالت بھی ایسی نہیں کہ کچھ لکھ سکوں لیکن تعمیل ارشاد بھی ضروری ہے۔ جو کچھ بن پڑے گا لکھوں گا۔

میرا پورا نام محمد الیاس خان (یوسف زئی) ہے۔ تخلص عشقی ہے۔ فارسی ادب و شعر سے والہانہ لگاؤ ہے۔ ابتدائے عمر سے پڑھتا ہوں۔ ایران کے جدید (باغی) شاعر میرزادہ عشقی کی شاعری پسند تھی غالباً" اسی سے متاثر ہو کر یہ تخلص اختیار کیا ہو گا مگر اب وثوق سے کہہ نہیں سکتا۔

ہندوستان (راجستھان) کی سابق ریاست جے پور میں 26 دسمبر 1922ء کو پیدا ہوا۔ اپنی کئی خصوصیات کی وجہ سے دنیا میں "گلابی شہر" کے نام سے مشہور ہے۔ وہیں سے ہائی اسکول اور انٹر کیا۔ مہاراجا کالج سے اردو میں ایم اے پھر پاکستان آکر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے فارسی کیا۔ پشاور سے انگریزی میں ایم اے کیا اور پھر دانشگاہ سندھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ پاکستان سے قبل اپنے کالج ہی میں شعبہ اردو میں لیکچرار ہو گیا۔ 1948ء میں پاکستان آنا پڑا۔ دو سال بیکاری میں گزرے۔ ایک سال سے زیادہ والدہ کی علالت چلی۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ 1950ء میں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوا اور مختلف حیثیتوں میں پشاور' حیدر آباد' کراچی' راولپنڈی اور اسلام آباد میں متعین رہا۔ 32 سال کی ملازمت کے بعد 1982ء میں کنٹرولر کی حیثیت سے سبکدوش ہوا۔ ملک کے بڑے بڑے شعراء اور دوسرے اکابر سے ملنا ہوا۔ بعض عجب لوگ ملے' جن کی زندگی اور جن کی باتیں اب افسانہ کلام ہوتی ہیں۔ راجستھان میں تھا تو راجستھانی زبان جانتا تھا' جو شہر ہندی کا مرکز تھا وہیں سے ہندی شاعری سے دلچسپی ہوئی۔ اکثر مشاعروں میں کلام پڑھا۔ ہندی لکھنا پڑھنا دوستوں کی صحبت میں آگیا۔ ریاست کی ایک زبان برج بھاشا بھی ہے جو شاعری کی زبان بھی ہے' اس میں بھی شدبد ہو گئی۔ فارسی زبان کا گھر میں چرچا رہتا تھا' لہٰذا یہ زبان بھی سیکھ گیا۔ انگریزی پڑھی' پاکستان میں آیا تو پنجابی ادب اور شاعری سے دلچسپی ہوئی۔ کچھ لکھنا بھی شروع کیا جو رسائل میں بھی

شائع ہوا۔ اب پنجابی ادب کے منتخب مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک مضمون میرا بھی شامل ہے۔ سندھی بولی' پڑھی لکھی۔ شاہ عبداللطیف کے علاوہ تاریخ سندھ' سندھی موسیقی اور سندھی زبان پر سندھی میں لکھے گئے مضامین کئی رسالوں میں شائع ہوئے۔ شاعری بھی معتبر رسالوں میں چھپی۔ سرائیکی زبان کے متعلق مضامین لکھے۔ کبھی کبھی انہیں مضامین پر انگریزی میں لکھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ رسالہ ''زمانہ کانپور'' سے لکھنا شروع کیا پھر ادبی دنیا' آجکل' فنون' سیپ اور نئی قدریں میں مختلف مضامین شائع ہوئے۔ مضامین کی تعداد پچھتر سے کم نہ ہوگی۔ پڑھنے کا شوق ہے کتابیں خرید کر پڑھتا ہوں۔ احباب بھی اپنی کتابیں تحفے میں دیتے ہیں۔ ہم مذاق دوستوں کی صحبت میں وقت گزارنا پسند کرتا ہوں۔ جاننے والے بہت ہیں اور دوست کم ہیں مگر سب مخلص اور ہر طرح مجھ سے بہتر ہیں۔ ادبی انجمنوں اور مشاعروں میں بادل ناخواستہ شریک ہوتا ہوں۔ گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے شہروں کی سیر کی۔ تفریحی مقامات دیکھے۔ ملک سے باہر بھی کئی ممالک کا سفر کیا۔ سفرنامہ لکھنا نہیں جانتا تھا۔ متوسط خاندان سے تعلق ہے۔ زمانے کے سرد و گرم دیکھے لیکن زندگی اچھی گزری' اس کی شکایت نہیں ہے۔ اپنے متعلق گفتگو کرنا اچھا نہیں لگتا لیکن کچھ احباب نے یادداشتیں لکھنے پر مجبور کیا ہے جو ''کھلی کتاب'' کے عنوان سے لکھ رہا ہوں مگر رفتار سست ہے۔

زندگی دلچسپ لوگوں سے ملاقات اور واقعات سے پر ہے۔ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اچھے رسالوں میں میری تحریریں چھپ جاتی تھیں۔ اس زمانے میں ہندی کے مشہور شاعر (امیتابھ بچن کے والد) ہربنس رائے بچن سے ملاقات ہوئی۔ محبت سے پیش آئے۔ ایک دن بولے میرے ذہن میں نظم کا ایک عنوان ہے۔ نظم ہو نہیں رہی ہے۔ تم زود گو ہو' اس عنوان پر لکھو' عنوان دلچسپ اور شاعرانہ تھا۔ اسی رات میں نے نظم کہی' انہیں سنائی' انہیں بہت پسند آئی اور انہوں نے اپنے نوٹ کے ساتھ کئی ہندی رسالوں میں چھپوائی۔ اب میں اس نظم کو اپنے کلام میں شامل نہیں کرتا۔ پاکستان میں مولانا کوثر نیازی نے اسے رسالے کے ضخیم سالنامے میں چھاپا پھر ایک مشہور سندھی شاعر نے اسے سندھی میں منتقل کر کے رسالے میں شائع کرایا۔ دوستوں نے توجہ دلائی میں نے کہا اس نظم سے میں دست بردار ہو چکا ہوں۔ پھر کچھ دن بعد دوستوں نے مجھ سے جدید سندھی شعراء کے منتخب شعراء کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ میں نے چوبیس پچیس شعراء کے کلام کا ترجمہ کیا' جس میں مذکورہ نظم کو پھر اردو کا جامہ پہنایا اور وہ میرے مجموعے ''موج موج مہران'' میں جو انجمن ترقی اردو نے چھاپا تھا شامل ہے۔

اردو زندہ زبان ہے' زندہ رہے گی۔ اس کی تاریخ ہے' اس میں علمی' ادبی اور سائنسی

میدان میں بھی بہت کام ہوا ہے۔ کوئی اور زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن یہ بد قسمت زبان ہے' اس کی مخالفت بہت ہے اور یار لوگوں نے سیاسی مسئلہ بنادیا ہے۔ قومی زبان تو شاید یہ نہ بن سکے لیکن زبان میں اتنی جان ہے کہ یہ زندہ اور برقرار رہے گی۔ تبدلیاں ہر زندہ زبان میں ہوتی ہیں۔ اس میں بھی ہوں گی اور یہی عمل اسے زندہ رکھے گا۔

شاعری میں نظم بھی کہتا ہوں اور غزل بھی اور موضوع وہ جو اپنے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ کبھی نظم میں کبھی غزل میں۔ نظم میں آزاد نظم بھی شامل ہے۔ نئی اصناف اور نئے تجربات کے خلاف نہیں ہوں۔ نثری نظم کے ساتھ وہی ہو رہا ہے جو ابتدا میں آزاد نظم کے ساتھ ہوا تھا۔ اسے راشد' میراجی' فیض اور دوسرے بڑے مل گئے تو اردو شاعری کی اصناف میں ایک نئی اور اچھی صنف کا اضافہ ہوگیا۔ اسی طرح جب تک نثری نظم کو اچھے شاعر نہیں ملیں گے یہ بھی اردو شاعری کی معتبر صنف نہیں بن سکے گی۔

نظم کو بہر طور نثر سے تو مختلف ہونا ہے۔ اس میں وزن قافیہ نہ سہی لیکن آہنگ تو ضرور چاہئے اور آہنگ بھی اردو زبان کا آہنگ ہو کہ جس کو دریافت کرنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں اس کی بہت سی قسمیں ہیں' جیسے مرصع' مقفیٰ یا ایسی دوسری' جن کے مصنوعی آہنگ نے اردو زبان کے اصل آہنگ کو چھپادیا ہے اور اس کی دریافت آسان نہیں ہے۔

شاعری سے عمل کا کیا تعلق ہے میں نہیں جانتا اور اگر ہے ہے تو بہت دور کا ہے۔ ادب اچھے انسان اور اچھی دنیا کے خواب دیکھنا اور دکھانا اس کا عمل ہے' براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عمل کرنے والے سیاسی کاروباری' زراعت' صنعت اور زندگی کے دوسرے میدانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ادب سے تعلق لازمی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں ساری قوم انتشار کا شکار ہے' لوگ ملک کی نہیں ذاتی منفعت اور ترقی کے متعلق سوچتے ہیں۔ ادب دنیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ اس کی حیثیت' امنگیں' آرزوئیں اور خواب سب یہیں کے ہیں۔ باہر کے اثرات کو نہ روکا جاسکتا ہے نہ روکا جانا چاہئے۔ باہر کے اثرات زیادہ خود کو نمایاں کرنے کے لئے لائے گئے۔ ہر زمانے میں فیشن کا ادب ہوتا ہے' اس لئے اس سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ زندہ وہی ادب رہتا ہے' جس کا تعلق اپنی سرزمین سے ہو۔"

عکس فن

للی پٹ

یہ للی پٹ کی لیلا ہے
اس میں جو گلیور آئے گا
ہکا بکا رہ جائے گا
اس دنیا میں قد ہے کیا شے
یہ جن بونوں کی لنکا ہے
ان ہی کے نام کا ڈنکا ہے
ان میں سے ہر بالشتیے کا
قد باون گز کا ہے پورا
یہ نگری دیکھی بھالی ہے
یہ لنکا جلنے والی ہے
مجنوں ہے یہاں نہ کوئی لیلیٰ
کوئی شہزادہ ہے نہ سنڈ ریلا
سوتیلی بہنیں جتنی ہیں
اک اک بالشت کی فتنی ہیں
شہزادہ رنگ رچاتا ہے

ہر رات کو جشن مناتا ہے
سنڈ ریلا خدمت کرتی ہے
روتی ہے آہیں بھرتی ہے
جس دن بھی پری کوئی آئے گی
سنڈ ریلا بھی ناچ میں جائے گی
بہنوں کا وہاں ہوگا نہ گزر
شہزادے کی ہوگی اس پہ نظر
جب بارہ گھڑی بجائے گی
سنڈ ریلا بہت گھبرائے گی

بھاگے گی تو جوتا چمکیلا
جو پاؤں میں ہوگا ڈھیلا
سیڑھی پہ کہیں رہ جائے گا
اور سارا راز بتائے گا
یہ للی پٹ کی لیلا ہے
باون گز کے بالشتیوں کا
اس شہر پہ ہے کب سے قبضہ
یہ بات مگر ہے بالکل طے
یہ بستی کب سے سوئی نہیں
بونے ہیں گلیور کوئی نہیں
یہ نگری دیکھی بھالی ہے
یہ لنکا جلنے والی ہے
اس میں جو گلیور آئے گا
ہکا بکا رہ جائے گا
دھرتی اس دیس کی میلی ہے
اور دور افق تک پھیلی ہے
آکاش یہاں بھی نیلا ہے
یہ للی پٹ کی لیلا ہے

دلوں کے اک حسین سنگم کو جام و مینا کہا ورنہ [illegible]
تمہارے [illegible] کی آپ نے دل میں بنا لی [illegible]

مرزا عظیم بیگ
۱۷ نومبر ۱۹۹۷ء

Mirza Azim Beg
20441 Olympia
Redford, MI 48240
U.S.A

مرزا عظیم بیگ

مشی گن

میرا یقین ہے کہ ہر انسان اپنے حصے کا کم از کم ایک ہی چراغ جلادے تو پھر اس ایک چراغ سے کئی چراغوں کے روشن ہونے کی سبیل نکل آتی ہے۔ علامہ اقبال نے اسی موقع کے لئے ہی کہا ہے کہ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مرزا عظیم بیگ نے اس نکتے کو پالیا ہے۔ دیار غیر میں ایک مصروف زندگی گزارنے کے باوجود انہوں نے اردو کے نوزائیدہ پودے کو پروان چڑھانے کے لئے بیج ڈال دیا ہے اور اس کی نشوونما بھرپور طریقے سے کر رہے ہیں۔ انہوں نے ریڈ فورڈ مشی گن میں خود اردو کی تدریس کا انتظام کیا ہے۔ I.A.G.D کی مسجد میں تقریباً" 30 بچے اردو زبان بڑے شوق سے سیکھ رہے ہیں۔ ہرچند کہ یہ پروگرام بالکل نیا ہے لیکن مرزا عظیم بیگ بہت پرامید ہیں کہ اردو انشاء اللہ بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کرے گی۔ انہوں نے بتایا کہ ڈیٹرائٹ کے علاقہ میں آج کل چار مراکز میں اردو کی تدریس کا انتظام ہے۔ اردو زندہ باد، مرزا عظیم بیگ زندہ باد۔

میں اردو کے اس شیدائی کو آپ سے ملاتی ہوں، جن کا نام مرزا عظیم بیگ ہے۔ تخلص عظیم ہی استعمال کرتے ہیں۔ میرٹھ میں 1943ء میں پیدا ہوئے۔ 1950ء میں کراچی والدین کے ساتھ منتقل ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی سے بی ایس سی پھر بی ایڈ 1963ء میں کیا۔ اس کے بعد امریکہ میں University of Detroit سے ایم۔ اے 1974ء میں کیا۔ کراچی میں بی

ایڈ میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد کراچی میں ہی تدریس شروع کی۔ ویسے تو تدریس بی ایڈ سے پہلے بھی جاری تھی لیکن اب باقاعدہ معلّمی کے فرائض ادا ہونے لگے۔ کراچی میں 1956ء میں جب انہوں نے میٹرک پاس کیا تو اس وقت ان کی عمر صرف ساڑھے بارہ سال تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ عظیم سب سے کم عمر میٹرک پاس طالب علم تھے' لہٰذا جب انہوں نے پہلی بار 1960ء میں معلّمی کا ذمہ لیا تو اس وقت ان کی عمر صرف 17 سال تھی۔ ان کے کچھ طلباء (نویں اور دسویں جماعتوں میں ان سے زیادہ باعمر تھے) کراچی میں بہت کامیابی کے ساتھ ایم اے اسکول' ممتاز اسکول اور پھر آغا خاں اسکول کریم آباد میں کام کیا۔ ان اسکولوں سے بارہا طلباء نے میٹرک میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس درمیان ان کی ملاقات جناب خواجہ شہاب الدین (وزیر اطلاعات) فیلڈ مارشل ایوب خاں (صدر پاکستان) جناب عتیق الرحمان (گورنر مغربی پاکستان) اور دیگر اعلیٰ شخصیات سے ہوتی۔ کراچی میں ٹی وی پروڈیوسر آفتاب عظیم کے معاون کے طور پر ٹی وی پر کام کیا اور بچوں کے پروگرام بنانے میں ان کی مدد کرتے رہے۔ گھومنے پھرنے کا بے حد شوق تھا' لہٰذا ہر سال پورے پاکستان کا تعلیمی دورہ اسکول کے طلباء کے ساتھ کرتے تھے اور انہیں دوروں میں بڑے بڑے لوگوں سے ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

1972ء میں امریکہ چلے آئے اور یہاں بھی جلد ہی اسکول میں تدریس شروع کردی۔ چنانچہ پچھلے 25 سال سے یہاں ایک پرائیویٹ ادارے میں کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اتوار کو مسجد کا اسکول چلاتے ہیں۔ یوں ان کی زندگی بڑی مصروف ہے لیکن کہتے ہیں بہت اطمینان بخش ہے۔ اس دوران 1995ء میں اپنے 12 سالہ بچے کے ساتھ حج کو بھی گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت بھی انہیں نصیب کی۔ سچ ہے جو اللہ سے مانگے اللہ اسے ضرور نوازتا ہے۔

عظیم بیگ انکساری سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میں نہ تو باقاعدہ شاعر ہوں نا ادیب ہرچند کہ حسب موقعہ میں نظم و نثر دونوں ہی لکھ لیتا ہوں۔ میری نظمیں شروع میں اسکول کے میگزین میں چھپیں۔ پھر اخبارات میں گاہے گاہے چھپتی رہیں۔ اسی طرح نثر میں بھی مضامین چھپے ہیں۔"

ان کی زندگی کا یہ واقعہ ان کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ کہتے ہیں "میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ حج کی سعادت ہی ہے۔ یہ بھی عجب طرح سے ہوا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص مجھ کو میناروں کی روشنی دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ قریب جاکر دیکھو تو معلوم ہوگا۔ اسی ہفتہ حج کا ارادہ پایہء تکمیل کو اچانک پہنچا اور غیر متوقع طور پر ہی انتظامات ہوگئے۔

دوسرا عجیب اور پر مسرت واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ”معلمی کے شروع کے زمانے میں بارہا مجھے مشکل ہوئی کہ آنے والے مہمانوں کو باور کراؤں کہ ”میں اسکول میں طالب علم نہیں ہوں بلکہ استاد ہوں۔ شروع شروع میں ایک ٹیچر کی شادی میں جانے کا موقع ملا تو لوگوں نے پوچھا کہ یہ کس کا بچہ ہے۔ بعد میں یہ معلوم کر کے حیرت زدہ ہوئے کہ میں بچہ نہیں بلکہ خود ایک استاد تھا۔“

عظیم بیگ عموماً“ نظم لکھتے ہیں۔ خاص طور پر کسی عنوان کے تحت۔ ان کا کہنا ہے۔ ”یوں تو غزل تفریح طبع کے لئے بہت خوب ہے لیکن نظم کے ذریعے پیغام رسانی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ مشاعرے عموماً“ تفریح طبع کے لئے بھی ہوتے ہیں۔ ادبی نشستیں اردو کی ترویج میں بہت معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ ہمارے علاقہ میں ”بزم اردو“ اس سلسلے میں خاطر خواہ کام کر رہی ہے۔ میں نے خود بھی دوستوں اور عزیزوں کے بچوں کی شادی کے موقع پر نظمیں کہی ہیں جو کافی مقبول ہوئی ہیں۔ یوں ہم اردو کو بھی مقبول بنا رہے ہیں۔

مرزا کہتے ہیں..... ”یہ صحیح ہے کہ آج کل کے ٹیکنیکل دور میں ادب کافی بے اثر ہو کر رہ گیا ہے لیکن ادب معاشرتی رجحانات کی تشہیر کے لئے ضروری ہے۔ خواہ معاشرہ تکنیکی ہو یا Conservative اس کی ترویج کے لئے ایک ذریعہ کی ضرورت ہے اور ادب یہ ذریعہ مہیا کرتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ دور حاضرہ کے حالات، واقعات، احساسات اور ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ادب کو فروغ دیں تاکہ نہ تو ادب اور معاشرہ میں کچھ تضاد پیدا ہو اور نہ ہی ادب سے معاشرہ کو یا معاشرہ کو ادب سے دشمنی بلکہ ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔“

مرزا عظیم بیگ سینئر ادیبوں کے اس قول کی پوری طرح حمایت کرتے ہیں اور تائید کرتے ہیں کہ اپنی ہی ضروریات اور احساسات کے مطابق ادب کو ڈھالنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ”کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھولا“ جیسا کہ برصغیر کی فلمی دنیا اور موسیقی کو مسائل سے سامنا کرنا ہے۔ اپنی Values کو ترک نہیں کرنا چاہئے نہ ہی بنیادی اصولوں سے سمجھوتہ کرنا چاہئے۔ خیالات جہاں سے ملیں لے کر اپنے نظریات اور احساسات کے مطابق ڈھالنا چاہئیں۔

عکسِ فن

"آج اور کل"

(16 فروری 1991ء کو ڈیٹرائٹ میں یوم غالب کے موقع پر پڑھی گئی)

بنام غالب سجی ہے محفل ادب کا چشمہ ابل رہا ہے
مگر نہ پوچھو ہمارے دل سے یہ کیسے شعلوں میں جل رہا ہے

یہ آگ مغرب نے ہے لگائی' لڑایا جس نے ہے بھائی بھائی
حلیف بن کر فریب دینا' پرانا ان کا شغل رہا ہے

زباں پہ ہے رام رام ان کی' بغل میں چھریاں چھپی ہوئی ہیں
جہاں بھی مطلب انہوں نے دیکھا وہیں پہ ان کا دخل رہا ہے

ہیں ان کے ہتھیار کتنے اعلیٰ کہ آدمیت بنی نشانہ
یہود کی سازشوں کے باعث' عرب کا نقشہ بدل رہا ہے

تمام دنیا کا مال لے کر' عرب کی مٹی کو روند ڈالا
بچی کھچی جو رہی تھی عزت اب اس کا بھی دم نکل رہا ہے

عراق والے عجیب ٹھہرے مگر ہیں پھر بھی وہ اپنے بھائی
جو سینہ ان کا ہوا ہے چھلنی تو میرا دل بھی مچل رہا ہے

جو پاسبانِ حرم بنے ہیں انہیں سے میں آج پوچھتا ہوں
غریب و مفلس کے قتل و خوں پر "تمہارا بھی دل پگھل رہا ہے؟"

تمہیں غرض کیا کہ قوم مسلم پہ آج مشکل جو آپڑی ہے
حرم تمہارا سجا ہوا ہے شباب کا دور چل رہا ہے

ڈرو خدا سے کہ جس کی لاٹھی سے قوم ہاتھی بھی مٹ گئی تھی
جو اس نے چاہا تو اس کا لشکر طیور پر مشتمل رہا ہے

خدا کرے کہ ہمارے رہبر سب ایک مرکز پہ متحد ہوں
کوئی یہ مژدہ عظیم لائے کہ مہر عظمت نکل رہا ہے

شاید عظمیٰ جون ضرورت پڑ جائے
رکھ لوں اپنے ساتھ جنوں یا رہنے دوں؟

Uzmee John
864, Musjid Road,
Sibbi (Baluchistan), Pakistan

عظمیٰ جون

سبی۔۔۔۔بلوچستان

علم کی کرنیں کہیں سے پھوٹتی ہوں۔ چاہے وہ بے آب و گیاہ صحرا ہو یا اندھیرے کنوئیں کی تہہ۔ میں دوڑ لگا کر پہنچنے میں تھکن محسوس نہیں کرتی بلکہ مجھے طاقت ملتی ہے اور میرا دل مسرت بھرا سکون محسوس کرتا ہے جیسے جینے کے لئے مجھے بہت ساری آکسیجن مل گئی ہو۔

ماہنامہ مسکراہٹ لاہور کے مدیر اور بانی طفیل اختر کی معرفت میں سبی بلوچستان پہنچی اور عظمیٰ جون سے ملی۔ پاکستان کے یہ مایہ ناز فرزند 27 ستمبر 1964ء کو سبی' بلوچستان میں پیدا ہوئے۔ بی ایس سی تک تعلیم سبی میں حاصل کی۔ ایم ایس سی زولوجی میں صوبہ بلوچستان کی واحد جامعہ' جامعہء بلوچستان سے کیا اور اب پنجاب یونیورسٹی سے اپنا پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے لئے دن رات محنت کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ملازمت بھی کی کہ خود کو زندہ بھی رکھنا ہے چنانچہ 22 فروری 1987ء سے محکمہء تعلیم میں بطور لیکچرر کام شروع کیا۔ 1994ء میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر ترقی ہوئی۔ ان دنوں کوئٹہ گورنمنٹ کالج میں تعینات ہیں۔ شادی کے بندھن ابھی نہیں باندھے۔

آیئے مستقبل کے ڈاکٹر عظمیٰ جون سے گفتگو کرتے ہیں۔ عظمیٰ کہتے ہیں۔۔۔۔ "میں ادب کی ایک ہی صنف سے وابستہ ہوں اور وہ ہے شاعری۔ شروع میں چند افسانے لکھے جو شائع بھی ہوئے۔ چند ڈرامے بھی تحریر کئے جو اسٹیج کئے جا چکے ہیں مگر میں نے یہ سمجھ لیا کہ میں مذکورہ فیلڈ میں کوئی تیر نہیں مار سکتا چنانچہ انہیں چھوڑ دیا۔ میں اپنے اظہار کے لئے شاعری کو ہی موثر ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شاعری وہ ذریعہء اظہار ہے جو نامساعد حالات اور پابندیء اظہار کی صورت میں بھی رکتا نہیں۔ دنیا بھر کے مختلف ممالک میں آمریت' سول مارشل لاء' ڈکٹیٹر

شپ اور بیرونی طاقتوں کے تسلط کے باعث ناگفتی صورت حالات میں بھی سلسلہ ء سخن رکا نہیں۔ اس کے علاوہ ایک طویل مضمون بھی شاید وہ اثر نہیں دکھاتا جو ایک شعر بلکہ بعض اوقات محض ایک مصرعہ سید ھا دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔

اب جہاں تک کسی مکتب فکر سے تعلق یا متاثر ہونے معاملہ ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ۔

اپنا غالب سے تعلق نہ کوئی میر کے ساتھ

(یہاں غالب و میر سے مراد غالب و میر ہرگز نہیں) میں سیاہی چوس کی طرح ہر مکتب فکر سے اکتساب حاصل کرتا ہوں مگر کسی ایک کا ہو نہیں سکتا نہ خود پر کسی مکتب کا لیبل لگوانا چاہتا ہوں کیونکہ ایک مخصوص نظریہ' اپنے پیرکاروں کو ایک دائرے میں محدود کر دیتا ہے جو اس سے باہر نکلنے والے کو دائرہ سے خارج کر دیتا ہے جبکہ مجھے سمندر کی طرح بے انت ہونا۔ کائنات کی طرح وسیع ہونا پسند ہے۔"

بلوچستان کے مقامی اخبارات و رسائل کے علاوہ جنگ 'نوائے وقت' فنون' ماہ نو' اقدار' دستگیر' مسکراہٹ اور سویرا میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "کرچیاں سمیٹی ہیں" انشاء اللہ اس سال کے آخر میں منظر عام پر آجائے گا۔

مستقبل کے ڈاکٹر عظمی کو روز ہی ایک مزیدار واقعے سے سابقہ پڑتا ہے۔ بتانے لگے کہ میرے نام (عظمی) کو اکثر لوگ عظمی سمجھتے ہیں مگر جب ملاقات ہوتی ہے۔ تعارف ہوتا ہے تو جھینپی ہوئی مسکراہٹ ان کی غلط فہمی کا پتہ دیتی ہے۔ لوگ شاید اسی غلط فہمی کی بناء پر زیادہ توجہ سے پڑھتے ہیں مگر یہ صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہوتا بہت سے لوگ شبنم رومانی' روحی کنجاہی' ندا فاضلی وغیرہ کو بھی خواتین ہی سمجھتے ہیں۔

اردو کے مستقبل کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ مجھے تو اس زبان کا مستقبل بہت روشن دکھائی دیتا ہے۔ کسی زبان کے لئے دو چار صدی پرانا ہونا' چند دنوں کا ہونا ہوتا ہے۔ دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو ابھی "نو مولود" ہے مگر "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق اس کی اٹھان ابھی سے ایسی ہے کہ اس کا شمار دنیا کی چوتھی بڑی زبان کے طور پر ہونے لگا ہے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس کا گراف یقیناً" اوپر جائے گا۔

اظہار خیال کے لئے شاعری میں غزل اور نظم دونوں میری پسندیدہ ہیں اور زیادہ ترانہی میں اظہار کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر غزل بے حد پسند ہے اور اگر آپ مجھے غزل کا شاعر کہیں تو ٹھیک رہے گا۔ میرے خیال میں نثری نظم ایک تجربہ ہے اور جیسا کہ ہر صنف میں تجربات ہوتے رہے ہیں' اسے ہونے دیجئے۔ جس طرح غزل میں "بے قافیہ غزل" قافیہ اور ردیف کے بغیر غزل' آزاد غزل وغیرہ جیسے تجربات ہوئے ہیں' یہ بھی سہی۔ میں نظم کے آزاد ہونے کو

برا نہیں سمجھتا مگر اس کے "مادر پدر آزاد" ہونے کے خلاف ہوں
ادب کی تخلیق میں مشاعرے کی نسبت نشستیں زیادہ موثر ہیں مگر مشاعرے کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ فنکار کچھ تخلیق تو کرے مگر اس کی تخلیق لوگوں تک نہ پہنچے یا محض دو چار لوگوں تک ہی محدود رہے تو Satisfaction نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ فن محض فن کاری ہی نہیں ہوتا۔ اپنے اندر ایک پیغام بھی لئے ہوتا ہے۔ اب اگر وہ پیغام لوگوں تک پہنچا ہی نہیں تو اس کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ تخلیق نشستیں اپنی جگہ' مشاعرے بھی بہترین محرک ہیں۔
اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا یہ تاثر بالکل غلط ہے 'اب تو قاری کا ادب سے ناتہ گہرا ہوتا جارہا ہے۔ آہستہ آہستہ عوام میں مطالعے کا...... اچھی بری تخلیقات میں تمیز کرنے کا۔ تعریف اور تنقید کرنے کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ یہ عمل بتدریج بڑھے گا۔ ابھی ہمارے ملک میں خواندہ لوگوں کی تعداد ہی کتنی ہے اور پھر ادب پڑھنے والے تو گنتی کے ہیں۔ ابھی تو ہمارے ہاں لوگ زندگی کی بنیادی ضروریات کے حصول میں مصروف ہیں۔ غم جہاں اور روزگار نے دیوانہ کر رکھا ہے۔ لوگ ذرا ان سے نمٹ لیں تو پھر کسی جانب توجہ دیں اور ایسا دھیرے دھیرے ہوگا اور ہو رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ادب بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے۔ قنوطی' یاسیت زدہ اور بے ادب یا یوں کہہ لیں کہ بے شعور لوگ شاید یہ باتیں کرتے ہوں۔ ان سے عرض ہے کہ "سوئی کے ناکے سے سارا آسمان نظر نہیں آتا"۔
آخری سوال سن کر انہوں نے کہا..... "مشرقی اور مغربی ادب کے رجحانات' مسائل' شعور کلچر اور اقدار یکسر مختلف ہیں۔ ہمیں مغرب سے صرف ضروری تکنیک سیکھنی چاہئے مگر اس کے رجحانات' قدریں' مسائل' حسیت اور ادبی فیشن نہیں اپنانا چاہئے۔ ہمارے مسائل' ہمارا احساس و شعور' ہماری قدریں' ہمارا کلچر روایات بہت مختلف اور منفرد ہیں۔"

اپنی مٹی پہ ہی چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

عکسِ فن

نظم

کسی نے سچ کہا ہے کہ
محبت اور کہانی میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا
مگر میری محبت تو
کہانی ہی کہانی ہے
محبت کی کہانی میں
کوئی راجہ نہ رانی ہے
نہ شہزادہ، نہ شہزادی
انوکھی اک کہانی ہے
محبت کی کہانی میں
مسافت ہی مسافت ہے
محبت کی مسافت اور
ضرورت کی مسافت میں
نمایاں فرق ہوتا ہے
ضرورت کی مسافت میں
مسافر واپسی کے سارے امکاں پاس رکھتے ہیں
محبت کی مسافت میں
مسافر کے پلٹنے کا کوئی رستہ نہیں ہوتا
وہ ساری کشتیاں اپنی
جلا دیتے ہیں ساحل پر
کہ نا امید ہونے پر
پلٹنا بھی اگر چاہیں
تو واپس جا نہیں پائیں
وہیں غرقاب ہو جائیں

محبت کی کہانی میں مسافت کی بشارت تھی
سفر جب طے ہوا تو پھر
جلا ڈالی تھیں میں نے بھی
وہیں سب کشتیاں اپنی
جہاں پہلا پڑاؤ تھا
شکستہ جسم تھا میرا
مرے سینے میں گھاؤ تھا
بھڑکتا اک الاؤ تھا
کسی کی چاہ میں سب کچھ لٹا کر آگیا تھا میں
کہاں پر آگیا تھا میں؟
جہاں پہچان کا اپنی
حوالہ ہی نہ ملتا تھا
حوادث کے تھپیڑوں سے سنبھالا ہی نہ ملتا تھا
شب تیرہ سے نکلا تھا
اجالوں کی تمنا میں
مگر مجھ کو کسی جانب اجالا ہی نہ ملتا تھا
مگر ہمت نہیں ہاری
مگر ہمت نہیں ہاری اور اک جہد مسلسل سے
یہاں تک آگیا ہوں میں
جہاں ہر سو اجالا ہے
الگ پہچان ہے میری 'وطن میرا حوالہ ہے
اسے میں نے سنبھالا ہے' مجھے اس نے سنبھالا ہے
یہی میرا حوالہ ہے"

دیکھو کتنے پھول کھلے ہیں روح کی بیکل بگیا میں
جب جب مور قلم کا ناچا گاتا ہوا ہوں سکھیا میں

عمر شریف

Umer Sharif
Tonk House,
3/6-4F, Nazimabad
Karachi, Pakistan

عمر شریف
کراچی

میں نے احمد عمر خان کو جو عمر شریف تخلص کرتے ہیں پہلی بار محترم نگار صہبائی کے گھر سنا اور مجھے خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ کراچی کی سرزمین پر کیسے کیسے گوہر آبدار جگمگا رہے ہیں مگر دیدہ ء بینا سے اوجھل ہیں' اس لئے کہ عمر اور ان جیسے لوگ "تعلقات عامہ" کے فن کو دور سے سات سات سلام کرتے ہیں اور اپنی کٹیا جو ان کے لئے گوشہ ء عافیت بھی ہے میں اپنی دھن میں مگن ہیں اور شعر کہہ کر اردو ادب کے خزانے کو مالا مال کر رہے ہیں۔ عمر شریف ایک گیت سنا رہے تھے۔

سانپ کو لوگو
سانپ نے کاٹا
کب سنا! نہ دیکھا رے
مانس' کتنا بھوکا کتا!
مانس ہی کو کھا تا رے
سورگ کو نرکھ بنا تا رے

میں نے عمر شریف کو مشورہ دیا کہ کنجوسی سے کام نہ لیتے ہوئے اخبارات کے ادبی صفحات کے علاوہ دیگر ادبی رسالوں کو اپنا کلام گاہے گاہے بھیجتے رہیں۔ تب عمر شریف نے بتایا کہ ان کا کلام 1963ء سے اردو کے مختلف جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے' جن میں کراچی کا آہنگ' نقش' ساقی' سیپ اور جنگ کا ادبی صفحہ شامل ہیں۔ لاہور سے فنون' تخلیق' گل فشار

اور راولپنڈی کے نیرنگ خیال میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ تین مجموعہ کلام زیر ترتیب ہیں، جن کے نام بھی بڑے دلربا ہیں۔ اولین چاند' جو ان کی اولین غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ ستارہ سفر میں ہے اس میں صرف غزلیں ہوں گی اور خالص گیتوں کا مجموعہ " جب جب مور قلم کا ناچا۔"

ریاست ٹونک (ہندوستان) عمر کی جائے پیدائش اور 6 / نومبر 1945ء تاریخ پیدائش ہے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1970ء میں چند ماہ ریڈیو پاکستان میں بحیثیت اسٹاف آرٹسٹ ملازمت کی مگر ایک ناخوشگوار واقعہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ کبھی ملازمت نہ کرنے کا عہد کر کے اپنا کاروبار شروع کیا اور اللہ کے کرم سے 1978ء میں ان کی کمپنی کا نام الیکٹرونکس کے میدان میں پاکستان بھر میں بحیثیت ڈسٹری بیوٹر ایک مستند نام قرار پایا۔ انہوں نے ویو فریزر' اسٹان ریفریجریٹر اور کلائمکس ایئر کنڈیشنز جیسی متعدد اشیاء پاکستان میں متعارف کرائیں۔ 1994ء میں E ZEE HOME APPLIANCES کے نام سے ایک صنعتی ادارہ کی بنیاد ڈالی اور آج کل ساری توجہ اس کو ترقی دینے پر مرکوز کئے ہوئے ہیں۔ یوں انہوں نے پاکستان کی معیشت کو مضبوط بنانے میں بھی ایک ایسا ہی سنگ میل قائم کیا جیسے اردو ادب کے خزانے کو وسیع کرنے کے لئے خاموشی سے کام کرتے رہے ہیں۔

ترقی پسند خیالات کے حامی زمانہ ءطالب علمی سے ہیں۔ شاعری کے علاوہ ڈرامہ سے بھی دلچسپی رہی۔ چند ڈرامے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو چکے ہیں صدر پاکستان ایوب خان کے مارشل لاء کے زمانے میں داؤد میڈیکل کالج میں فیض احمد فیض کے زیر صدارت ہونے والے مشاعرہ میں حکومت کے خلاف نظم پڑھی اور حوالات پہنچا دیئے گئے۔ امی ابو کی ناراضگی سہی اور چند دن حوالات کی سیر بھی کی لیکن ارادوں میں پھر بھی تبدیلی نہیں آئی۔

اردو زبان کے مستقبل سے عمر شریف مایوس نہیں کیونکہ بقول ان کے گذشتہ پچاس برس میں اردو نے بڑی ترقی کی ہے۔ وہ جگہیں جہاں اردو کا نام و نشاں بھی نہ تھا' آج اردو وہاں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جیسے متحدہ عرب امارات' وسط ایشیائی ریاستیں' امریکہ' کینیڈا وغیرہ ان کا کہنا ہے اب بھی وقت کے ساتھ اردو میں نئے الفاظ شامل ہو رہے ہیں جو کہ اردو کی وسعت اور عام فہمی میں معاون ہیں اور ہمیں کھلے دل سے ان کا استقبال کرنا چاہئے تاکہ اردو زبان میں مزید وسعت اور گہرائی پیدا ہو۔

عمر شریف کہتے ہیں "شاعری نام ہی اظہار خیال کا ہے۔ ہر شاعر کی اپنی پسندیدہ صنف اور اس پر اس کی دسترس ہوتی ہے۔ وقت اور تجربے کے ساتھ ساتھ پسند تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ شاعر اپنے موڈ سے شاعری کرتا ہے۔ وہ شاعری نہیں ہوتی کہ آدمی قلم اور کاغذ لے کر بیٹھے کہ آج مجھے غزل لکھنا ہے یا نظم۔ اس طریقہ ء کار کو مشق سخن تو کہا جاسکتا ہے مگر شاعری نہیں۔

شاعری تو کرامت یا معجزہ کی طرح سرزد ہوتی ہے۔ یہ پلاننگ سے نہیں ہوتی۔ میں نے غزلیں اور نظمیں دونوں لکھی ہیں۔ گذشتہ چند سالوں سے گیتوں پر توجہ زیادہ ہوگئی ہے اور گیت ہی کو شاعری میں اظہار خیال کا بہتر ذریعہ سمجھتا ہوں۔ جہاں تک نثری نظم کا تعلق ہے' یہ ایک تجربہ ہے اگر کامیاب ہوگیا تو ٹھیک اور اگر ناکام رہا تو لکھنے والے کا مقدر بقول محشر بھائی کے۔۔

جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

عمر شریف نے کہا۔۔۔ "آج کے دور میں مشاعرے اور تخلیقی نشستیں دونوں ہی ادب کی تخلیق میں معاون و مددگار ہیں۔ مشاعرے ہماری روایت کا حصہ ہیں۔ نئی نسل کو اپنی روایت سے باخبر ہونا چاہئے۔ تخلیقی نشستیں سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہیں۔ حرکت میں برکت ہے۔ خاموشی موت کی علامت ہے۔"

میرا اگلا سوال سن کر بولے "آپ کا یہ سوال کہ دور حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے۔ بنیادی طور پر غلط سوال ہے' اس لئے کہ عمل کے باعث تو ادب کی تخلیق ہوتی ہے' ہاں البتہ میں آپ کے اس سوال سے متفق ہوں اور اس نکتہ کو ہر ادبی محفل میں اٹھایا جاتا ہے کہ ادب کا قاری سے رشتہ کیوں ٹوٹ گیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ بظاہر اس المیہ کی دو وجوہات نظر آتی ہیں۔ ایک میڈیا دوم کتابوں کی قیمت میں مسلسل اضافہ' اگر میڈیا کا استعمال ادب کے زیر اثر موثر طریقے سے ہو اور کتابوں کی قیمتیں کم کردی جائیں تو یقیناً" آپ براہ راست دیکھنے' سننے اور پڑھنے والوں تک اپنا پیغام آسانی سے پہنچا سکتے ہیں۔ ادب کبھی بھی بے اثر نہیں ہوتا۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں جتنے بھی انقلاب آئے ہیں' چاہے وہ معاشی ہوں یا ثقافتی ان کے پس پردہ جو تحریک نظر آئے گی وہ کسی ادیب' شاعر' مفکر یا دانشور ہی کی مرہون منت ہوگی۔ قلم کی طاقت تلوار سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔"

آخری سوال سن کر عمر شریف نے کہا "ہر علاقے کی اپنی تہذیب' طرز معاشرت' موسم' کھانا اور ادب ہوتا ہے جو کہ دوسرے علاقے سے قطعاً" نہیں تو تقریباً" مختلف ہوتا ہے مثلاً" مشرق میں اور خصوصاً" برصغیر پاک و ہند میں بوڑھے والدین کی خدمت و اطاعت کو معمولات یومیہ میں اولین ترجیح دی جاتی ہے جبکہ مغرب میں بوڑھے والدین کو ہاسٹل میں داخل کرانا اچھا سمجھا جاتا ہے۔ دونوں افعال کو احساسات کی عینک سے دیکھیں تو کتنے مختلف نظر آتے ہیں۔ شاعر آپ بیتی لکھے یا جگ بیتی۔ عکاسی وہ اپنے اطراف اور ماحول ہی کی کرتا ہے۔ اردو شاعری کافی ماہیے' ٹپے' بولیاں لوبے اور دوائی کی شرکت کی تو متحمل ہو سکتی ہے مگر کسی مغربی اصناف سخن کی نہیں۔ مغرب سے علم یا جدید تکنیک حاصل کرنا کوئی بری بات نہیں بشرطیکہ وہ قبول عام ہو۔ اور قبول عام تو وہی ہوتا ہے۔ جس کو پڑھنے یا سننے والا یہ سمجھے کہ

اس کے اپنے دل کی آواز ہے۔ وہ قاری چاہے شکاگو میں بیٹھا ہو یا چیچہ وطنی میں چنانچہ اس بات سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اچھی تخلیق سب کے دلوں پر یکساں اثر انداز ہوتی ہے۔ پاکستان کی مٹی سے اگا ہوا آم ذائقے میں برازیل کے اس پھل سے یکسر مختلف ہو گا جو بظاہر آم کا ہم شکل اور ہم نام ہے۔ زراعت کی طرح ادب میں بھی آپ کو مشرق و مغرب کا فرق نمایاں نظر آئے گا کیونکہ ادب کا بھی اپنی زمین سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ مشرق کے ادب سے مغرب والے اور مغرب کے ادب سے مشرق والے صحیح طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے اور نہ ہی وہ استفادہ حاصل کر سکتے ہیں جو کہ مقامی افراد کو میسر ہو گا۔ ہر ایک کی اپنی حسیت ہے۔ میری اپنی ذات رائے میں مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ ایک طویل بحث ہے، اس کو صفحے دو صفحے میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔"

عکس فن

گیت ...

کیسی رنگیں ہولی ہے ری
رنگیں ہے سنسار
خود ہی پیا جی رنگ بنے ہیں
خود ہی بنے پچکار

مجھ کو گیانی رنگ رنگو جی
اے جی پیا سرکار
سارے جگ کو رنگ رنگا ہے
تم ہو بڑے رنگدار

میں ہوں پیاسی سوکھی ماٹی
تم ہو برکھا پھوار
مجھ کو مارو رنگ پچکاری
اونچے چتر کھلار

کوئی کہے تم رام ہو اس کے
کوئی کہے غفار
میں ان پڑھ تو اتنا جانوں
سب کے پالنہار

مجھ کو گیانی رنگ رنگو جی
سیاں مورے رنگدار
اے جی پیا سرکار

کیسی رنگیں ہولی ہے ری
رنگیں ہے سنسار
مجھ کو مارو رنگ پچکاری
اونچے چتر کھلار
اے جی پیا سرکار

حقیقت جانتا کوئی نہیں ہے
مگر یہ مانتا کوئی نہیں ہے

عقیل عباس جعفری

۱/۱/۹۸ء

Aqeel Abbas Jaferi
Flate 12, Block 1-B,
Stree 30, I-81
Islamabad, Pakistan

عقیل عباس جعفری

اسلام آباد

ایک مدت بعد میں نے ان کی تحریر دیکھی۔ ان کی تصویر دیکھی۔ یہ مدت میری بھی جدوجہد کی تھی اور عقیل عباس جعفری کی بھی۔ ہجرتوں کے دکھ عقیل عباس جعفری نے بھی سہے اور بہت دلنشیں انداز میں اس کا اظہار کیا۔ اس دل نشینی میں ان کے سچے لہجے کی تلخی چھپی ہوئی ہے اور ایک کاٹ رکھتی ہے۔۔

کچھ لوگ چھوڑ آئے تھے اپنی زمین کو
اب شہر شہر ان کا ٹھکانا سفر میں ہے

عقیل عباس جعفری نے زندگی کا مشاہدہ بڑے قریب سے کیا ہے۔ دکھ کی جلن اور اذیت سے عقیل بخوبی واقف ہیں۔ اس نظام کو بدلنے کی آرزو میں انہوں نے قلم کو تیشہ بنا لیا۔ گو ان کے کلام میں تیشے سے چٹان کاٹنے کی گھن گرج نہیں لیکن کلام تیشے کی کاٹ سے بھی محروم نہیں۔ ان کا شعر دیکھئے۔۔

کسی کو سایہ تک جو دے نہ پائے
تو پھر ایسا شجر رہتا نہیں ہے

عقیل عباس جعفری ربط باہم کی اس سائنسی حقیقت کا ادراک رکھتے ہیں کہ جس کا دوسرا نام محبت ہے۔ محبت جو صحرا میں بھی پھول کھلا دیتی ہے' اسی لئے ان کا یقین ہے کہ۔

کسی دل تک پہنچنا ہو تو یارو
محبت سب سے سیدھا راستہ ہے

مگر اس ہاؤ ہو کے باوجود عقیل اندر سے خود کو بہت تنہا بھی محسوس کرتے ہیں اور یہ غالباً" ہر شاعر کا مقدر ہے۔ ہر فنکار کا حصہ ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو غالب کیوں کہتے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کچھ ایسا ہی لب و لہجہ عقیل عباس جعفری کا بھی ہے ملاحظہ ہو۔

کبھی جاتا تھا جو صحرا کی جانب
وہی اب میرے گھر کا راستہ ہے

عقیل نے مجھے خط میں لکھا۔ "سخن ور جلد اول" کو نئی کمپوزنگ کے ساتھ اور آج کی شاعرات کو اضافہ اور نئی ترتیب کے ساتھ شائع کریں۔ عقیل کا خط پڑھ کر مجھے یقین ہو چلا ہے کہ انہوں نے علم و ادب کی خدمت کی جو توقع مجھ سے رکھی ہے زندگی رہی تو میں انہیں مایوس نہیں کروں گی۔

عقیل عباس جعفری 10/ اگست 1957ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ عقیل تخلص ہے اور قلمی نام عقیل عباس جعفری ہے۔ کہتے ہیں.... جن تعلیمی اداروں نے مجھے اس معاشرے کا ایک بہتر انسان بنانے کی کوشش کی (مگر ناکام رہے) ان میں ڈی جے سائنس کالج کراچی' انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور' داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی' کراچی اور کراچی یونیورسٹی شامل ہیں۔ ایف ایس سی کرنے کے بعد میں نے انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں شعبہ آرکیٹیکچر میں داخلہ لیا کہ انجینئرنگ کے تمام شعبوں میں یہ شعبہ اپنے مزاج سے سب سے زیادہ ہم آہنگ لگتا تھا۔ ایک سال بعد میں نے داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی' کراچی میں تبادلہ کروالیا۔ جہاں سے میں نے بیچلر آف آرکیٹیکچر کی سند حاصل کی۔ پھر میں نے جامعہ کراچی کے شعبہ صحافت سے 'جسے اب ابلاغ عامہ کہا جاتا ہے' ایم اے کیا۔ 1987ء تک' میں داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کے شعبہ آرکیٹیکچر سے بطور لیکچرار منسلک رہا۔ اسی دوران میرا لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا اور تحقیق کے میدان میں تھوڑا بہت نام بنانے میں بھی کامیاب ہو گیا چنانچہ 1996ء میں اپنی افتاد طبع کے باعث' مقتدرہ قومی زبان پاکستان سے بطور افسر تحقیق وابستہ ہو گیا۔

عقیل کو شاعری کے علاوہ تحقیق کے شعبے سے بھی دلچسپی ہے بلکہ اب بڑی حد تک وہی ان کی شناخت بن گیا ہے۔ ویسے بنیادی طور غزل کے شاعر ہیں۔ میر' فراق' ناصر کاظمی' احمد مشتاق' جون ایلیاء' ظفر اقبال' انور شعور اور رسا چغتائی انہیں اپنے مزاج سے زیادہ قریب

محسوس ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے شاعروں میں عرفان صدیقی پسند ہیں۔ عقیل کا کلام بہت کم ادبی جرائد میں شائع ہونے کے باوجود نقوش اور فنون جیسے عہد ساز جرائد میں شائع ہو چکا ہے۔ مزاجاً" عقیل گوشہ نشین ہیں۔ اپنی تنہائی کو ہی انجمن بنا لیتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ابھی شائع نہیں ہوا لیکن سیاست کے موضوع پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں' جن میں پاکستان کے سیاسی وڈیرے' پاکستان کی انتخابی سیاست' قائد اعظم کی ازدواجی زندگی' لیاقت علی خان قتل کیس اور پاکستان کی ناکام سازشیں شامل ہیں۔

عقیل کہتے ہیں کہ "ان کی زندگی کا اہم واقعہ کراچی سے اسلام آباد ترک سکونت ہے۔ کراچی میں زندگی کے تقریباً" چالیس برس بسر کئے۔ ظاہر ہے یہ عرصہ اتنا بڑا ہے کہ اب بقول عقیل "میں تو اس شہر سے نکل سکتا ہوں مگر وہ شہر مجھ میں سے نہیں نکل سکتا۔""۔

ہم اس گلی سے گزر آئے عافیت سے مگر
یہ اور بات کہ یہ بھی زیاں تو اپنا ہے

اردو کے مستقبل کی بات چلی تو عقیل نے کہا...... "اردو بھارت سے آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے بلکہ ختم ہو چکی ہے۔ اب وہاں دہلی اور لکھنؤ جیسے علمی مراکز میں بھی کوئی سائن بورڈ یا ہورڈنگ اردو میں نظر نہیں آتا۔ غالب کا دیوان اور انیس کے مرثیے دیوناگری رسم الخط میں شائع ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں عوامی سطح پر تو اردو زندہ ہے اور زندہ رہے گی مگر حکومتی سطح پر اس زبان سے جو تغافل برتا جا رہا ہے' وہ کسی بھی طور امید افزا نہیں۔ جس طرح اب فارسی سمجھنے والے افراد خال خال ملتے ہیں۔ ڈر ہے کہیں اردو کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہو جائے۔ اردو بولنا' اردو لکھنا اور اردو پڑھنا اعلیٰ سوسائٹی میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ انگریزی کی بجائے اردو بولنے' اردو لکھنے اور اردو پڑھنے کو فوقیت دیتے ہیں' انہیں "اردو میڈیم" کہہ کر ان پر اعلیٰ سوسائٹی کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

اگر حکومت اردو کی ترویج میں واقعی مخلص ہے تو اسے فوری طور پر سرکاری دفاتر میں اردو کو رائج کر دینا چاہئے اور سول سروس کے امتحانات اردو زبان میں لینے چاہئیں۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ دنیا میں ایسی کسی قوم نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی نہیں کی' جسے سائنسی تعلیم اس کی مادری زبان میں نہ دی جاتی ہو۔ جاپان اور کوریا کی مثالیں تو ہمارے سامنے کی بات ہے۔"

شاعری میں عقیل کی پسندیدہ صنف سخن غزل ہے۔ کہتے ہیں اور مصرعوں میں ایک مکمل بات کہنا بعض اوقات بڑی بڑی نظموں پر بھاری ہوتا ہے۔ مثلاً" ایک نقاد نے لکھا تھا کہ جو بات کہنے کے لئے اقبال کو شکوہ اور جواب شکوہ جیسی طویل نظمیں لکھنی پڑیں' اسے غالب نے صرف دو مصرعوں میں یوں بیان کر دیا ہے۔۔۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

نثری نظم کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ نثری نظم کی بنیادیں ہماری زبان میں نہیں ہیں۔ یہ ایک "درآمد شدہ" صنف سخن ہے۔ جن زبانوں میں نثری نظم پروان چڑھی' وہاں اسے ایک بھرپور صنف سخن بننے میں صدیاں لگی ہیں۔ اردو میں تو اسے ابھی نصف صدی تو کیا ربع صدی بھی نہیں گزری۔ ممکن ہے آئندہ نثری نظم کوئی بڑا شاعر پیدا کرے تو اہل ادب اس صنف سخن کو بھی تسلیم کرلیں۔

نثری نظم کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ جتنے لوگوں نے اچھی نثری نظمیں لکھی ہیں' ان سب نے پابند شاعری بھی بہت اچھی کی ہے۔ مثلاً" افضال احمد سید اور ذیشان ساحل کے نام سامنے کے نام ہیں مگر اگر صرف خود کو شاعر کہلوانے کے لئے اوٹ پٹانگ نثری نظمیں لکھنا ہے تو بہتر ہے کوئی اور کام کیا جائے۔

یاد رکھئے پکاسو نے بھی پہلے Realistic پینٹنگ میں عبور حاصل کیا تھا' تب تجریدیت کی طرف آیا تھا۔ کسی بھی فارم کو توڑنا اسے زیب دیتا ہے جو اسے بنانا بھی جانتا ہو۔ سلسلہ ء کلام جاری رکھتے ہوئے کہا..... "جہاں تک مشاعروں کا سوال ہے' مشاعرے ادب کی تخلیق میں تو نہیں "بے ادبی" کی تخلیق میں معاون ثابت ضرور ہو رہے ہیں۔ اب لوگ مشاعروں میں شعر سننے نہیں بلکہ میلا ٹھیلا یا تہوار سمجھ کر' تفریح اور وقت گزاری کے لئے جاتے ہیں۔ میں نے خود کراچی اسٹیڈیم میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں تبصرہ سنا تھا جو کچھ یوں تھا کہ مشاعرے تو کراچی والوں کی بسنت ہے۔ عزم بہزاد' لیاقت علی عاصم' سعید آغا اور عتیق احمد اس واقعہ کے گواہ ہیں۔

پھر ہمارے شاعر حضرات' صرف ایک مشاعرہ پڑھنے کے لئے جو جوڑ توڑ' سازشیں اور منافقتیں کرتے ہیں' وہ اس پر مستزاد ہیں۔ مشاعروں کے منتظمین بھی گھوم پھر کر انہی پندرہ بیس شاعروں کو مدعو کرتے ہیں جو غزل گو کی بجائے غزل "گا" شاعر ہوتے ہیں یا جو پبلک ریلیشننگ کا ہنر جانتے ہیں اور مشاعروں کے منتظمین ان شعراء کو بھی بلانے کو ترجیح دیتے ہیں جو کسی ادبی صفحے کے انچارج ہوں۔ میں نام نہیں لینا چاہتا مگر سب لوگ جانتے ہیں کہ ایک زمانے میں کراچی کے ایک شاعر' کراچی سے دبئی تک ہر مشاعرے میں مدعو کئے جاتے تھے مگر جب سے انہوں نے جنگ کا ادبی صفحہ مرتب کرنا چھوڑا' انہیں محلے کے مشاعرے میں بھی نہیں بلایا جاتا حالانکہ وہ اب بھی اسی طرح کے شعر کہہ رہے ہیں' جیسے پہلے کہتے تھے۔ یہ اخبارات کے ادبی صفحے ہی کی تو برکات ہیں کہ لاہور کے ایک اخبار کے ادبی صفحے کے انچارج' محض اسی خوبی کی بنا پر پرائیڈ آف پرفامنس تک لے چکے ہیں جبکہ اسلام آباد کے ایک اف ا۔

نگار ایک اہم ادبی ادارے کے سربراہ بننے کے بعد بھی 'ایک معروف روزنامے کے ادبی صفحے کی نگرانی سے دستبردار نہیں ہوئے۔

ادب کی ترویج میں تخلیقی نشستیں بڑا اہم کردار ادا کرتی آئی ہیں مگر جہاں تک حلقہ ارباب ذوق جیسی تنقیدی نشستوں کا سلسلہ ہے 'ان نشستوں نے کوئی بڑا ادیب یا شاعر پیدا نہیں کیا۔ محض چرب زبان نقاد پیدا کئے ہیں۔ میں بذات خود ایسے کئی شاعروں کا گواہ ہوں 'جن کی اولین تخلیقات پر ہی ان چرب زبان نقادوں نے ایسی ایسی تنقیدیں کیں کہ وہ بے چارے ہمیشہ کے لئے ادب سے ہی تائب ہو گئے۔ ادب کی ترویج میں ایک اور چیز جو آڑے آئی ہے 'وہ یہ ہے کہ اب جونیئر شاعروں کو یہ باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ سینئر کا احترام نہ کریں۔ جو لوگ خود کو میر کے بعد سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہوں 'ان سے اور بھلا توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے۔"

عقیل عباس جعفری کم سخن ہیں مگر جب سلسلہ ء تکلم شروع ہوتا ہے تو ان کے سچ کی کڑواہٹ بھی شیریں ہو جاتی ہے۔ اگلے سوال کے جواب میں عقیل نے کہا...."دور حاضر میں ادب اور قاری کا رشتہ واقعی کمزور پڑ گیا ہے 'جو کتاب قیام پاکستان کے وقت ایک ہزار چھپتی تھی (جبکہ اس وقت ملک کے اس حصے کی آبادی 1/2 3 '4 کروڑ سے زیادہ نہ تھی) وہ اس وقت 13 '14 'کروڑ آبادی ہونے کے باوجود بھی فقط پانچ سو چھپتی ہے حالانکہ اگر دس ہزار افراد میں سے ایک فرد بھی کتاب خرید کر پڑھے تو کتاب کا ایڈیشن 14 ہزار چھپنا چاہئے یا اگر ایک لاکھ افراد میں سے ایک فرد بھی کتاب خریدنے کا شوقین ہو تو 14 سو کتاب تو بکنی ہی چاہئے مگر ایسا نہیں ہے۔

بھلا ایسے میں ادب کیا اثر پیدا کر سکتا ہے؟ ادب کے اثرات پیدا کرنے ہیں تو خواندگی اور کتاب دوستی کو فروغ دینا ہو گا ورنہ ہماری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں۔ حال ہی میں انٹرنیٹ پر اردو کا ایک ادبی جریدہ شائع ہونا شروع ہوا ہے 'جس کی مجلس ادارت میں 'میں خود بھی شامل ہوں۔ اس جریدے کا فیڈ بیک بہت اچھا ہے اور پہلے ہی ان خلیجی ریاستوں کے علاوہ امریکہ تک سے تہنیتی پیغامات موصول ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر اس نوع کے ادبی جرائد اور کتابیں ادب کو موثر بنا سکیں مگر بات پھر وہی آجاتی ہے کہ آخر انٹرنیٹ تک رسائی ہے ہی کتنے لوگوں کی؟

آخری سوال کے جواب میں عقیل کہتے ہیں...."آپ کے سوال کا جواب 'خود اس سوال کے بین السطور میں موجود ہے۔ میری رائے بھی یہی سمجھ لیجئے۔"

عکس فن

غزل

کہاں ہوتا ہے تو ہوتے ہوئے بھی
میں پیاسا ہوں سبو ہوتے ہوئے بھی

اسی کی جستجو ہر ایک سو ہے
اسی کے چار سو ہوتے ہوئے بھی

اسی کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں نظریں
اسی کے روبرو ہوتے ہوئے بھی

اسی سے گفتگو کی آرزو ہے
اسی سے گفتگو ہوتے ہوئے بھی

خموشی ہی خموشی ہر طرف ہے
مسلسل ہاؤ ہو ہوتے ہوئے بھی

بہت کارِ رفو باقی ہے دل میں
بہت کارِ رفو ہوتے ہوئے بھی

میں ان حالات میں زندہ ہوں اب تک
رگ جاں میں لہو ہوتے ہوئے بھی

عیاں خدا نے اگر وقت کو سماعت دی
مری صدا کا ہر اک حرف معتبر ہوگا

رشیدہ عیاں

Rashida Ayan
88 Glenridge Ave.
Glenridge, NJ07028.
U.S.A

رشیدہ عیاں
نیوجرسی

رشیدہ عیاں آج کل کی شاعرہ نہیں ' وہ کم و بیش 54 سال سے شعر کہہ رہی ہیں۔ یعنی نصف صدی گزر گئی مگر ان کی فکر آج بھی تازہ ہے اور ان کی سوچ کا ہر پہلو نیا۔ کہیں سے فرسودگی نہیں جھلکتی۔ یہ ان کی دعاؤں کی قبولیت کا نتیجہ ہے کہ آج رشیدہ کو اپنا آپ منوانا نہیں پڑ رہا۔ ادب کی دنیا میں رشیدہ عیاں کا نام آج ایک معتبر نام ہے۔

گیارہ برس کی ایک بچی سیدہ رشیدہ بیگم نے جب شعر کہنے کی ابتدا کی تو کوئی یقین نہیں کرتا تھا کہ بحر و قافیہ کے سقم سے آزاد یہ اشعار اس بچی کے ہو سکتے ہیں۔ رشیدہ اس رویے سے پریشان ہو جاتیں اور تھک کر نماز میں اپنے اللہ میاں سے ملتجی ہوتیں کہ تو جانتا ہے کہ یہ میرے اشعار ہیں۔ میں بچی ہوں۔ تو میری مدد کر تا کہ لوگوں کو یقین آجائے۔ اللہ میاں نے مدد کی اور رشیدہ شاعری میں اپنا مقام پیدا کرتی چلی گئیں۔

4 مارچ 1932ء کے دن مراد آباد (ہندوستان) میں پیدا ہونے والی سیدہ رشیدہ بیگم آج ادبی سفر طے کرتی ہوئیں اس مقام پر پہنچ گئی ہیں کہ ان کا ادبی مقام سربلندی کا متقاضی ہے۔

رشیدہ کہتی ہیں کہ وہ کسی خاص مکتب فکر سے متعلق نہیں ' یہ دنیا خود اتنا بڑا مکتب ہے کہ یہیں سے نیرنگیِ خیال ملتا ہے۔ دنیا بے شک بدلتی ہے لیکن داخلی محسوسات قائم رہتے ہیں۔ رشیدہ کی شاعری میں بھی داخلی اثرات زیادہ نمایاں ہیں اور خارجی کم۔ کہتی ہیں شاعری شعوری فعل ہے۔ میری شاعری احساسات کا اظہار ہے۔ اس لئے پوری شاعری میں مختلف انداز ابھر کر آئے ہیں۔ وقت ' زندگی ' حالات کسی ایک خانے میں مقید نہیں ہو سکتے ' لہٰذا شاعری کیسے قید ہو سکتی ہے؟

مشاہیر شعراء سے ملاقات اور ادبی محفلوں میں شرکت' ان کی روحانی غذا ہے۔ شاعری میں انہوں نے اب تک غزل' مثنوی' نظم' گیت' بھجن' نعت' مرثیہ' قطعات' ہائیکو' ثلاثی' آزاد نظم' غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نثری نظم نے انہیں متاثر نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب اس صنف میں نظم نہیں تو نظم کہنا کیا معنی۔ رشیدہ عیاں کے کہنے کے مطابق آج کل کے مشاعرے ادب کی تخلیق میں کوئی خاص معاونت نہیں کر رہے۔ البتہ تخلیقی نشستیں یقیناً" بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

عیاں اردو زبان کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس محبت اور گنجائشوں سے اس زبان کا خمیر اٹھا ہے اگر دلدادگان اردو بالخصوص غیر اردو ممالک اور ماحول میں اس کی پاسبانی اور آبیاری کرتے رہے تو اس کا مستقبل روشن رہے گا۔

رشیدہ کے خیال میں موجودہ دور میں یہ سوچنا کہ ادب ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے بے معنی ہے۔ ہمیں معیاری ادب کی تخلیق کرنی چاہئے اور مغربی ممالک میں نئی نسل میں جو ادبی شعور کم ہو رہا ہے' اسے جلاء بخشنے کی ضرورت ہے۔ ہماری اکثریت اگر اعلیٰ ادب پڑھے گی نہیں' سمجھے گی نہیں تو نتیجہ کیا ہو گا؟ ہر عروج کے بعد زوال اور زوال کے بعد عروج لازمی ہے۔ سو میں دس قاری اور پانچ لکھاری بھی اعلیٰ ادب کی سرپرستی کریں تو ناامیدی کا عفریت اپنی موت آپ مر جائے گا۔

رشیدہ عیاں سینئر ادیبوں کی اس رائے سے متفق ہیں کہ ہمارے ادب کو ہمارے ماحول اور ہمارے مسائل کا عکاس ہونا چاہئے۔ ہمارا ادب اگر ہمارے احساسات و شعور کا آئینہ دار نہ ہو گا تو ہم خسارے میں رہیں گے۔ کسی پھول کی خوشبو ہی اس پھول کی پہچان ہوتی ہے۔ بیرونی فیشن کی پیروی سے ہم اپنے ادب کی شناخت کھو سکتے ہیں جبکہ اپنی شناخت ہر اعتبار سے قائم رکھنا' ہمارے لئے انتہائی ضروری اور اہم ہے۔

رشیدہ عیاں 1975ء میں امریکہ آئیں۔ نیو جرسی میں مقیم ہیں۔ ان کے شوہر سید شمیم حیدر صحافی تھے۔ 1945ء سے 1974ء تک اے پی پی اور ڈی پی اے (D.P.A., A.P.P اخباری نیوز ایجنسیاں) سے وابستہ رہے۔ 1974ء سے 1989ء تک رابطہ عالم اسلامی کے پریس اتاشی رہے۔ 1994ء میں انہیں اردو زبان و ادب کی خدمت کا ایوارڈ اردو لٹریری اینڈ کلچر سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کی جانب سے ملا۔ 30 نومبر 1990ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اپنے شریک حیات کی جدائی کے بعد رشیدہ زندگی کے سرد و گرم سے نبرد آزما ہونے کے لئے تنہا رہ گئیں۔ ان کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں اور سب کے سب فرماں بردار اور ان کے دکھ سکھ کے شریک مگر زندگی کا ساتھی نہ ہو تو سارے سازگار موسم بھی ناسازگار محسوس ہوتے ہیں۔ رشیدہ کہتی ہیں کہ میری ادبی اور تخلیقی امنگوں کی پرورش میں شمیم کا بڑا ہاتھ تھا۔ شمیم کی

ملازمت کی نوعیت ایسی تھی کہ ہم مشرق وسطیٰ، جرمنی، فرانس، برطانیہ، نیپال اور امریکہ، جہاں بھی رہے، وہ نہ صرف اپنا کام بے تکان کیا کرتے تھے بلکہ میرے ادبی کاموں میں بھی معاونت کرتے تھے۔ میرے اب تک جو پانچ مجموعے حرف حرف آئینہ، عشق پر زور نہیں، کرن کرن اجالا، جائزہ اور آئینوں کے چہرے۔ ان کے مسودات مرتب کرنے میں شمیم کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ گو شمیم کی دس بارہ سال کی مسلسل علالت کے دوران میں پریشانیوں اور مصروفیات کے باعث تھک جاتی تھی۔ وہ مجھے اصرار کرکے بلا کر پاس بٹھاتے اور غیر مرتب کلام کو خود پڑھتے جاتے اور میں لکھتی جاتی۔ میں تھک جاتی تو کہتے جلدی جلدی کرلو۔ پھر کون تمہاری مدد کرے گا۔ جانے میں اور کتنے دن تمہاری مدد کرپاؤں گا۔

رشیدہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ شمیم چاہتے تھے، میں لکھتی رہوں۔ میں لکھتی رہوں گی اور وہ میرے اشعار کے جھروکوں سے مجھے دیکھتے رہیں گے۔ مجھے محسوس ہوتے رہیں گے، وہ تھے نہیں، وہ ہیں اور میرے فن کی خوشبو بن کر ہمیشہ میری روح کو مہکاتے رہیں گے۔

وہ میری زندگی کی خوشبو ہیں۔ میرے اطراف ہیں، وہ ہر سو ہیں۔ یہی نہیں رشیدہ عیاں نے اپنے شریک حیات کی محبت میں ایسی زندہ و جاوید نظمیں لکھی ہیں کہ پڑھنے والے کا دل بھی ان کی محبت کی دھڑکنوں میں شریک ہوجاتا ہے۔ دو نظمیں "شمیم کے نام" اور "قید وفا"۔ اردو شاعری میں بڑا نادر اور خوبصورت اضافہ ہیں۔

یہ بھی ہے کہ رشیدہ کی شاعری صرف اپنی محبت اور اپنے ذاتی دکھ و الم کے گرد نہیں گھومتی۔ وہ عالمی پس منظر میں کشمیر، بوسنیا اور فلسطین میں ہونے والی ناانصافی پر بھی فریاد کناں ہوتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ ہر ملک میں ایک طبقہ اپنے اقتدار کی بقاء کے لئے عوام کو آپس میں لڑاتا ہے تاکہ وہ اپنے دکھ درد کے حقیقی اسباب کی طرف متوجہ نہ ہوپائیں۔ یہی حال ہمارے ملک پاکستان کا بھی ہے۔ لسانی تعصبات اور فرقہ وارانہ فسادات نے خوبصورت شہروں کو بے امان کردیا ہے۔ امریکہ میں رہنے والے پاکستانی باشندے اپنے ملک کی خیر مانگتے ہیں۔ ادیب اور شعراء اپنے اپنے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ اپنے ملک پاکستان کو جو ان کے سینوں میں دل بن کر دھڑکتا ہے اور اس کے قریہ قریہ کو امن و آشتی کے چراغوں سے روشن کریں۔

رشیدہ عیاں کو ان کی ادبی خدمات کے عوض 1988ء میں میر تقی میر ایوارڈ برائے اردو غزل ملا ہے۔ 1991ء میں نیشنل ایسوسی ایشن پاکستانی امریکن کی جانب سے اردو زبان و ادب کی خدمت کا ایوارڈ بھی حاصل کرچکی ہیں۔

عکسِ فن

ہم دونوں

ساجن دیکھو سینچی جیون کیاری دونوں نے
پروا بن کر سانسیں دیدیں باغ کو ساری دونوں نے

قطرہ قطرہ تیل بنے اور جل گئے ہم تم باتی میں
جوت جلانے کارن اپنی جان نثاری دونوں نے

سنساری جیون میں کیا کیا کرموں کے پتھر توڑے
سانجھ سویرے محنت کی' کب ہمت ہاری دونوں نے

ہم تم دونوں نے پتھریلی راہوں کو ہموار کیا
پگ پگ جیون کی پگڈنڈی روز سنواری دونوں نے

مان ہے اپنی بگیا کا' ابھی مان ہے سارے پھولوں پر
کرتووے اپنا خواب نبھایا' باری باری دونوں نے

خون پسینہ کرکے ہم نے آج سپھلتا پائی ہے
پتھر کاٹے اور کیا ہے پانی جاری دونوں نے

دکھ کی دھوپ میں اک دوجے کے سر پر سکھ کی چھاؤں بنے
پیار کے کارن باہم مل کر کی گھرداری دونوں نے

آؤ ساجن شام ڈھلے اب چھاؤں تلے دونوں بیٹھیں
اک دوجے کو دیدی ہر شے جان سے پیاری دونوں نے

میں کومل دھرتی تھی' تم آکاش سے بادل بن برسے
جیون بگیا میں سندرتا بھردی ساری دونوں نے

پھول عیاں ہے تم خوشبو' دونوں کا یگ یگ کا ناطہ
باہم مل کر جیون کی رت' خوب گزاری دونوں نے

نئی منزلوں سے مجھ کو نہیں کوئی روک سکتا
نہ تھکن کی بیقراری نہ سفر کی رائیگانی

غزالہ خاکوانی

Ghazala Khakwani
126 J/2, Gulistan Colony,
Bhawalpur Road
Multan, Pakistan.

ڈاکٹر غزالہ خاکوانی

ملتان

ڈاکٹر غزالہ خاکوانی کو میں نے پڑھا ضرور ہے لیکن کم کم۔ پھر کسی نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ وہ......وہ...... پھر ہنس کر مجھ سے پوچھنے لگے۔ وہ شعر کہتی ہیں؟ مجھے بہت ناگوار گزرا۔ کسی پڑھے لکھے آدمی کا ایسا طرزِ عمل دکھ کا باعث ہی تو ہوگا۔ میرا اصول ہے اور ہر پڑھے لکھے انسان کا ہونا چاہئے کہ اگر آپ کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے تو چپ رہئے۔ ایک چپ میں سو سکھ چھپے ہیں۔ میں نے یہ تو نہیں پوچھا تھا کہ غزالہ شعر کہتی ہیں یا نہیں۔ یہ پوچھا تھا کہ آپ انہیں ب[illegible]ے ہیں؟ میرا سوالنامہ سخن ور حصہ سوم ان تک پہنچا سکیں گے؟

یہ واقعہ اس تقریب کا ہے، جس دن محترم پروفیسر سحر انصاری نے غالب کی تقریب کے سلسلے میں جامعہ کراچی مجھے مدعو کر کے میری عزت افزائی کی تھی۔ میں نے اس تقریب میں غالب کی زمین میں غالب کے لئے کہی گئی اپنی وہ غزل سنائی، جس کا ایک شعر میں نے غالب کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد کہا تھا۔

اس تقریب میں کئی معتبر ہستیاں شریک تھیں جو ملک کے کئی شہروں سے تشریف لائی تھیں، اسی تقریب میں محترم خورشید علی خان نے مجھے اپنی تازہ تصنیف "فکر غالب اشعار کے آئینے میں" سے نوازا اور میرے اندر کی کڑواہٹ کسی حد تک کم ہوئی۔

پھر غزالہ کا تعارف جب میں نے پڑھا، جس میں اس نے لکھا ہے کہ ا[illegible] کے کلام پر رائے دینے والوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب مشفق خواجہ، جناب حکیم محمد سعید، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر پریشان خٹک، ڈاکٹر انور سجاد، محترم جمیل الدین عالی، حمایت علی شاعر، افتخار عارف اور دیگر کئی معتبر ہستیوں کے نام شامل ہیں تو مجھے بے حد خوشی

ہوئی۔ میں یوں بھی غزالہ کی ممنون ہوں کہ اس نے میرا سوالنامہ ملتے ہی مجھ سے تعاون کیا اور بیورو کریٹانہ رویے سے گریز کرتے ہوئے اپنا تعارف جلد از جلد بھجوا دیا۔ میں نے غزالہ کا تعارف پڑھا۔ اس کی تصویر دیکھی اور سوچا خوش شکل اور خوبصورت خواتین کے حصے میں جہاں صنف مخالف کا لطف و کرم وافر آتا ہے وہاں ستم در ستم کا کوٹہ اس سے اتنا کہیں زیادہ ہوتا ہے کہ پھر چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پینا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر غزالہ خاکوانی 2 دسمبر کو ملتان (پنجاب پاکستان) میں پیدا ہوئیں۔ نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کیا اور اب حکومت پاکستان کے ایک ہسپتال میں میڈیکل آفیسر ہیں۔ غزالہ تخلص کرتی ہیں۔ خاکوانی پٹھانوں کا معروف قبیلہ ہے جو کئی صدیوں پہلے افغانستان سے ہجرت کر کے جنوبی پنجاب خصوصاً" ملتان میں آباد ہوا تھا۔ غزالہ کی ننھیال کا تعلق سروزئی قبیلے سے ہے جو ایک صدی تک ملتان میں حکمران رہے۔ غزالہ کے ماموں ملتان کی بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہیں۔ یوں غزالہ نے پڑھے لکھے ماحول میں آنکھ کھولی۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ کر حصہ لیا۔ کالج کی بہترین شاعرہ اور کمپئیر کے انعامات حاصل کئے شاعری کے علاوہ افسانے اور ڈرامے لکھے۔ ان کی تخلیقات فنون' اوراق، قلم قبیلہ، تخلیق، صریر، سیپ' نقوش' نیرنگ خیال وغیرہ میں چھپ چکی ہیں۔

غزالہ کا پہلا شعری مجموعہ "میرے پر نہ باندھو" 1987ء میں جنگ پبلشرز لاہور نے شائع کیا۔ اس کا اب تیرا ایڈیشن بھی ختم ہو چکا ہے۔ 1989ء میں دوسرا شعری مجموعہ "خود آشنائی" فیروز سنز لاہور نے شائع کیا۔ دونوں مجموعوں کو ادبی اور صحافتی حلقوں میں بہت پذیرائی ملی۔ غزالہ کے شعری مجموعوں پر انہیں ملتان کے شہریوں نے اسد اللہ شیخ ایوارڈ 1989ء میں اور نیشنل یوتھ ایوارڈ فار بیسٹ پوئٹ 1992ء دیا گیا۔ انجمن تاریخ و ثقافت پاکستان فیصل آباد نے اعزازی تعارفی تقریب منعقد کی اور شیلڈ دی۔ انٹرنیشنل بائیو گرافیکل ایسوسی ایشن انگلینڈ نے فیلو شپ دی جبکہ امریکن بائیو گرافیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے لائف فیلو شپ دی۔ انٹرنیشنل بائیو گرافیکل سینٹر کیمرج نے اپنی ڈکشنری کے تیئسویں ایڈیشن میں بائیو گرافی بمعہ تصویر اپنے Main Section میں شائع کی۔۔۔۔۔ دوسری کتاب "International Who's Who of Intellectuals" میں بھی تصویر اور بائیو گرافی شائع کی گئی جبکہ امریکن بائیو گرافیکل انسٹیٹیوٹ نے اپنی شائع شدہ کتاب "Leadership Distinguished" میں بائیو گرافی شائع کی۔ ABI نے Leadership Award Distinguished بھی اردو شاعری پہ دیا۔ انڈیا سے شائع ہونے والی ایک کتاب "Asia Who's Who of Man or Woman of Achievement) "Reference (Asia's میں بھی ان کی بائیو گرافی شامل ہے۔ گورنمنٹ آف پنجاب نے دونوں شعری

مجموعوں کو پنجاب کے تعلیمی اداروں اور لوکل گورنمنٹ کی لائبریریوں کے لئے منظور کیا۔
ان کا کہنا ہے کہ "میری فکر کے سب دھارے ترقی کی طرف ہی جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ میں کبھی رجعت پسند کہلاؤں اس طرح میں ترقی پسندوں کی تحریروں کے قریب ہوں مگر میں نے اپنی شاعری پہ کسی ایک مکتب فکر کی چھاپ نہیں لگنے دی۔ میں سمجھتی ہوں جو ایک مکتب فکر کا نمائندہ بن جائے' اس کی شاعری بھی محدود ہو جاتی ہے۔ وہ زندگی کو وسعت نظری کے ساتھ نہیں دیکھتا۔ تنگ نظری کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کا فکری پیغام محدود ہو جاتا ہے۔"

غزالہ کا خیال ہے کہ سرکاری سرپرستی نہ ہونے کے باوجود اردو مقبول بھی ہے اور عوام میں اس کی جڑیں مضبوط بھی ہیں بقول ان کے۔ یوں تو قومی زبان اردو ہے مگر سرکاری زبان آج بھی انگریزی ہے۔ اردو کے فروغ کے لئے کچھ کوششیں بھی کی گئیں۔ ادارے بنائے گئے جیسے اکیڈمی ادبیات وغیرہ مگر انہیں مخصوص لوگوں کو نوازنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس نے ادب کی کوئی خاص خدمت نہیں کی۔ مگر پھر بھی جس رفتار سے اردو میں کتابیں چھپ رہی ہیں اور انفرادی کوششیں کی جا رہی ہیں' اس سے تو اردو کا مستقبل روشن ہی نظر آتا ہے۔

شاعری میں غزالہ نظم کو اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتی ہیں کیونکہ نظم کا کینوس وسیع ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے "اگرچہ غزل کو بہترین ذریعہ اظہار قرار دیا جاتا ہے لیکن غزل میں قافیے اور ردیف کی پابندی بسا اوقات شاعر کی فکر کو محدود کر دیتی ہے۔ اسے ایک مخصوص دائرے میں رہتے ہوئے اپنی بات کرنا ہوتی ہے۔ نظم میں یہ پابندی نہیں ہوتی' جہاں تک نثری نظم کا تعلق ہے تو میں اس کی مخالف نہیں ہوں۔ خود میں نے بہت سی نثری نظمیں کہی ہیں۔ یہ اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں' جن کے لئے آزاد نظم کا کینوس بھی محدود ہو جاتا ہے۔ سو اپنی فکر کو عوام تک پہنچانے کے لئے نثری نظم بہترین ذریعہ اظہار ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض سہل پسندوں نے نثری نظموں کے نام پر ایسی مضحکہ خیز تحریریں روشناس کروائیں کہ نثری نظم نے اپنا اعتبار کھو دیا تھا مگر اب کئی Genuine تخلیق کاروں نے نثری نظموں کی شکل میں ایسی خوبصورت دل پذیر شاعری دی ہے کہ نثری نظم نے اپنے آپ کو ایک صنف کی حیثیت سے منوا لیا ہے۔ اب بات کرتے ہیں مشاعروں کے حوالے سے تو ادب کی ترویج میں مشاعروں نے بے شک بہت مثبت کردار ادا کیا اور ماضی میں مشاعروں کے ذریعے بڑے بڑے شعراء متعارف ہوئے۔ لیکن اب مشاعروں کی روایت دم توڑتی جا رہی ہے۔ مشاعرے منعقد بھی ہوں تو ان میں عوامی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ ایسے میں ادبی نشستوں کو ہی ادب کے فروغ میں معاون قرار دیا جا سکتا ہے مگر ان نشستوں میں بھی پسند ناپسند ہی معیار ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اگر ان نشستوں میں

ادب کو معیار کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو یہ نشستیں ادب کے فروغ میں زیادہ بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں۔"

ادب اور قاری کے رشتے کے حوالے سے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے غزالہ کہتی ہیں.... "عصر حاضر میں ادب اور قاری کا رشتہ اس لئے کمزور پڑ گیا ہے کہ قاری اب ناظر بن چکا ہے۔ وہ ادب پڑھنے کی بجائے دیکھنا پسند کرتا ہے۔ ٹی وی اور وی سی آر کے بعد سیٹلائٹ کلچر نے ادب کے قاری کو ٹی وی سیٹ کے آگے بٹھا دیا ہے۔ اس طرح عوام کا کتاب سے تو تعلق کمزور ہوا مگر ادب سے اب بھی موجود ہے۔ گو اس کا ذریعہ دوسرا ہو گیا ہے۔ اچھی غزل' اچھی نظم' اچھا گیت اور ڈرامہ اب بھی عوام میں مقبول ہوتے ہیں مگر کتاب کی بجائے ٹی وی کے ذریعے لوگوں تک پہنچتے ہیں۔

کہنا تو درست ہے کہ ادب اور قاری کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے مگر یہ کہنا درست نہیں کہ ادب بے اثر ہو کر رہ گیا ہے۔ میرے خیال میں ادب اب پہلے سے زیادہ بااثر ہے اور اس کے اثرات کسی ایک شہر یا ملک تک محدود نہیں رہے۔ دنیا اگر Global Village بنی ہے تو ادب کا دائرہ بھی وسیع ہو رہا ہے۔"

آخری سوال کے جواب میں غزالہ کہتی ہیں..... "ادب پر بیرونی اثرات کے مثبت اثرات بھی مرتب ہوئے اور منفی بھی۔ بعض لوگوں نے مغرب کی اندھادھند تقلید میں اپنے کلچر کو فراموش کر دیا لیکن بعض لوگوں نے مغرب کے اثرات تو قبول کئے مگر اپنی ثقافت کا دامن بھی مضبوطی سے تھاما۔ ادب دراصل جذبات و احساسات کے اظہار کا نام ہے اور جذبات و احساسات سب کے یکساں ہوتے ہیں۔ ایک شخص خواہ وہ امریکہ میں بیٹھا ہو' جاپان میں' چین میں یا پاکستان میں' اس کا تعلق خواہ دنیا کے کسی بھی خطے سے ہو' اس میں بنیادی جبلت (Basic Instinct) ایک سی ہوتی ہے۔ محبت و نفرت کے جذبات ایک سے ابھرتے ہیں۔ بھوک اور پیاس ایک سی لگتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک عالمگیر سچائی کا نام ہے اور عالمگیر سچائی کے اظہار کے لئے اگر مغرب کے مثبت اثرات قبول بھی کر لئے جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

عکسِ فن

غزل

طویل ظلمت جو ہم نے کاٹی اسے بھی تم مختصر کہو گے
عذاب جاں کے سوا یہاں پر تم اور کس کو ثمر کہو گے

میں شمع امید بن کے اب تک' قطرہ قطرہ پگھل رہی ہوں
مجھے بتاؤ کہ فرقت شب کی اور کس کو سحر کہو گے

شروع ہم نے سفر جہاں سے کیا تھا اب بھی وہیں کھڑے ہیں
ذرا بتاؤ کہ زندگانی میں اور کس کو بھنور کہو گے

خدائی صفتوں کے مدعی سیکڑوں ہی پھرتے ہیں اس جہاں میں
خدا کی بستی میں اب یہ سوچو کہ اور کس کو بشر کہو گے

تمام عالم تڑپ کے جاگا ہے اب ہر اک بوند پر لہو کی
سکوت شب میں وفا ہماری کا اور کس کو اثر کہو گے

جو شاعرہ ہو نئے معانی کی کوئی تشبیہ نو بتاؤ
نہیں گر آنکھوں میں آرزو کی چمک تو کس کو قمر کہو گے

اس بھرے شہر میں جو ایک شناسا تھا مرا
اس نے قاتل کو مرا گھر بھی دکھا رکھا تھا۔

ذکیہ غزل

Zakia Ghazal
B-322, Block-10
Near Sadaat-e- Amroha
Karachi, Pakistan

ذکیہ غزل

کراچی

عورتیں تو ہر دور میں اپنے معاشرے کی زیادتی کا شکار رہی ہیں لیکن بہادر عورتوں نے سپر ڈالنے کی بجائے حالات کے خلاف جنگ کی اور پھر حق کی بالا خر فتح ہوئی۔

ذکیہ غزل بھی ناموافق حالات کا شکار رہیں۔ ذکیہ نے بتایا انہیں بھی اپنے شاعرہ ہونے کی قیمت گذشتہ دس سالوں میں چکانی پڑی۔ وہ اپنے اندر کی حساس لڑکی کو نہیں مار سکیں اور اپنے ظاہر و باطن کی سرد جنگ سے نبرد آزما ہونے کے بعد شعر و ادب کی دنیا میں واپس لوٹیں۔ اب ذکیہ اپنے آپ کو نئے سرے سے تازہ دم محسوس کر رہی ہیں اور خوب لکھ رہی ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ء کلام 1998ء میں منظر عام پر آنے کی توقع ہے۔

20/ اکتوبر کو 1963ء کو کراچی میں جنم لینے والی ذکیہ وسیم نے نفسیات میں ایم اے کیا۔ اپنے کالج کی انجمن کی صدر اور ڈپارٹمنٹ کی کونسلر رہیں۔ 3 گولڈ میڈل 65 ٹرافیاں بے شمار سرٹیفکیٹ اور چاندی و براس کے تمغے اپنی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں پر حاصل کئے۔ ترنم ان کا بڑا دل موہ لینے والا ہے۔ اپنے زمانے کی بہترین نعت خواں، بہترین کمپئر بھی رہی ہیں۔ غزل تخلص اختیار کیا اور طالب علمی کے زمانے میں بہترین شاعرہ کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا۔ ریڈیو پاکستان کی ورلڈ سروس میں 5 سال تک اناؤنسر کے فرائض انجام دیئے لیکن شادی کے بعد گوشہ ء خاموشی میں چلی گئیں۔ والد کی بے وقت موت نے بھی ذکیہ غزل کو بہت پریشان رکھا۔ وہ ذکیہ کو ایک کامیاب لڑکی دیکھنا چاہتے تھے۔ اب ذکیہ نے دوبارہ ادبی سرگرمیاں شروع کردی ہیں۔ مختلف جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا ہے۔ مطالعہ بھی خوب کر رہی ہیں۔ غزل خود کو کسی مخصوص مکتب فکر سے منسوب کرنا مناسب نہیں جانتیں۔ کہتی ہیں شاعر

کو اپنا کینوس وسیع رکھنا چاہئے اور ہر موضوع کو احاطہ ء فکر میں لانا چاہئے۔ اظہار خیال کے لئے غزل کو بہترین ذریعہ سمجھتی ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اچھے دل نشیں اور کم سے کم الفاظ میں اپنی بات کا خوبصورت پیرائے میں اظہار صرف غزل میں ہی ہو سکتا ہے۔ نثری نظم کو بھی شاعری کی ایک صنف سمجھتی ہیں اور نظمیں بھی لکھتی ہیں لیکن غزل کی طرف رجحان زیادہ ہے۔

مشاعروں کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ کسی شاعر کو ایک مقام دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تخلیقی نشستیں آپ کی ادبی تخلیق میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ سینئرز شعراء کی رہنمائی ملتی ہے' لہٰذا دونوں ہی ایک شاعر کو اس کی راہ متعین کرنے میں مددگار ہیں لیکن آج کل جو ادبی سرکل ہے' اس میں گروہ بندیاں بہت ہیں۔ عجب قسم کی سیاست' منافقانہ رویہ' منہ پر تعریف اور پیٹھ مڑتے ہی برائی' یہ ہم ادبی دنیا کے لوگوں کو زیب نہیں دیتا اور اس سے نئے آنے والوں کی بڑی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

ذکیہ کہتی ہیں کہ "میری زندگی کا اہم واقعہ یہ ہے کہ جب مجھے 3 گولڈ میڈل ایک ساتھ ایک ہی سال میں ملے۔ ٹی وی اور اخبارات اور رسائل میں ایک ساتھ میرے کئی انٹرویوز چھپے' یہ سب بہت ہی پر کشش تھا لیکن اتنی بلندی پر پہنچ کر میری شادی اور گوشہ نشینی کے 11 سال مجھے بڑی حد تک ختم کر گئے تھے اگر میرے سسر اور میرے شوہر میری ہمت دوبارہ نہ بندھاتے اور میرے ساتھ تعاون نہ کرتے تو آج میں دوبارہ آپ کے سامنے نہ ہوتی۔"

غزل کا کہنا ہے کہ "قاری کا رشتہ ادب سے یوں ٹوٹ گیا ہے کہ نئی نسل کے لئے دلچسپی کے دوسرے سامان فراہم ہوگئے ہیں اگر آپ کے گھر کا ادبی ماحول ہے' تب بھی آپ اپنے بچوں کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ بھی اپنا رجحان اس طرف کریں۔ جب نئے لکھنے والے نئے ذہن اس فیلڈ میں نہیں آئیں گے تو ہم پر مزید آگہی کے در کیسے کھلیں گے۔ ہمارا ادب بھی گلیمرائز ہوگیا ہے' رسائل و جرائد فلمی میگزین اداکاروں کی تصویریں' ٹی وی سے ہٹ کر نہیں ہوتے حتیٰ کہ روزمرہ کے اخبارات میں بھی چٹ پٹی قسم کی اداکاروں سے متعلق اور شو بزنس سے متعلق خبریں زیادہ ہوتی ہیں۔ نوجوان طبقہ انڈین میگزین زیادہ خریدتا ہے۔ رہی سہی کسر ڈش انٹینا نے پوری کر کے تمام معاشرے کو ایک غیر اخلاقی سبق دے رکھا ہے۔ لوگ مطالعہ سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں چند لوگ تمام اذہان کو کیسے ادب کی طرف موڑ سکتے ہیں۔ ادب سے زیادہ پر اثر کوئی دوسری چیز نہیں لیکن اگر اسے کوئی پڑھے' تب نا!

سینئر شعراء اور ادیب کا کہنا درست ہے کہ ہم مغرب کی پیروی کر کے کبھی بھی اچھے معاشرے کے فرد نہیں بن سکتے۔ ہمیں اپنے ادبی کینوس کو اپنے معاشرے کے مسائل کے حل کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ حسیت احساس و شعور ہمارے اپنے ہونے چاہئیں۔

ے لئے یہ بات باعث فخر ہونا چاہئے کہ ہمارے پاکستان کے رہنے والے دیارِ غیر میں اپنی
خت بنائے رکھنے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہیں۔ اردو کو فروغ دے رہے ہیں اور اس
ے منسلک وہ تمام کام کر رہے جو ہماری زبان و ادب کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ اچھا ادب
ب ہی تخلیق ہو سکتا ہے، جب اس کے گرد گھومنے والے مسائل، احساس و شعور ہمارے
پنے ہوں، ہم اپنے معاشرے کے دکھ دور کریں، ان کو اردو زبان اور اردو ادب سے محبت کا
س دیں اور اس کی تخلیق و ترویج کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ہم زبان و ہم خیال
ر جدوجہد کریں۔ ؎؎

عکس فن

غزل

خالی دیوار تھی اور ایک دیا رکھا تھا
ہم نے یہ دل بھی سرِشام بجھا رکھا تھا

اب تو روپوش ہے وہ ہجر کی آندھی لوگو
جس نے اشجار سے پتوں کو جدا رکھا تھا

تجھ سے ٹکرا کے جو آئی تھیں ہوائیں مجھ تک
بخدا ہجر کے موسم میں مزا رکھا تھا

اب لہو سرد ہے اور برف ہے اپنا احساس
ہم نے الفاظ سے لوگوں کو جگا رکھا تھا

کوئی تتلی ہے، ہوا ہے نہ سندیسہ کوئی
میں نے تو گھر کا دریچہ بھی کھلا رکھا تھا

اس بھرے شہر میں جو ایک شناسا تھا مرا
اس نے قاتل کو مرا گھر بھی دکھا رکھا تھا

یہ الفت بھی تجسس کو عجب انداز دیتی ہے
تمہارے جسم کی خوشبو مجھے آواز دیتی ہے

محمد غوث متھراوی

Ghous Mathravi
76/2, Street 24
Khiyaban-e-Badar, Phase-6
Defence Housing Authority
Karachi, Pakistan

غوث متھراوی

کراچی

یہ تو متھرا کی مٹی کا کمال ہے کہ جو اس کی مہک سونگھتے ہوئے اس کے سینے پر جنم لے لے، پریم کے اشلوک بانٹنا اس کا مقدر ٹھہرے۔ چاہے وہ کرشن ہوں یا پیرزادہ غوث محمد شاہ جیلانی۔ پھر یہ اس مٹی کے پتلے کا کرتو یہ ٹھہرا کہ وہ ان اشلوک کی نگہبانی کس طرح کرتا ہے۔ پیرزادہ غوث محمد شاہ جیلانی نے بھی اس نکتے کو پالیا تھا چنانچہ غوث متھراوی بن کر انہوں نے دنیاوی عشق کے زینے طے کرتے ہوئے عشق مجازی کی منزلوں تک بہرطور رسائی حاصل کرلی۔ کہتے ہیں۔۔۔

تیرگی سے بھی نکل آئیں گے روشن پہلو
شمع کو بھی تو اندھیروں سے جلا ملتی ہے

یوپی (بھارت) کے شہر متھرا میں 30 دسمبر 1939ء کو بزرگوار ظہور الحسنین تاجی (مرحوم) کے گھر پیدا ہونے والے پہلے بیٹے کا نام والدین نے پیرزادہ غوث محمد شاہ جیلانی رکھا۔ یہ نام خود اپنے اندر ایک ولیانہ کمال رکھتا ہے اور خود اپنے تقدس کی آبرو بھی ہے۔ غوث صاحب کے والد محترم سول سرونٹ تھے لیکن عالم اور جید بزرگ بھی تھے۔ پورے برصغیر میں ان کے سینکڑوں مریدین ہیں۔ ان کا مزار اور خانقاہ حیدر آباد سندھ میں ہے، جہاں سال رواں میں ان کا 17 واں عرس منایا گیا۔ گدی کی سجادہ نشینی غوث متھراوی صاحب کے حصے میں آئی ہے، جسے بہ طریق احسن نبھا رہے ہیں۔

غوث نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ، کراچی اور حیدر آباد میں پائی۔ گریجویشن سندھ مسلم

کالج کراچی سے کیا۔ بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم برطانیہ سے لی۔ بینکنگ اور کئی مینجمنٹ
کورس دوران ملازمت کراچی سے کیئے۔ سیمینار اور مشاعروں میں شرکت کے لئے کئی
ممالک کا دورہ کیا۔ انڈسٹریل ڈیولپمنٹ میں تیس سال سے زیادہ عرصے تک ملازمت کی۔ لیکن
وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت تک پہنچ کر علیحدگی اختیار کی اور اب نجی شعبہ سے ایڈوائزر کی
حیثیت سے وابستہ ہیں۔ اپنی خود نوشت لکھ رہے ہیں۔ رجسٹر کے چار سو پچاس صفحات بھر
چکے ہیں مگر ابھی داستان حیات نصف تک بھی نہیں پہنچی۔ دو بیٹیاں ڈاکٹر ہیں جو ڈاکٹروں سے
بیاہ کر امریکہ میں آباد ہیں۔ بڑے صاحبزادے مہدی حسنین مون، میکنیکل انجینئرنگ کر کے
بیگم کے ہمراہ امریکہ MBA کرنے گئے ہیں۔ وہ بھی مزاح نگار ہیں اور محترم دلاور فگار کے
شاگرد رشید ہیں۔

غوث متھراوی شاعری کے علاوہ نثر نگاری موسیقی اور دیگر شعبہ ء فنون سے بھی دلچسپی
رکھتے ہیں لیکن غزل ان کا پسندیدہ ذریعہ اظہار ہے۔ کہتے ہیں.... "غزل کہنا آسان نہیں، بڑی
تخلیقی اور مجاہدے کا کام ہے۔ غزل کے ایک ہی شعر میں پوری داستان یا ایک مکمل خیال کو
پرو کر جو ہار بنتا ہے، اس کی خوشبو کی الفاظ میں تعریف کرنا آسان نہیں۔"

غوث متھراوی کا غزلیات پر مبنی مجموعہ "آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے" 1987ء میں چھپ چکا
ہے۔ "بلاوا" کے عنوان سے نعتیہ شعری مجموعہ 1992ء میں اور تصوف پر مضامین اور
تبصروں کا مجموعہ "کشف المعروف" 1993ء میں غزلیات کا مجموعہ "دشت جنوں" 1997ء میں
شائع ہو چکا ہے۔

زیر طباعت تخلیقات میں "کرشمہ" (خود نوشت) "کیسے کیسے لوگ" (شخصیات) اور
انگریزی اور اردو میں مضامین و افسانوں کا مجموعہ شامل ہیں۔

اپنی زندگی کا یادگار واقعہ سناتے ہوئے غوث متھراوی نے کہا.... "نو سال کی عمر میں
حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کی شان میں منقبت کہی، جس کو علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن
حیدر آباد سندھ کے سالانہ جلسے میں اس لئے پڑھنا تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح اس جلسے کی مہمان
خصوصی تھیں۔ پوری کی پوری منقبت والد صاحب کی اصلاح کی نذر ہو گئی بلکہ یوں کہئے کہ وہ
منقبت اب والد صاحب کی تھی اور ہماری شمولیت بس دو چار لفظوں کی حد تک تھی لیکن والد
صاحب کا اصرار یہی رہا کہ یہ منقبت ہم نے کہی ہے۔ اس میں خیال و فکر ہماری ہے چنانچہ
منقبت ہم نے ترنم سے پڑھی۔ محترمہ فاطمہ جناح نے نقد مبلغ پچاس روپیہ انعام دیا اور
ہماری آٹو گراف بک میں اپنے دستخطوں سے بھی نوازا۔"

غوث متھراوی کا کہنا ہے کہ اردو کا مستقبل یقیناً" تابناک ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے
کہ "اس کا رسم الخط دنیا کے زیادہ تر حصوں میں جو کہ سارے کے سارے اسلام کے نام لیوا

ہیں استعمال ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ انگریزی کی طرح اردو بھی بہت میٹھی اور شستہ زبان ہے۔ تعجب اور خوشی کی بات یہ ہے کہ نہ صرف برصغیر میں بلکہ دنیا کے ہر ملک میں آپ کو انگریزی کے بعد اردو بولنے والا مل ہی جائے گا۔ پھر اردو میں ایک جاذبیت یہ ہے کہ وہ دنیا کی مختلف زبانوں کو اپنانے کی ہمت بھی رکھتی ہے اور اہلیت بھی۔"

نثری نظم کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ "نثری' نظم کا کوئی میٹر اور ڈائریکشن یا یوں کہئے کہ اس کی ترکیب تخلیق ابھی تک متعین نہیں ہو سکی ہے۔ یہ شاعری تقریباً" چالیس برس سے ہو رہی ہے۔ اس کو پسند کرنے والا وہ پڑھا لکھا طبقہ ہے کہ جو تحقیقی اور فلسفیانہ سوچ رکھتا ہے' ان میں زیادہ تر ہماری بزرگ نسل کے چند معتبر شاعر و ادیب ہیں لیکن ان کے پیروکار ابھی تک کھل کے سامنے نہیں آئے اور میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل اگر نثری نظم کو اسی شدت سے لے کر آگے نہ بڑھ سکی جیسا کہ میرا جی۔ ن۔ م راشد' عزیز حامد مدنی' شمس الرحمان فاروقی وغیرہ اسے لے کر آگے بڑھے تو پھر نثری نظم کا مستقبل اتنا تابناک نہ ہو گا۔ اب جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے' شاعری کی تخلیق اور اس کو آگے بڑھانے کے لئے دونوں ہی عمل ضروری ہیں یعنی بڑے مشاعروں کا انعقاد اور نشستوں کا جاری و ساری رہنا۔ پھر ادبی جرائد اور رسائل کا بھی جاری رہنا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ کلام عوام الناس تک' اخبار اور رسائل کے ذریعے ہی پہنچتا ہے۔

غوث متھرادی اس خیال سے متفق نہیں کہ آج قاری کا رشتہ ادب سے پہلے جیسا نہیں۔ کہتے ہیں.... "میں اس بات سے مکمل طور پر متفق نہیں ہوں۔ اصل میں ادب عمل یعنی **تخلیقیت**(Creative Activity) کے بغیر نہ نکھرتا ہے نہ سنورتا ہے۔ چنانچہ ادب میں تاریخ کا حوالہ بھی ہوتا ہے اور حال کا بھی۔ فکر کا ورود بھی ہوتا ہے اور مشاہدے کا تجزیہ بھی۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ادب کم لکھا جا رہا ہے اور کوڑا کرکٹ زیادہ' جس کا سبب لٹریچر کی ترویج میں کمی اور تکنیکی علم کی طرف توجہ زیادہ ہونا ہے۔ Garbage اور ادب میں فرق ہے۔ ادب بے اثر ہو نہیں سکتا لیکن اب اگر ادب پڑھنے والوں میں کمی ہو جائے تو پھر کتابیں خریدی نہیں جاتیں اور جب کتابیں خریدی نہیں جائیں گی تو ان کو کون چھاپے گا۔ بڑے قیمتی گوہر نایاب اور ادب کے خزانے صندوقوں میں مقفل ہی رہ گئے ہیں لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ایک نسل چھوڑ کر دوسری نسل ضرور اپنے آنے والی نسل کے فکری روحانی اور ادبی شعور کو روشن کرتی ہے۔"

غوث متھرادی کہتے ہیں.... "میں سینئر ادیبوں کی اس رائے سے بالکل متفق نہیں ہوں۔ ادب ایک عالمی مظاہرہ ء تخلیق و تعمیر ہے جو معاشرہ کی ہر جہت کا احاطہ کرتا ہے اور بیرونی و اندرونی اثرات سے Interact کر کے شعوری اور غیر شعوری کیفیات کو معرض وجود

میں لاتا ہے اور معاشرے کی کلی طور پر تطہیر اور تعمیر کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کو نظرانداز نہ کیا جائے کہ معاشرے کے بیرونی ادبی پہلوؤں کی بات ہو رہی ہے نہ کہ بیرونی فیشنوں کی یا بیرونی ادب کے حوالے سے کوڑا کرکٹ کی۔

عکس فن

غزل

زندگی کے اس سفر کے درمیاں' رابطے اپنی جگہ موجود تھے
قربتیں اپنی جگہ موجود تھیں' فاصلے اپنی جگہ موجود تھے

اس دل بیمار میں کچھ زخم تھے' مندمل بھی ہو گئے کب کے تو کیا
ان گلابوں کی مہک کے آج تک' تذکرے اپنی جگہ موجود تھے

بے یقینی کے تناظر میں سفر' کر رہی تھیں دھڑکنیں دل کی مگر
ہمتیں ٹوٹی نہ تھیں ان کی ابھی' حوصلے اپنی جگہ موجود تھے

وصل کی خواہش میں شدت کچھ اگر' ہو گئی کم بھی ہوا کیا فائدہ
ہجر کی تنہائی میں ڈوبے ہوئے' رت جگے اپنی جگہ موجود تھے

ہم غبار بے حسی کی دھند میں' خود تعین کر نہ پائے راہ کا
ورنہ منزل پر پہنچنے کے سبھی' راستے اپنی جگہ موجود تھے

گو ضعیفی کے کسی حصے میں ہم' ہو چکے داخل مگر یہ بھی تھا سچ
دل کی دھڑکن میں جوانوں کی طرح' ولولے اپنی جگہ موجود تھے

گفتگو کا سلسلہ ہر دور میں' بات کو لے کر بڑھا آگے ضرور
فیصلے بھی کچھ ہوئے مثبت مگر' مسئلے اپنی جگہ موجود تھے

ختم ہونے کو نہیں آتا تھا کیوں' زندگانی کا سفر پھر اس پہ غوث
فکر فردا کی تمازت کے سبھی' سلسلے اپنی جگہ موجود تھے

ہوا چلے گی تو خوشبو مری بھی پھیلے گی
میں چھوڑ آئی ہوں پیڑوں پہ اپنے ہاتھ کے نقش

فاطمہ حسن
۸ / ۱۲ / ۹۷

Fatema Hassan
D-41, Block7, Gulshan-e-Iqbal
Karachi-75300, Pakistan

فاطمہ حسن

کراچی

فاطمہ حسن کے مجموعہ کلام "دستک سے در کا فاصلہ" میں منیر نیازی لکھتے ہیں کہ "کوئی گہری بات اس کے جی میں ہے، جس سے وہ خود بھی بے خبر ہے۔ اس کی ساری شاعری اس بات کی تلاش اور اس تلاش کے سفر میں جو اس پر بیتی اس کا بیان ہے۔"

یہ بیان صرف فاطمہ پر بیتی کا نہیں بلکہ جگ بیتی کا بھی ہے۔ اس جگ بیتی میں فاطمہ نے خود کو اتنا گم کرلیا کہ وہ جگ بیتی فاطمہ کی اپنی بیتی لگنے لگی۔ اس مجموعہ کلام سے فاطمہ کی ایک نظم "گھر" انہی صفحات پر آگے میرے کہے کی گواہی دے گی۔ میرا ایقان ہے کہ سب کے دکھوں سے محبت کرنے والے پر ہی سچی شاعری وارد ہوتی ہے تو آیئے فاطمہ سے ملتے ہیں۔

فاطمہ کچھ اپنے بارے میں بتاؤ گی؟ "کیوں نہیں۔ میرا نام سیدہ انیس فاطمہ ہے۔ فاطمہ حسن کے نام سے لکھتی ہوں، تخلص کوئی نہیں ہے۔ 25 جنوری 1953ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی ڈھاکہ چلی گئی۔ وہاں سے میٹرک اور انٹر کیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو آنرز فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی، جب سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا۔ 1973ء میں بھارت اور نیپال ہوتے ہوئے کراچی آئی۔ یہاں سے بی اے اور پھر جامعہ کراچی سے صحافت میں ایم اے کیا۔ 1977ء میں محکمہ اطلاعات سندھ سے بحیثیت نائب مدیرہ وابستہ ہوئی۔ 1983ء تک اسی محکمہ سے وابستہ رہی۔ پھر سوشل سیکورٹی انسٹی ٹیوشن (سیسی) میں ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ آج کل اسی ادارے میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ تربیت و تحقیق ہوں۔ درمیان میں پانچ سال کے لئے سندھ کچی آبادی اتھارٹی میں ڈپٹی ڈائریکٹر کوآرڈی نیشن اینڈ مانیٹرنگ کی حیثیت سے ڈیپوٹیشن پر کام کیا۔ ملازمت کے علاوہ ادبی، ثقافتی

اور سماجی بہبود کی انجمنوں سے بھی وابستگی ہے۔ انجمن تجارت' ملازمت و زراعت پیشہ خواتین کی نائب صدر' آرٹس کونسل کی گورننگ باڈی کی رکن' پبلسٹی کمیٹی کی چیئرپرسن اور ادبی کمیٹی کی کوچیئرپرسن ہوں۔ 1984ء میں شوکت علی زیدی سے شادی ہوئی جو چارٹرڈ سول انجینئر ہیں اور آغا خان یونیورسٹی ہسپتال سے بحیثیت کنسٹرکشن مینجر وابستہ ہیں۔ ایک بیٹی اسریٰ زیدی ہے اور کچھ؟"

شاعری کے علاوہ اور کس صنف میں لکھا۔ میرا مطلب افسانے وغیرہ سے ہے؟ "جی ہاں! شاعری کے علاوہ افسانے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اردو ادب کے ایک سینئر اور بہت ہی معتبر مشہور شاعر منیر نیازی کے تازہ مجموعہ کلام "سیاہ شب کا سمندر' سفید دن کی ہوا" کا دیباچہ لکھنے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔ شروع سے رجحان ترقی پسندی کی طرف تھا لیکن جدید شاعری کو ترقی پسند ادب کا ارتقاء سمجھتی ہوں جبکہ روایتی کلاسیکی ادب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ میرا کلام تقریباً" تمام ادبی جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ پہلا مجموعہ کلام "بہتے ہوئے پھول" 1977ء میں شائع ہوا۔ 1973ء سے 1976ء تک کی شاعری پر مشتمل تھا۔ دوسرا مجموعہ ء کلام "دستک سے در کا فاصلہ" 1993ء میں شائع ہوا۔ یہ 1977ء سے 1992ء تک کی شاعری پر مشتمل ہے۔ میری کافی نظموں اور غزلوں کے انگریزی تراجم ہوئے ہیں' جو جلد ہی کتابی شکل میں شائع ہو جائیں گے۔ یہ تراجم آسٹریلیا میں اسٹھلاڈ ڈرائی لینڈ اور لندن میں ڈیوڈ میتھوز نے کئے ہیں۔"

فاطمہ تمہاری زندگی کا کوئی اہم واقعہ جس سے تم بہت متاثر ہوئی ہو؟ میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ سقوط ڈھاکہ کا حادثہ تھا جبکہ راتوں رات ہماری زمین' قومیت اور جھنڈے کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ اس حادثے نے میری زندگی پر جو اثرات مرتب کئے ہیں' ان کی جھلک میری تحریروں میں نمایاں ہے۔

کیا تم محسوس کرتی ہو فاطمہ کہ ہمارے اپنے ملک میں بھی ایک بڑے فیشن پرست طبقے کے بچے یعنی ہماری نئی نسل کو اردو سے دلچسپی نہیں۔ یوں اردو کا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔ فاطمہ نے سوال سنا پھر اعتماد سے بولیں۔

میں شمار و قطار میں پڑنا نہیں چاہتی لیکن اتنا کہوں گی کہ اردو زبان میں بڑھنے اور پھیلنے کی گنجائش ہے۔ اس زبان کے ارتقاء پر نظر ڈالی جائے تو اس کا سفر کم نظر نہیں آتا بلکہ ساری دنیا میں خصوصاً" برصغیر کے لوگوں کے رابطے کی زبان اردو ہی ہے' اس لئے میں اس کے مستقبل سے بہت پرامید ہوں۔

فاطمہ شاعری کو اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتی ہیں کیونکہ اس میں بیک وقت منظر' کیفیت اور فضا تخلیق کرسکتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نثری نظم آج کے دور کا تقاضہ ہے کیونکہ زندگی

میں بہت پیچیدہ اور تلخ حقائق کا ادراک بہت شدید ہے۔ تاہم دوسری اصناف سے بھی روگردانی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ہر خیال اپنا پیرایہء اظہار خود لے کر آتا ہے۔ مشاعروں کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ آج مشاعرے ادب کی تخلیق میں معاون ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔ مشاعرے کمرشل بنیادوں پر دیگر تفریحی پروگراموں کی طرح منعقد کئے جا رہے ہیں' جن میں ادبی ذوق سے زیادہ عوامی تفریح کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ ایسے سنجیدہ مشاعرے جہاں اعلیٰ ادبی فن پارے یا نیا کلام پیش کیا جاتا ہو تقریبا" مفقود ہو گئے ہیں۔ سنجیدہ تخلیقی ذہنوں کی تسکین کے لئے ادبی نشستیں ہی بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں اور نئے لکھنے والوں کے لئے معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

ادب سے قاری کا رشتہ کس حد تک برقرار ہے؟ اس سلسلے میں فاطمہ حسن کہتی ہیں کہ یہ ایک بہت بڑی بحث ہے۔ اس پر گفتگو کرنے کے لئے دور حاضر کا پورا جائزہ لینا پڑے گا کیونکہ آج دنیا وہ نہیں رہی ہے' جس میں رابطے روبرو ہوتے تھے بلکہ آج کی دنیا ایک گلوبل ولیج ہے اور قاری کے لئے ساری دنیا کا ادبی مواد مہیا ہے۔ ایسے میں ابلاغ عامہ کے ذرائع خصوصا" ٹیلی ویژن اور فلم نے بھی قاری کے وقت کا کچھ حصہ لے لیا ہے۔ مگر ادب جس ذریعے سے بھی اس تک پہنچے گا' اس کے اثرات تو پڑیں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جو کچھ بڑی تعداد میں لکھا جا رہا ہے' وہ ادب عصر حاضر کی حسیت کا ساتھ دے رہا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ کیونکہ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں' چنانچہ جو خوش نصیب تخلیق کار اپنے دور کی حسیت کو گرفت میں لے لیتا ہے' وہی زندہ رہ جاتا ہے۔

فاطمہ اس رائے سے متفق نہیں کہ آج ہم مغرب کے رجحانات اور اس کے ادب کی پیروی کر کے وہاں کے ادبی فیشن اپنے ملک میں درآمد کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ

اب مغرب اور مشرق کے فاصلے ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ میں گذشتہ دنوں یورپ کی خواتین کی تخلیقات پڑھ رہی تھی' جو زیادہ سے زیادہ پچاس سال پہلے لکھی گئی ہیں۔ آج ہمارے اپنے مسائل تقریبا" وہی ہیں' جو اس زمانے میں وہاں کی خواتین کے تھے۔ اس طرح ہمارے مرد لکھنے والوں کے رویے بھی خواتین کے ساتھ وہی ہیں' جو وہاں کے ناقدین کے تھے۔ یہ تو میں نے صرف خواتین کے ادب کے حوالے سے مثال دی تھی لیکن شہری زندگی اور انڈسٹریل ایج نے جو اثرات مرتب کئے ہیں اور تیزی سے ہجرت کے عمل نے جو مسائل اور شعور پیدا کیا ہے' اس کے زیر اثر پیدا ہونے والا ادب خواہ مشرق میں لکھا جا رہا ہو یا مغرب میں' ہندوستان میں لکھا جا رہا ہو یا افریقہ میں صرف ادب ہے جو متاثر کرتا ہے۔ رہی رجحانات کی درآمد تو دو طرح کے لکھنے والے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو صرف نقالی (Immitate) کرتے ہیں

اور ایک وہ جو اپنی طرف سے کچھ اوریجنل چیزیں بھی پیش کرتے ہیں۔ مغرب میں جس شعبے میں کام ہو رہا ہے، بہت سنجیدگی سے گہرائی میں جاکر کام ہو رہا ہے۔ خواہ وہ شعبہ Anthropologhy ہو یا میڈیسن کا یا ادب کا۔ ان کی جانب دیکھنا، انہیں سمجھنے کی کوشش کرنا اور ان سے سیکھنا کوئی ایسی بات نہیں، جس پر محاذ آرائی کی جائے۔ امیٹیشن لیٹریچر لکھنے والا تو کہیں نہ کہیں سے دانستہ یا غیر دانستہ نقالی کر رہا ہو گا خواہ وہ ہمارے یہاں کے اپنے ادب کی جگالی کر رہا ہو یا مغرب سے در آمد کر رہا ہو۔

عکسِ فن

گھر

ایک مکان اور بستر ہے
اور برتن سے
کیا گھر بنتا ہے
گھر بنتا ہے تم سے
تم جو بنتے رہتے ہو
بنتا ہے گھر بھی
روٹھو گے جو تم
تو روٹھے گی ہر چیز
چیزوں میں ہو جاؤں گی تبدیل
بستر اور برتن کی طرح
بستر یا برتن سے
کیا گھر بنتا ہے
گھر بنتا ہے تم سے

نہ بدن کا لطف بدلا، نہ نظر کا عکس بدلا
وہی خوش گلی ستارے، وہی گلشن کی پری ہے

کاوش عباسی

Kawish Abbasi
P.O. Box 8080
Riyadh 11482
Saudi Arabia.

کاوش عباسی

ریاض

کہتے ہیں۔۔۔۔ ''ادب کا بنیادی موضوع ہمیشہ سے انسان ہی رہا ہے خواہ کسی طرح بھی اس کو بیان کیا جائے کاوش عباسی بھی یہی کہتے ہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر وہ سچائی اور عظمت انسان کی منزلوں تک پہنچنے کے لئے فکر کی مشعل روشن کرتے ہوئے کہتے ہیں۔'' ۔

صاف مکرنا جھوٹے خواب تھما دینے سے اچھا ہے
سامنے کرنا ریت میں سر کو دبا لینے سے اچھا ہے

اک بحر مواج ہے فکر ازل تو اس کے تھپیڑوں کی
مار میں رہنا ساحل پر کشتی کھینے سے تو اچھا ہے

13 / جنوری 1953ء کو پنجاب کے شہر ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہونے والے غلام ابوذر عباسی نے کالج میں طالب علمی کے زمانے میں شعر گوئی کا آغاز کیا اور کاوش تخلص اختیار کرتے ہوئے کاوش عباسی کے نام سے ادبی دنیا میں وارد ہوئے۔ سول انجینئرنگ میں بی اے کی ڈگری انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی لیکن اندر ایک تڑپ تھی کہ کسی طرح اپنے پسندیدہ اردو' انگریزی یا کسی اور دلچسپ مضمون میں ایم۔ اے کریں مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔
لاہور میں انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران 70/71 سے لے کر 1977ء تک ادبی لحاظ سے کافی سرگرم رہے۔ حلقہء ارباب ذوق' ترقی پسند' مصنفین' نئے افق اور دیگر ادبی حلقوں میں جاکر اکتساب علم کرتے رہے۔ ان کے بقول ستر کی دہائی پاکستان میں نئے نظریات کی دہائی تھی اور 1980ء کی دہائی ان نئے نظریات کی پسپائی کی دہائی تھی۔ انہوں نے اس عرصے میں مارکس

ازم اور وجودیت کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ کچھ ملک کے سیاسی حالات اور کچھ ان کے اپنے حالات کی ابتری سے 1977ء میں انجینئرنگ کی فائنل ڈگری لی۔ ملازمت کی وجہ سے لاہور اور راولپنڈی میں کچھ وقت گزارا اور پھر مارچ 78ء میں ملازمت کی وجہ سے کراچی آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

جون 78ء میں ان کی شادی طلعت سے ہوئی۔ طلعت نے سینٹ جوزف کالج کراچی سے مائیکرو بیالوجی میں بی ایس سی کیا ہے۔ گورکھ پور کے ایک ہجرت زدہ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ دو مختلف کلچر ملے لیکن طلعت اور کاوش کے سلیقے سے ان دو مختلف کلچر کے سنگم نے ایک نئے کلچر یعنی محبت کے کلچر کو جنم دیا۔ 81ء میں کاوش کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی تو یہ خاندان ریاض میں مستقل ہو گیا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے مستقل قیام کے لئے طلعت کراچی آگئی ہیں۔ سخن ور حصہ سوم کا سوالنامہ انہیں میرے بھیا ضیاء خان نے بھجوایا جو آج کل لاس اینجلس میں ہیں۔ ضیاء خان کا تعارف سخن ور حصہ دوم میں شائع ہو چکا ہے۔ انتہائی محبت کرنے والا دل رکھتے ہیں۔ ضیاء خان بھی ملازمت کے سلسلے میں ریاض سعودی عرب میں تھے لیکن وسط 97ء میں ان کے بہت ذہین اور پیارے بیٹے شارق ضیاء کا اچانک کار کے حادثے میں انتقال ہو گیا۔ ضیاء لاس اینجلس آئے تو پھر بیگم کی تنہائی کی وجہ سے وہیں رک گئے۔ ضیاء خان کی معرفت کاوش عباسی کو بذریعہ فیکس سوالنامہ ملا تو انہوں نے فوراً" مجھے فیکس کے ذریعے تعارف بھیجا اور پھر طلعت کے ہاتھوں اپنی تصاویر بھجوائیں۔ طلعت سے ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ کاوش بلاشبہ خوش نصیب ہیں جو انہیں اتنی باشعور اور میٹھی گفتگو کرنے والی شریک حیات ملی ہے۔ یہ کاوش کی نیکیوں کا ہی ثمر ہو گا۔

کاوش کا کلام فنون' افکار' شاعر' سب رس' سوغات' صریر' تشکیل' اوراق تخلیق' طلوع افکار' نیرنگ خیال تجدید نو' ابلاغ اور ید بیضا میں باقاعدہ شائع ہوتا ہے۔ اپنے پہلے مجموعہ کلام کی تیاری میں مصروف ہیں اور شاعرانہ نام کی تلاش میں ہیں۔ ان کے کلام کی تخلیق زیادہ تر سعودی عرب میں ہوتی ہے یعنی انہیں صحرا خوب راس آیا ہے۔ شاعری میں غزل' نظم اور قطعہ کو بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں رباعی نئے زمانے کی روح اور مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ اسی طرح ہائیکو کے بارے میں کہتے ہیں کہ اردو کے مزاج کے حساب سے یہ جلد بازی اور سطحی اپچ کی شاعری کا منتخب کردہ سانچہ معلوم ہوتی ہے۔ نثری نظم کا آہنگ انہیں متاثر نہیں کرتا' جس طرح ایک پیدائشی غیر شاعر کو غزل کے اشعار کے بے وزن یا باوزن کا دراک نہیں ہوتا لیکن ساتھ ہی فیض احمد فیض کی مشہور عالم رائے پر بھی اکتفا نہیں کرتے اور نثری نظم کے بارے میں قطعی اظہار رائے نہیں کر سکے۔

کاوش کبھی کبھی تنقیدی مضامین لکھتے ہیں.... "مکتب فکر کے لحاظ سے خود کو ترقی پسند

خیالات کا حامی کہتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کا کہنا ہے کہ "میں جب 30 اور 40 کے عشرے کے ترقی پسند ادیبوں کی شاعری افسانے اور تنقید پڑھتا ہوں تو اکثر دل کو اچھا اور گہرا نہیں لگتا۔ کاش یہ لوگ زندگی اور فکر کی گہرائی میں اور زیادہ اندر اترتے۔ (حتیٰ کہ میرے پسندیدہ اور کبھی کے آئیڈیل فیض' مجاز' راشد اور ساحر بھی اکثرا کھڑے اکھڑے' محدود' پایاب اور کم اثر لگتے ہیں) ویسے عمومی طور پر اردو میں (خاص الخاص افسانے میں) لکھنے والوں میں اکثر کی ذہنی سطح اور زندگی میں (کے ساتھ) ان کی شمولیت ہمیشہ پھیکی' کمتر' قیاسی' غیرواقعاتی' تنگ' کچھ نہ کھولتی ہوئی اور امید شکن لگتی ہے' جس طرح زندگی خود کو انگریزی ادب و فن میں خود اپنی طرح ایک کھلے سمندر کی طرح وا کرتی ہے۔ ہمیں ایسی وسعت اور گہرائی بہت کم حاصل ہو سکی ہے۔ شاید تخلیق کاروں نے اپنی ذاتی زندگیوں اور ذہنی کرب میں اسے سمندر کی طرح وسیع و عمیق برتا ہو مگر ان کی **لکھتوں** میں ایسا ظاہر نہیں ہو سکا۔"

اردو کے مستقبل کے سلسلے میں پرامید ہوتے ہوئے کہتے ہیں.... "مجھے اردو کے مستقبل کے بارے میں کسی ناامیدی کی وجہ نظر نہیں آتی (تقسیم کی وجہ سے جو مصیبت ہم نے اردو پر اپنی نادان دوستی میں گزر جانے دی' وہ اردو کے نقصانات ہیں' اردو کا خاتمہ نہیں) اور پھر زبان اور زبان میں اظہار کا تعلق اعداد و شمار سے نہیں بلکہ ان لوگوں کی زندگی سے ہے' جن کی وہ زبان ہے۔ وہ زبانیں جو دنیا کے بیسویں' تیسویں یا ایک سو تیسویں نمبر پر ہیں' کیا وہ اور ان کے بولنے والے لوگ آگے جا کر ختم ہو جائیں گے یا وہ زبانیں قابل ذکر ادب پیدا کرنا بند کر دیں گی۔ کیا میر و غالب کے خیال میں بھی کبھی آیا ہو گا کہ ان کا عہد اور سماج یوں ختم ہو کر اور ایک دم بدل کر رہ جائے گا مگر ان کی شاعری آج بھی زندہ ہے اور عظیم ہے۔ کسی مشہور ترین **سائنسدان مثلاً** "آئین اسٹائن کو چھوڑ کر کیا لاکھوں غیر معروف سائنس دان مرے ہوئے یا بے وجود ہیں اور انہیں جی لگا کر کام نہیں کرتے رہنا چاہئے اگر میں بطور ایک شخص' ایک کم اہم وجود ہوں تو کیا مجھے یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے یعنی کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں کہوں کہ میں نے جی بھر کر زندگی کو جیا ہے۔

مشاعروں کی افادیت کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ "اگر مشاعروں میں آنے والے (سامعین) لوگ مشاعرے میں آنے سے پہلے کلاسیکل اور ہم عصر شاعری پڑھتے رہتے ہوں اور اس سے ایک مسلسل لگاؤ رکھتے ہوں تو مشاعرے مثبت ہیں لیکن اگر مشاعرے' لوگوں کے شعری ادبی شوق کا ایک واحد (Isolated) وجود قرار پائیں تو زیادہ ترمنفی کردار رکھتے ہیں اور کوئی خدمت کرنے سے زیادہ کئی رخی ابتری پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح تخلیقی نشستیں بھی اگر وہ صرف ناکام روزگار شاعروں کے احساس شکست کو کسی طرح کی جھوٹی سچی تسکین دلانے کی بیساکھیاں مہیا کرنے کا خیراتی شفاخانہ ہیں تو ان کا وجود سگریٹ کے دھوئیں کی طرح ہے (اور

یقیناً" منفی ہے) لیکن اگر یہ Gross ہیں اور اس میں کامیاب و معروف اور بڑے چھوٹے تمام شعراء شریک ہوتے ہیں تو یہ ادب میں صحت مند محرک اور ارتقا کا سبب ہو سکتی ہیں۔"

ادب سے قاری کا رشتہ استوار نہیں۔ اس ضمن میں کاوش کا خیال ہے کہ "بنیادی طور پر اردو شعرو ادب جس سماج کا پھول ہے، جن لوگوں کا نطق فنی ہے۔ اس سماج ان لوگوں ہی کا تعلق ہم عصر عمل سے کٹ گیا ہے۔ (میری مراد پاک و ہند کا سماج ہے) یعنی "اردو ادب کا سماج" ہی تھک ہار کر یا کچھ نہ کرنے کی وجہ سے ہم عصر عمل سے بچھڑا ہوا ہے مگر اب بھی اس کے لوگ اپنی ماضی بینی اور احساس ناچیزی سے جان نہیں چھڑا رہے تو نتیجہ اور بری خبریں بھی ہو سکتا ہے۔"

اس بچھڑے ہوئے اور مفلوک الحال سماج کے آدمی کی (جو اردو ادب کا قاری ہے) خواہشیں طلبات اور خواب ہی محدود و مسدود ہیں۔ نوکری اور گھربار کو پالنا یا مشکل سے گھربار میں پلنا۔ اس کی اوقات اسے ان دو چیزوں ہی سے فارغ نہیں ہونے دیتی تو وہ اپنی جوانی کی ادبی امنگوں کے لئے کہاں سے فرصت و اجازت لائے سو اگر اردو ادب سے قاری کا رشتہ کمزور ہوا ہے تو اس میں شاعرو ادیب کا قصور نہیں بلکہ قاری کا "مقصد" ہے اور سماج (یعنی سارے قاریوں) کی خطا ہے۔

آخری سوال کے جواب میں کہتے ہیں۔۔۔ "مغرب نام ہے علم و سائنس اور فکر و جذبہ کے، بے حد اور مسلسل فروغ و ارتقاء اور بازیافت کا، اس ضمن میں، میں سمجھتا ہوں کہ ساری "غیر مغرب دنیا" مغربیا (Westernise) ہو رہی ہے۔ صرف صورت یہ ہے کہ کم مغربیائے ہوئے کو زیادہ مغربیایا ہوا تو مکمل طور پر مغربیایا ہوا محسوس ہوتا ہے جبکہ اپنا کم مغربیانا (زیادہ والے کے مقابلے میں) اسے Still (ابھی) مشرقی لگتا ہے چنانچہ وہ "زیادہ" پر انگلی اٹھاتا ہے، اس کے لباس پر سیاہی لکھتا ہے، ساری کہانی یہ ہے پورا گلوب Westernise ہو رہا ہے مگر تخلیق ادب میں یہ مغربیانا رکاوٹ نہیں ہے۔ تخلیق ادب تو ویسے ہی ہو گا جیسے اس کے ازلی (Genetic) اصول ہیں۔ ہاں فیشن اور نقل بازی کی بات اور ہے۔ کند ذہن، کم فکر اور شہرت پسند لوگ ایسا ضرور کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے ورنہ اس پورے ماحول میں سچا ادب اعتبار پاتا ہی ہے اور پاتا رہے گا۔"

عکسِ فن

غزل

کہنے کو میرے تن پہ جو ٹانکے رفو کے ہیں
ٹانکے نہیں جمے ہوئے قطرے لہو کے ہیں

ٹپکی زمیں پہ ہے مرے حصے کی ہی شراب
ٹکڑے زمیں پہ میرے ہی ٹوٹے سبو کے ہیں

سازش سے کیوں ہو سر مری ہر منزل نجات
کیوں میرے سب طریقے کسی حیلہ جو کے ہیں

میداں میں اپنی جنگ نہ کیوں آپ میں لڑوں
کیوں مجھ سے لشکر آگے مرے تند خو کے ہیں

تم مجھ سے بے وفا ہوئے خود بھی اجڑ گئے
الٹے بھی کچھ کرشمے مری آرزو کے ہیں

دشمن ہو دشمنوں کے نہ تم دوستوں کے دوست
سب معرکے تمہارے فقط گفتگو کے ہیں

سنگت میں جن کی تم نے بہایا ہمارا خوں
وہ لوگ آج پیاسے تمہارے لہو کے ہیں

مشقِ ستم تو ہم ہیں سبھی ہم پہ صاف ہے
تم میں بھی سب شعار تمہارے عدو کے ہیں

اداکاری میں بھی سو رنج کے پہلو نکل آئے
کہ فنکارانہ روتے تھے مگر آنسو نکل آئے

پیرزادہ قاسم

دسمبر ۱۹۹۷

Pirzada Qasim
13/A, Staff Town,
Karachi University
Karachi-75270, Pakistan

پیرزادہ قاسم
کراچی

ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن جب بھی ایسا ہوتا ہے تو قلم ہاتھ میں لے کر اپنے ہی ذہن اور اپنی فکر کے ساتھ جہاد کرنا پڑتا ہے' تب کہیں جا کر الفاظ کے شگوفے پھوٹتے ہیں اور تحریر کا دریا رواں ہوتا ہے۔

ایسا ہی اس دن بھی ہو رہا تھا۔ میں کاغذ پھیلائے گاؤ تکیے سے پیٹھ ٹکائے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس تذکرے کا آغاز کس طرح کیا جائے۔ بس ایک جملہ چاہئے تھا۔ ایک ایسا جملہ کہ جس کے سہارے اس شخصیت کا بھرپور عکس سامنے آجائے' جس کے بارے میں لکھا جارہا ہے۔ اسی جدوجہد کے لمحے میں میری دوست بس اچانک ہی آگئی۔

"ارے فاطمہ' تو آج بھی یہ سب لے کر بیٹھ گئی۔ آج تو تجھے میرے ساتھ جانا تھا۔" وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ میں اپنی دوست کو پیار سے دیکھنے لگی۔ اس روئے زمین پر مجھے میری ماں اس نام سے پکارتی تھیں' جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یا پھر میری یہ دوست جس کے لب و لہجے پر اب بھی بمبئی کی چھاپ ہے۔ اس نے میرا جواب سنے بغیر کاغذ سمیٹے تو میں فوراً" بول پڑی۔ "آج نہیں جاسکتے۔ آج مجھے پیرزادہ قاسم کا تعارف لکھ لینا ہے۔"

"پیرزادہ قاسم" اس نے مجلّہ اٹھایا۔ سرورق پر سجی تصویر دیکھی اور بے ساختہ بولی۔ "مجھ سے اللہ میاں پوچھیں کہ دوسرے جنم میں تو کیا بنے گی تو بولوں گی کہ مجھے پیرزادہ قاسم بنانا۔" پھر میری آنکھوں میں حیرت بھرا سوال پڑھ کر بولی۔ دیکھتی نہیں کیسی فرشتوں جیسی معصوم صورت ہے اور ترنم تو ایسا کہ سنے جاؤ۔ شاعری ایسی کہ میں پڑھتی ہوں اور پڑھتی ہی رہتی ہوں۔

میری یہ دوست خالصتاً" ایک گھریلو عورت ہے لیکن پڑھی لکھی سخن فہم اور سخن نواز بھی ہے۔ وہ تو تھوڑی دیر بعد میری معذرت قبول کر کے چلی گئی اور میں سوچنے لگی کہ پیرزادہ قاسم کے ایسے بہت سے پرستار ہوں گے، جو میری دوست کی طرح سوچتے ہوں گے مگر اظہار کو زبان نہ ملی ہوگی۔ ویسے اظہار تو جشن پیرزادہ کے مجلّہ 1996ء میں بہت سے لوگوں نے کیا ہے مگر یہ ایک جملہ اپنی جگہ بڑا مکمل اظہار ہے کہ "مجھے دوسرا جنم ملے تو میں پیرزادہ قاسم بننا چاہوں گی۔"

ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے اپنے ایک مقالہ میں ایک تاریخی جملہ لکھا تھا کہ ہندوستان میں دو ہی الہامی کتابیں ہیں۔ ایک وید اور دوسری دیوان غالب۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم انہی ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کے نواسے ہیں۔ پیرزادہ قاسم رضا صدیقی نام ہے لیکن پیرزادہ قاسم کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اپنا تخلص بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام "تند ہوا کے جشن میں" کہیں تخلص نظر نہیں آئے گا۔ 8 فروری 1943ء کے دن دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی تک کراچی میں پڑھا۔ سائنس میں بی ایس سی (آنرز) اور ایم۔ ایس سی کیا۔ پھر برطانیہ سے پی ایچ ڈی کی۔ 1966ء سے جامعہ کراچی میں تدریس و تحقیق کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ اس عرصہ میں یونیورسٹی کے انتظامی امور میں بھی حصہ لیا۔ مشیر امور طلباء، رجسٹرار، پرو وائس چانسلر اور قائم مقام وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

بنیادی طور پر شاعری سے ہی وابستگی ہے۔ البتہ کبھی کبھی اہل قلم حضرات کے فن اور شخصیت پر تعارفی اور تجزیاتی نوٹ یا مختصر مضامین لکھے ہیں۔ اسکول کی زندگی میں تو انہوں نے کہانیوں پر بھی طبع آزمائی کی جو اسکول کے مجلّے میں شائع ہوتی تھیں، جو چند ایک ادبی جریدے اور "جام نو" میں بھی چھپیں۔ شعر و ادب اور فنون لطیفہ سے ابتدا ہی سے دلچسپی رہی۔ غالباً" 1960ء سے شعر کہنا شروع کئے۔ 1963ء سے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ اب تک بے شمار مشاعرے پڑھ چکے ہیں۔ جوش، فیض، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، اختر الایمان، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی اور دیگر کئی سینئر شعرا محققین، ادیب و ناقدین سے ملاقاتیں رہی ہیں، جنہیں پیرزادہ اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ شاعری کے حوالے سے دنیا کے پندرہ ممالک کا کئی کئی بار سفر کیا۔ بہت سے اعزازات حاصل کئے۔ متحدہ عرب امارات اور قطر میں 1996ء میں "جشن پیرزادہ قاسم" منعقد کیا گیا۔ ان کے فن و شخصیت پر تیس کے قریب رسائل، جرائد اور اخبارات میں مضامین نوٹس اور انٹرویوز وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ دو شعری مجموعہ تند ہوا کے جشن میں 1990ء اور شعلے پہ زبان 1996ء میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔

شاعری میں ان کی ہیومن ازم اور ادب سے غیر مشروط وابستگی ہے کیونکہ بقول ان کے شاعری اعلیٰ ترین سچائی اور بلند خیالی کا تقاضہ کرتی ہے۔ بیدار خیالی اور باضمیری ایک اچھے اور اہم شاعر کے لئے ایسے ہی ضروری ہیں جیسے انسانی حیات کے لئے آکسیجن۔ بیدار خیالی کے بغیر شاعر کا رشتہ معاشرے' ماحول اور اطراف وجوانب سے قائم اور برقرار نہیں رہ سکتا اور وہ عمل اور رد عمل کے حقائق سے بے خبر اور بلند سنجیدہ خیال سے دور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح باضمیری کے بغیر ایک شاعر سے اعلیٰ ترین سچائی کی توقع بے معنی اور فضول ہے۔

قاسم پیرزادہ کہتے ہیں۔ "بے شک اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے مگر بولی جانے والی۔ فرد کا زبان سے رشتہ دو طرح سے ہے۔ ایک محبت کا رشتہ اور دوسرا ضرورت کا۔ اردو رابطے کی زبان کے طور پر پھل پھول رہی ہے۔ اس کا مستقبل امید افزا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ یہ زبان باقی رہے گی اور ترقی پائے گی۔ البتہ نمو پذیر زبان جس جس صورتوں سے تبدیلی کے عمل سے گزر کر بدلتی ہے' اردو بھی مختلف ہوتی جائے گی اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ نئے الفاظ اور اصطلاحات شامل ہوتے جائیں گے مگر اس عمل سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے ایک مثال دیتے ہوئے کہا کہ 1970ء میں برطانیہ میں' میں نے انگریزی زبان میں ایک کتاب بعنوان "ٹریژرز آف آور لینگوئج" دیکھی جس میں درج تھا کہ دنیا کی مختلف زبانوں سے الفاظ انگریزی زبان میں آئے ہیں۔ اس میں اردو کا بھی ذکر تھا اور وہ یہ بتانے میں اپنی ہتک محسوس نہیں کرتے کہ یہ الفاظ باہر سے آئے ہیں اور ہم نے اپنائے ہیں۔ اردو ہماری قومی زبان ہے اور دنیا بھر میں رابطے کی زبان ہے لیکن ہم نے اسے اپنے ملک میں "مہاجروں کی زبان" کا خطاب دے دیا ہے۔ اردو کو زندہ رکھنا ہے تو ہمیں بلا تکلف اس میں پنجابی' پشتو' بلوچی' سندھی' انگریزی اور دیگر زبانوں سے الفاظ اور محاورات شامل کرنے کے لئے روک نہیں لگانی چاہئے۔

پیرزادہ کے خیال میں اظہار خیال کے لئے شاعری کی تمام اصناف سخن اچھی سمجھی گئی ہیں۔ بات اپنی اپنی فکری دلچسپی اور پسند پر منحصر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں ذاتی طور پر غزل سے زیادہ مانوس ہوں۔ ہمارے ماحول اور معاشرے میں بھی غزل ہی رچی بسی ہے اور غزل کے اشعار بے پناہ اثر انگیزی رکھتے ہیں۔ اختصار بھی اس کا کمال ہے اور ایمائیت بھی۔ یہی وجہ غزل کی مقبولیت میں اہم مقام رکھتی ہے۔ اردو میں نثری نظم ابھی تجرباتی دور میں ہے۔ نثری نظم میں نظم بہت ہی کم ہے' اسی لئے شعر کی مروجہ غنایت جو قبول عام کا سبب بنتی ہے' اس میں نہیں ملتی۔ نثری نظم میں سب سے اہم چیز خیال کی قوت ہے۔ تنہا خیال کی قوت صرف دھمک پیدا کر سکتی ہے' اس سے فکری نشاط کی لہر سر نہیں اٹھاتی۔ ادبی تجربے کی کامیابی یا ناکامی کے درمیان بہت برسوں کی مسافت ہوتی ہے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہئے۔ اب رہی

بات مشاعروں کی تو مشاعرے یا ادبی نشستیں تخلیقی عمل کے لئے ضروری نہیں۔ شاعروں یا شعری نشستوں میں شریک ہونے سے ایک ''شعری امنگ'' تو ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن یہ کوئی تخلیقی عمل نہیں۔ تخلیقی عمل مجلس یا بزم آرائی سے الگ چیز ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشاعرے ہمارے معاشرے میں شعروادب کے ذوق کو پھیلانے میں اور عام اہل ذوق کو ایک شعری روایت سے وابستہ رکھنے میں بہت معاون ہوتے ہیں۔ ادبی نشستیں مشاعروں کے مقابلے میں بہتر فکری ماحول مہیا کرتی ہیں۔

میں نے پوچھا کہ آپ کیا کہیں گے' اس سوال کے جواب میں کہ آج کا ادب ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے اور قاری سے بھی اس کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے۔ پیرزادہ نے اس کا جواب تفصیل سے دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھئے ہر زمانے کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ آج کے زمانے نے بھی ترجیحات متعین کی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ خلفشار کا شکار رہا ہے اور سیاسی' سماجی اور معاشرتی الجھنوں نے فکری طور پر ہمیں بے یقینی اور عدم اعتماد میں مبتلا کردیا ہے۔ ایسے عالم میں لوگ اعلیٰ ثقافتی اور تمدنی اقدار کی جانب کم متوجہ ہوئے اور زندگی کے راست مسائل میں بری طرح الجھ کر رہ گئے چنانچہ اب ادب معاشرے کی ترجیحات میں وہ مقام نہیں رکھتا' جس کی ہمیں توقع تھی۔ گنے چنے پڑھے لکھے لوگوں میں ادب کا خاص ذوق رکھنے والے ویسے ہی کم کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب سے قاری کا رشتہ کمزور ہوا ہے۔ یہ کہنا کہ ادب بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے مناسب نہیں۔ آج بھی اچھا اور قابل توجہ ادب تخلیق کیا جارہا ہے جو ہمارے عہد کے مطالبات کے مطابق ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خلفشار پر قابو پائیں' زندگی کو منظم' سادہ مگر خوبصورت بنائیں۔ اس عمل میں سب کا حصہ ہے۔ ادب کا بھی اور قارئین ادب کا بھی۔ ادب اور تعلیم کا بڑا مضبوط رشتہ ہے لیکن تعلیم کے معاملے میں ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ کتاب ہمارے معاشرے سے غائب ہوتی جارہی ہے اسے واپس لانا ہوگا۔ کراچی میں بھی اہل ذوق کی بڑی تعداد ہے لیکن ہمارے شہر میں کتنی کتابیں بکتی ہیں؟ اس کے لئے محنت کر کے چند علاقوں میں ادبی کتابوں کا میلہ لگایا جائے یا گشتی کتاب گھر بنایا جائے تو خریداروں کو آسانی ہوگی۔ اس مصروف دور میں پارکنگ کی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے لوگ کہاں کتابوں کی دکانیں تلاش کریں' جائیں اور خریدیں۔ زیادہ تر دکانوں پر درسی کتابیں ملتی ہیں کیونکہ وہ بکتی ہیں۔

بچوں میں ادبی ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے ٹی وی پر بچوں کی کتابوں کا تعارف اور ڈرامے بھی بہت ضروری ہیں' جیسے کسی زمانے میں قمر علی عباسی کا ناول ''بہادر علی'' پیش کیا گیا تھا۔ ہمارے گھروں سے بچوں کو کہانی سنانے کا رجحان ختم ہوگیا ہے۔ بچوں اور والدین میں انٹر ایکشن پہلے جیسا نہیں رہا۔ وہ کہانیاں جو سینہ بہ سینہ ڈیڑھ صدی تک چلتے چلتے ہم تک پہنچی

تھیں' اب دم توڑ رہی ہیں۔ انہیں زندہ کرنا ہو گا' تب ہمارے بچوں میں بھی علم و ادب کا شوق ہو گا اور کلاشنکوف کی گونج کم ہو گی۔ آج بڑے بھی ناول اور کہانی کم لکھ رہے ہیں۔ نثر خاص طور پر بہت کم لکھی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں ہمیں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہو گی۔ یہ کہہ کر کسی کی حوصلہ شکنی نہیں کرنی چاہئے کہ اسے شعر کہے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور مجموعہ کلام بھی آگیا۔ اس طرح اردو زبان و ادب کو نقصان پہنچ رہا ہے۔"

آخری سوال سن کر پیرزادہ نے کہا۔ "مغرب کی فکر' رجحانات' معاشرت اور تہذیبی عمل کے بارے میں جاننا اچھی بات ہے۔ اس سے معلومات میں اضافہ اور فکری پس منظر وسیع ہوتا ہے۔ مغرب کے ادب کو یا دیگر عالمی ادبی اثاثے کو ہمارے لوگوں کی دسترس تک لے آنا بھی ایک صائب' اہم اور مثبت عمل ہے۔ پڑھے لکھے معاشروں میں اس کا رواج ہے لیکن مغربی ادب کو اور اس کے رجحانات کو دانستہ طور پر کسی پروگرام کے تحت در آمد کرنا اور ان کی ترویج کرنا نہایت ہی غیر مناسب ہے۔ ہمارا ادب ہمارا اپنا ہونا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب لکھنے والے مسائل کا شعور رکھتے ہوں اور اپنے احساس شعور کے ساتھ اپنے اپنے اسلوب نگارش میں اظہار خیال کریں۔ تخلیقی عمل صرف فیشن کی پیروی کا نام نہیں اس کے لئے اپنا ماحول' اپنا معاشرہ اور طرز احساس کو اہمیت حاصل ہونا چاہئے۔"

علم دوست پیرزادہ نے اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بات 1952 یا 1953ء کی ہے۔ سنت نگر لاہور کے کارپوریشن پرائمری اسکول میں ہم یوکلپٹس کے بڑے بڑے درختوں کے سائے میں فرش پر بچھا کر اس پر بیٹھا کرتے تھے۔ میز کرسی صرف ماسٹر صاحب کے لئے ہوتی تھی۔ کتنے اچھے استاد تھے ہمارے' اب بھی یاد آتے ہیں۔ میری آواز اس وقت بہت اچھی تھی جو اب نہیں رہی۔ میرے ایک استاد خان جی کو جب معلوم ہوا کہ میں بہت اچھی نعت اور خاص کر "شاہ نامہ اسلام" جس کا کافی حصہ مجھے یاد تھا پڑھتا ہوں تو وہ ہفتے میں دو روز کلاس جلد ختم کر دیتے اور بڑی شفقت برت کر مجھ سے نعت یا شاہ نامہ اسلام سنتے۔ میں بڑے دل سے پڑھتا اور گردن گھما کر خان جی کو دیکھتا کہ وہ رو رہے ہیں۔ ان کے آنسو بہہ رہے ہوتے۔ وہ کتنی محویت سے سنتے۔ نبی کریمؐ سے انہیں کتنی محبت تھی۔ کاش وہ زمانہ پھر لوٹ آئے۔"

پیرزادہ اداس ہو چلے تھے اور میں ان کا یہ شعر زیر لب دہرا رہی تھی۔

یہ نیا دور بڑے پیار کے ساتھ
زہر دیتا ہے دوا کے ساتھ

عکسِ فن

غزل

ہے جبرِ وقت کا قصہ عجب سنائے کون
میں یاد اس کو کروں اور یاد آئے کون

یہ بات بجھتے دیوں نے کسی سے پوچھی تھی
جلے تو ہم تھے مگر خیر، جگمگائے کون

اسے تلاش تو کرنا ہے پھر یہ سوچتا ہوں
زمانہ اور ہے، اب زحمتیں اٹھائے کون

یہاں تو اپنے چراغوں کی فکر ہے سب کو
دیا جلایا ہے سب نے، دیئے جلائے کون

یہاں تو لوگ انہی حیرتوں میں جیتے ہیں
کہ تیر کس پہ چلے اور زخم کھائے کون

یہاں تو جاگتی آنکھوں میں خواب جاگتے ہیں
جو جاگتے ہوں انہیں خواب سے جگائے کون

یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں ملتی
مگر یہ بے خبری کی خبر سنائے کون

یہاں تو صبح سے پہلے ہی بزم برہم ہے
دیا بجھا دے کوئی پر دیا بجھائے کون

میں ادھر کے آتے ہوئے سورج کی شعاعیں

آنگن میں بکھری رہتی تھی میں روز تری خاطر

ڈاکٹر قمر آرا

۲۰ فروری ۱۹۹۸

Qamar Ara

Dr. Qamar Ara
Qamar Clinic, 108 Multan Road
Lahore, Pakistan

ڈاکٹر قمر آرا

لاہور

دس سال تو ہوئے ہی ہوں گے، جب ڈاکٹر قمر آراء نے اپنے گیتوں کا آڈیو کیسٹ مجھے بھیجا تھا۔ آواز کس کی تھی، اب یاد نہیں۔ پھر انہوں نے جاوید آفتاب کے ہاتھوں اپنے گیتوں کا مجموعہ "خواب آنگن" بھیجا جو 1994ء میں شائع ہوا ہے اور ساتھ ہی خواب آنگن پر ایک ریفرنس بک بعنوان "ڈاکٹر قمر آراء کے گیت اہل دانش کی نظر" میں بھی بھیجی۔ اہل دانش میں محترم جگن ناتھ آزاد، ظ، انصاری اور خلیق انجم سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی، افتخار عارف، حمایت علی شاعر پروین شاکر اور حکیم سعید تک کے نام ہیں۔ ہمارے وزیر اعظم پاکستان جناب نواز شریف کو ملا کر کل 52 لوگوں کی رائے، 19 حضرات کے خطوط، 9 منظوم خراج محبت اور تین انٹرویوز شامل ہیں۔ انگریزی اخبارات میں چھپے چار تبصرے اس کے علاوہ ہیں۔ اس کتاب سے ڈاکٹر قمر آراء کی مقبولیت کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔ نواز شریف صاحب کا نام دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں ڈاکٹر قمر کے حوصلے کی داد دی کہ وزیر اعظم ہاؤس تک پہنچنے میں اس شاعرہ کے پیروں میں تو نہیں (کہ اب پیدل چل کر جوتیاں گھسنے کا رواج ختم ہو چکا ہے) ہاں دل پر ضرور آبلے پڑے ہوں گے کہ پہلے بڑے صاحب یعنی پی اے سیدھے منہ بات کریں اور پھر ان سے بڑے صاحب کا دل نواز مکھڑا دیکھیں تب کہیں جا کر...... لیکن میرا اختلاج قلب یہ پڑھ کر ختم ہو گیا کہ جس وقت ڈاکٹر قمر ان سے ملی تھیں، وہ صرف سابق وزیر اعظم تھے اور موجودہ قومی اسمبلی کے قائد حزب اختلاف۔ پھر تو چھٹ بھئیوں سے قمر کا واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔

ڈاکٹر قمر بلا مبالغہ حوصلہ مند اور دل کی غنی شاعرہ ہے۔ کہتی ہیں.... "میری کوشش ہوتی

ہے کہ میری کتاب خوبصورت چھپے تاکہ لوگ دل لگا کر پڑھیں۔ میں ایک ہزار پوری کی پوری گفٹ کر دیتی ہوں۔ ان کا تیسرا مجموعہ "چاندنی ہم سفر ہوگی" (غزلیں) اور چوتھا نظموں اور شخصیات پر زیر اشاعت ہے۔"

ڈاکٹر قمر یکم جنوری 1946ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ قمر کے والد عبداللطیف خان دو سال کے تھے، تب ان کے دادا افغانستان سے ہجرت کر کے دہلی آئے تھے۔ قمر کی امی کا تعلق دہلی سے تھا۔ 14/ اگست 1947ء کو پاکستان وجود میں آیا تو اس خاندان نے ایک بار پھر ہجرت کی اور پاکستان کے شہر لاہور میں آن بسے۔ قمر کی پرورش اور تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ اعلیٰ اسکولوں اور کالج میں تعلیم حاصل کی۔ لاہور کالج فار ویمن سے ایف ایس سی اور فاطمہ جناح میڈیکل کالج سے ڈاکٹر کی ڈگری لی کیونکہ والد صاحب کی زبردست خواہش تھی کہ بیٹی ڈاکٹر بنے۔ امتحانات کے زمانے میں قمر رات بھر پڑھائی کرتیں اور والد محترم جانماز پر ان کے لئے دعا کرتے اور اکثر کہتے..... "میری گلاب کی کلی کملا گئی ہے خیر افغان بچی ہو دو تین دن میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔" اور واقعی پھر افغان بچی کے شگفتہ حوصلوں کے سبب اس کے گالوں کے گلاب کھل اٹھتے۔

قمر نے نثر لکھنے سے ابتدا کی تھی۔ کالج میگزین کے لئے ایک دن مضمون "بت تراش" لکھ رہی تھیں۔ ایک جگہ جملہ پڑھا جو کچھ یوں تھا "پتھروں کو تراشا بہت" قمر کے شاعرانہ مزاج نے اس پر مصرعہ لگایا۔

اس کا پیکر ڈھلا ہی نہیں
پتھروں کو تراشا بہت

یہ 1989ء کی بات ہے، قمر نے مطالعہ کی طرف توجہ دی۔ غالب اور اقبال کو پڑھا مگر مزاج میں روانی نہیں آئی۔ پھر ساحر لدھیانوی، فراز اور پروین شاکر کو پڑھا۔ انشاجی اور ناصر کاظمی کا مطالعہ کیا۔ ناصر اور پروین نے انہیں بہت متاثر کیا اور یوں قمر کے احساسات نظموں، غزلوں اور گیتوں میں ڈھلنے لگے۔ آج قمر کی محنت نے اسے ایک بااعتماد شاعرہ بنا کر ادب کے میدان میں جگہ دلوائی۔

قمر نے زندگی کو ہنس بول کر بسر کیا ہے۔ 24 سال کی تھیں کہ سیر کرنے ایک نہر کے پل پر جا نکلیں۔ ریل کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ گھبراہٹ میں قمر نے پل کے پھٹے کو پکڑ لیا اور نیچے لٹک گئیں۔ اب نیچے شور مچاتی لہریں اور اوپر ریل کی غراتی آواز زندگی تھی لہٰذا ساتھ آنے والی ملازمہ قریب سے لوگوں کو پکڑ لائی اور انہوں نے قمر کو کھینچ کر اوپر لیا۔ اللہ کی دی ہوئی زندگی تھی جو شاید اس لئے بھی ملی کہ مسیحا صفت قمر دوسروں کی سسکتی زندگیوں پر اپنی محبت کے پھاہے رکھیں۔

ڈاکٹر قمر کہتی ہیں۔۔۔۔ "میں تو نہیں سمجھتی کہ اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہو گی کیونکہ پنجابی زبان جس ترقی سے بڑھی اور سمجھی جارہی ہے تو ایک دن پنجابی زبان ہی چوتھی بڑی زبان بن جائے گی۔ شاید اس کی وجہ سکھ حضرات ہیں جو دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا بھنگڑا کلچر بھی بہت پسند کیا جاتا ہے۔"

قمر کی رائے میں مشاعرے سے زیادہ تخلیقی نشستیں بہتر ثابت ہیں۔ مشاعروں میں تو لوگ پارٹیاں بنا کر شریک ہوتے ہیں اور اپنی پارٹی کے شاعر کے لئے واہ' واہ کرتے ہیں اور دوسروں کے لئے ہوٹنگ اور شور شرابا کہ نیچے اتر جاؤ۔ اب بس کرو بس کرو بھائی وغیرہ وغیرہ۔ قمر کے ہاں نثری نظم کا تصور بھی نہیں۔ انہیں ہر چیز پابند اچھی لگتی ہے۔ چاہے غزل ہو یا نظم۔

قمر کا کہنا ہے۔۔۔۔ آج کل میڈیا کا دور ہے' کوئی بھی کتابیں خرید کر نہیں پڑھتا اور کتابوں پر وقت خرچ نہیں کرتا تو ظاہر ہے کہ قاری سے اس کا رشتہ نہ ہونے کے برابر ہی رہ گیا ہے۔

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہمارے سینئرز سو فیصد درست بات فرما رہے ہیں کیونکہ ہر ملک کا اپنا کلچر اپنے مسائل اور اپنے ذرائع ہیں حتیٰ کہ ہمارے پڑوسی ملک انڈیا تک سے ہمارا کلچر' ہماری زبان اور ہماری تہذیب مختلف ہے' جہاں تک جدید تکنیک کا تعلق ہے' ضروری ہے کہ اسے سمجھیں اور سیکھیں لیکن ان کا ادب اور ہمارا ادب دو مختلف چیزیں ہیں' ان کے رسم و رواج اور ہمارے رسم و رواجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

عکس فن

غزل

ہم کو جس نے ستایا بہت
دل نے اس کو ہی چاہا بہت

میری سرمایۂ زندگی
ایک اس کی تمنا بہت

وحشتوں کا تسلسل بڑھا
چاند کو جب بھی دیکھا بہت

اس سے جو بھی عبارت ہوا
شعر وہ گنگنایا بہت

اس کا پیکر ڈھلا ہی نہیں
پتھروں کو تراشا بہت

تپتے صحرا میں اس کیلئے
میری پلکوں کا سایہ بہت

گر رفاقت میں چاہت ملے
ایک پل کا زمانہ بہت

شب کی تاریکیوں میں قمر
اک دیے کا اجالا بہت

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کا دکھانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے

قمر جمیل

Qamar Jamil
B-5, Qamar Plaza
Gulshan-e-Iqbal-3
Karachi, Pakistan

قمر جمیل
کراچی

میں نے قمر جمیل صاحب کی خدمت میں ان کے تعارف کے لئے سوالنامہ پیش کیا۔ ساتھ ہی میں نے روزنامہ "جسارت" کے سنڈے ایڈیشن میں جناب شمس الرحمان فاروقی کا مضمون بھی پڑھا جو انہوں نے قمر جمیل کے لئے لکھا اور دو حصوں میں شائع ہوا۔ مضمون معلوماتی ہے لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے قمر جمیل کے متعلق یا ان کی شاعری کے حوالے سے معلومات ایک چوتھائی ہیں۔ میرے سوالنامے کے جواب میں قمر جمیل صاحب نے جو معلومات فراہم کی ہیں' وہ ان کی شخصیت اور مزاج کو سمجھنے میں زیادہ معاون ہیں' لہٰذا میں نے مناسب جانا کہ قمر جمیل کے بارے میں ان کے اپنے حوالے سے ہی بات کی جائے۔

اپنے بارے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "میرا نام قمر احمد فاروقی ہے۔ قمر جمیل تخلص ہے۔ آپ اسے ادبی نام بھی کہہ سکتی ہیں۔ تاریخ پیدائش 10 مئی 1931 میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوا لیکن آبائی وطن قصبہ سکندر پور ضلع بلیا اتر پردیش (ہندوستان) ہے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ ء صنعت و حرفت نام پلی حیدر آباد دکن میں ہوئی۔ ہمارے والد جمیل احمد مرحوم حیدر آباد دکن میں ہائی کورٹ کے وکیل تھے۔ ان کے انتقال کے بعد جو استسقا کے مرض میں ہوا تھا' ہماری والدہ اور دوسرے لوگ اتر پردیش میں منتقل ہوگئے۔ میں بھی سکندر پور آگیا۔ دو سال تک میری تعلیم رکی رہی۔ اس کے بعد میرے منجھلے ماموں علی اعظم فریدی مجھے لے کر الہ آباد چلے گئے' جہاں وہ ملازم تھے' وہیں دائرہ شاہ اجمل الہ آباد میں میرے والد کے خالہ زاد بھائی مولانا شاہد فاخری میرے والد کے خالہ زاد بھائی دائرہ شاہ اجمل" کے سجادہ نشین کی حیثیت سے وہیں مقیم تھے۔ یہ وہی مشہور خانقاہ ہے' جہاں محمد

حسین مرحوم کی آب حیات کے مطابق ناسخ مرحوم کچھ عرصہ کے لئے قیام پذیر تھے۔ اسی خانقانہ کے بارے میں ناسخ نے کہا تھا۔

ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

الہ آباد میں میری تعلیم کا آغاز اسلامیہ کالج سے شروع ہوا۔ میرے دادا مولانا وکیل احمد سکندرپوری مرحوم فارسی، عربی اور اردو کا ایک عظیم نام تھے۔ مجدد الف ثانی پر ان کی تصانیف فارسی زبان میں انتہائی مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ یمین اور کئی کتابیں مستند ہیں۔ طب میں ان کی مشہور تصنیف یاقوتی ہے 'فقہ' تاریخ اور طب میں ان کی ساٹھ ستر کتابیں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہو چکی ہیں 'ان میں ہدیہء مجددیہ' انوار احمدیہ کے علاوہ کئی کتابیں میرے پاس بھی ہیں۔ فارسی اور اردو کے شاعر بھی تھے۔ عاجز تخلص بھی کرتے تھے۔ ان کے چچازاد بھائی شاہ عبدالعلیم آسی سکندرپوری "مشہور اولیاء اللہ اور شعراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے کئی اشعار کا حوالہ فراق اور مجنوں گورکھپوری کی تنقیدوں میں بھی ملتا ہے مثلاً"۔

عشق کہتا ہے دو عالم سے جدا ہو جاؤ
حسن کہتا ہے جدھر جاؤ میرا عالم ہے

ایک عالم کے طلسمات میں جی چھوٹ گیا
ہر ادائے نگہ یار نیا عالم ہے

حضرت آسی" خانقاہ رشیدیہ جون پور کے سجادہ نشین بھی تھے۔ مولانا حسرت موہانی اور شمس الرحمان فاروقی نے انہیں سکندرپوری لکھا ہے لیکن چونکہ ان کا مزار غازی پور' یوپی میں ہے۔ یہ حضرت آسی غازی پوری کے نام سے مشہور ہیں۔ میں نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ اسلامیہ کالج الہ آباد سے پاس کیا۔ پھر اپنی منجھلے بھائی قیوم احمد فاروقی کے ساتھ حیدر آباد دکن چلا گیا تھا' وہیں حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا۔ بی۔ اے میں میرے اختیاری مضامین فلسفہ اور ادب تھے۔ حیدر آباد دکن میں بچپن میں میرے کلاس فیلو غلام جیلانی بھی تھے جو اب بھی مشہور افسانہ نگار ہیں۔

بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دسمبر 1949ء میں کراچی' پاکستان آ گیا۔ میرے بچپن کے ایک ساتھی سعید الدین بھی تھے۔ ان کے والد کا نام رضی الدین تھا۔ انہوں نے اپنے نام کا ایک جزو والد کے نام کے ایک جزو کے ساتھ ملا کر اپنا نام سعید رضی رکھ لیا

تھا۔ یہ میرے بچپن کے بہت مخلص دوست تھے۔ ان کی فرمائش پر میں نے اپنے ایک نام کے جزو والد مرحوم کے نام کا ایک جزو ملا کر اپنا نام قمر جمیل رکھ دیا۔ پاکستان آنے کے بعد میری باقاعدہ ملازمت کا آغاز ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ہوا' اور پہلا تقرر ریڈیو پاکستان لاہور میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ہوا۔ پھر کراچی تبادلہ ہوا' ایک بار مجھے ترقی بھی دے کر سینئر پروگرام پروڈیوسر بھی بنا دیا گیا آج سے دس سال پہلے ریڈیو پاکستان سے ریٹائر ہوا۔ کثرت سے سگریٹ نوشی کے باعث ہارٹ Enlargre ہو گیا تھا۔ اب بھی سانس کی تکلیف ہے۔ اس کے باوجود لکھنے پڑھنے کا کام جاری ہے۔

نثری نظم کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے قمر جمیل کہتے ہیں کہ 1971ء کے قریب میں نے نثری نظم کی تحریک چلائی تھی۔ اس تحریک کی وجہ سے نثری نظم کو ایک صنف سخن کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ اس تحریک میں میرے ساتھ کراچی' حیدر آباد سندھ اور لاہور اور ملتان کے بہت سے نوجوان شاعر شریک تھے۔ **مثلاً**" فاطمہ حسن' ثروت حسین' شوکت عابد' اقبال فریدی' سیما خان اور ک زئی' محمود کنور (مرحوم) ضمیر علی بدایونی' عذرا عباس' انور سن رائے' افضال احمد سید' جاوید احمد' احمد جاوید' سارا شگفتہ وغیرہ۔ ان میں سے بیشتر نوجوان شاعروں کی شہرت سارے پاکستان میں ہے۔ نثری نظم کی تحریک کے بانی کی حیثیت سے سارے پاکستان میں مجھے مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ رئیس فروغ اس تحریک میں قدم بہ قدم میرے ساتھ تھے۔ میرا پہلا شعری مجموعہ "خواب نما" تین کتابوں کے ساتھ شائع ہوا یعنی محب عارفی' محبوب خزاں اور قمر جمیل ہم تینوں کے شعری مجموعے اکٹھے شائع ہوئے۔ اس کے بعد میرا ایک شعری مجموعہ "چہار خواب" کے نام سے بھی شائع ہوا۔ نثری نظم کی تحریک میں عبدالرشید کا نام بھی نمایاں ہے' بعد میں اس نثری نظم لکھنے والوں میں ان گنت شاعر شریک ہوئے۔ شاعری کے علاوہ قمر جمیل کو تنقید سے دلچسپی رہی ہے۔ ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ ادب' فلسفہ اور شاعری پر ان کے مضامین پاکستان کے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے کراچی سے ایک رسالہ "دریافت" کے نام سے بھی نکالا۔ جدید ادب کے مسائل خاص طور پر جدید اور مابعد جدید ادب Modern Litrature کے مسائل پر اداریئے لکھے ہیں۔ خاص طور پر "دریدا کے ڈی کنسٹرکشن" اور "رسالہ Post در مغفرت استعارہ" بہت پسند کیا گیا۔ حسب ذیل موضوعات پر "دریافت" اور دوسرے رسالوں میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔

1- دریدا کا ڈی کنسٹرکشن
2- فوکو کا نظریہ ء طاقت
3- کافکا یورپ کی روحانیت کی آخری سرحدوں پر

4- وجودیت
5- ہائیڈیگر' سارتر
6- کافکا اور کامیو کی وجودیت اور دوسرے مضامین

ان کے مضامین کی کتاب جو جدید ادب کے بارے میں ہے عنقریب شائع ہو جائے گی۔ اس سے پہلے انہوں نے جائزہ کا ایک شمارہ بھی ایڈٹ کیا تھا۔ ان کا ادبی کلام نوائے وقت' حریت اور جسارت کراچی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ دریافت اور فنون لاہور میں نظمیں اور دوسری تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ شاعری کے علاوہ انہیں سب سے زیادہ دلچسپی تنقید سے رہی ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کے جدید مکتبہ ء فکر سے غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔ "آب حیات" سے لے کر آج تک جو تنقید لکھی جا رہی ہے۔ قمر جمیل اس میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ "مجھے ناول اور افسانوں سے دلچسپی نہیں لیکن اگر فکشن مجھے مجبوراً پڑھنا پڑا ہے تو میں یہ فکشن بڑی مشکل سے پڑھنے کا قائل ہو سکا ہوں۔ مثلاً "ایوان ایلیچ کی موت طالسطائے کی کہانی مجھے بار بار کوشش کر کے پڑھنی پڑی لیکن جب میں نے یہ کہانی پڑھ لی تو مجھے طالسطائے کو ایک عظیم فنکار تسلیم کرنا پڑا۔ کافکا کی کہانیاں بھی جب مجھے پڑھنی پڑیں تو مجھے کافکا بھی انتہائی عظیم فنکار محسوس ہوا تو سوال یہ ہے کہ اتنے عظیم فنکار کیسے اور کہاں ملیں گے۔ اردو میں مجھے پریم چند' منٹو اور غلام عباس بھی بڑے فنکار لگے۔ مثلاً" آنندی کا جواب نہیں۔ منٹو کی ٹوبہ ٹیک سنگھ بھی خوب کہانی ہے۔ بہرحال جس زمانے میں فکشن کا مذاق Develop ہو سکتا تھا۔ میں تذکرہ ء غوثیہ' تذکرہ اولیاء اور اس طرح کی کتابیں پڑھنے میں لگا رہا۔ قصہ ء چہار درویش اور الف لیلیٰ پڑھتا ہوں لیکن اس طرح جیسے کوئی دوا کا گھونٹ پیتا ہے۔ صوفیا کی کرامات اور محیر العقول باتوں میں بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔"

قمر جمیل کہتے ہیں "میری زندگی میں اہم اور دلچسپ واقعات نہیں ہیں۔ حد یہ ہے کہ مجھے انتہائی مزاحیہ واقعات پر بھی ہنسی نہیں آتی۔ رونے کو جی چاہتا ہے مثلاً" ڈان کوہتے کے واقعات پر بچپن میں بہت ہنسی آتی تھی لیکن اب ڈان کوہتے کی زندگی پر بھی رونے کو جی چاہتا ہے چنانچہ مجھے سب سے زیادہ ہنسی ان لوگوں پر آتی ہے جو مزاحیہ ادب لکھتے ہیں یا مزاحیہ شعر کہتے ہیں مثلاً" ان کے مزاحیہ شعر سن کر میں رونے لگتا ہوں۔ ایک شاعر صاحب نے پوچھا کہ میرا شعر تو مزاحیہ تھا آپ رو کیوں رہے ہیں؟ میں نے ان سے کہا کہ قبلہ میں رو اس بات پر رہا ہوں کہ آپ اسے مزاحیہ سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تو یہ سنا تھا کہ ادب انجماد کا شکار ہے معاف کیجئے۔ انجماد کا نہیں جمود کا شکار ہے۔ اب پتہ چلا کہ مزاح بھی جمود کا شکار ہے کیونکہ چلئے اگر مزاح بھی جمود کا شکار ہے تو کوئی حرج نہیں۔ کم سے کم طنز تو زندہ ہے۔ میں نے کہا آپ کی پیدائش سے پہلے زندہ تھا۔ اب تو صرف وزیر آغا زندہ ہیں' خدا

کرے، ہمیشہ زندہ رہیں اور کسی رسالے کا طنز و مزاح نمبر نکالتے رہیں۔"

"اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے۔" اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "اگر آپ کہتے ہیں تو ضرور ہوگی۔ میں بھی اس کے بارے میں سو فیصد یقین رکھتا ہوں کہ دیکھتے ہی دیکھتے تیسری بڑی زبان بن جائے گی۔ (کیونکہ یہ تھرڈ ورلڈ کی زبان ہے)

میرے اگلے سوال کے جواب میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا "شاعری میں وہی صنف سخن اظہار کے لئے اختیار کرنی چاہئے جو آپ کے مزاج کے مطابق ہو۔ غزلوں اور پابند نظموں کے علاوہ نثری نظمیں بھی لکھنی چاہئیں۔ نثری نظم میں اظہار کے لئے بڑے مواقع ہیں لیکن پاکستان میں اگر آپ ہیں تو غزلیں ضرور لکھئے کیونکہ غزل میں بڑی غنائیت اور موسیقیت ہوتی ہے۔ (اور دماغ پر بھی زیادہ زور نہیں پڑتا) قافیے اور ردیفیں خود آپ کے دماغ کی جگہ کام کردیتی ہیں' رہ گئیں بحریں تو آپ کا دل جن بحروں میں لکھنا چاہے' انہی میں غزل لکھئے۔ مشاعرے بھی اور ادبی نشستیں بھی آپ کے متحمل نہیں ہوسکتے اگر آپ بور کرنے والی شخصیت ہیں تو مزاحیہ شعر کہیئے تاکہ آپ کی بوریت بھی اور شعر سننے والوں کی بوریت بھی دور ہو۔ شعری تخلیقات کے لئے مشاعرے بھی مفید ہیں اور ادبی نشستیں بھی۔ ادبی محفلوں میں کبھی کبھی افسانے بھی سنائے جاسکتے ہیں مگر بلند آواز سے' منمناتے ہوئے نہیں۔"

"اور آپ کے اگلے سوال کے جواب میں کہوں گا کہ اگر قاری سے ادب کا رشتہ کمزور ہوگیا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ مزاحیہ شاعری کیجئے لیکن یہ شاعری مزاحیہ ہونی چاہئے' فلسفیانہ نہیں۔ فلسفیانہ مضامین ہوں تو صرف ساختیاتی انداز کے ہوں یا انتہائی سنجیدہ انشائیہ کہ ان کو پڑھ کر آدمی دنگ رہ جائے۔ مغرب کے فیشن مت اختیار کیجئے اور اگر کیجئے بھی تو صرف تکنیک مغرب سے لیجئے اور بس پہلے انگریزی میں لکھئے اگر نہیں آتی تو دوبارہ غور کیجئے۔ آپ کو انگریزی ضرور آتی ہوگی۔"

عکسِ فن

آج ستارے آنگن میں ہیں ان کو رخصت مت کرنا
شام سے میں بھی الجھن میں ہوں تم بھی غفلت مت کرنا

ہر آنگن میں دیئے جلانا، ہر آنگن میں پھول کھلانا
اس بستی میں سب کچھ کرنا ہم سے محبت مت کرنا

اجنبی ملکوں، اجنبی لوگوں میں آکر معلوم ہوا
دیکھنا سارے ظلم وطن میں لیکن ہجرت مت کرنا

اس کی یاد میں دن بھر رہنا، آنسو روکے چپ سادھے
پھر بھی سب سے باتیں کرنا اس کی شکایت مت کرنا

○

وہ باتیں عشق کہتا تھا کہ سارا گھر مہکتا تھا
مرا محبوب جیسے گل تھا اور بلبل چہکتا تھا

خدا جانے میں اس کے ساتھ رہتا تھا کہ آئینہ
مرے پردے میں اپنے آپ کو حیرت سے تکتا تھا

کبھی رہتا تھا اس کے ساتھ میں اس کے گریباں میں
کبھی فرقت میں اپنے آئینہ پر سر ٹپکتا تھا

اندھیری رات جب ساون میں آتی تھی تو اک بلبل
خدا جانے کہاں سے آکے میرے گھر چہکتا تھا

زندگی احساس تھا ہے نام دھڑکن کا نہیں
آدمی زندہ نہیں احساس مر جانے کے بعد

ریحانہ قمر جنوری ۲۷ - ۱۹۹۸

Rehana Qamar
8928 Mesa Oak. Dr.
Riverside CA-92508
U.S.A.

ریحانہ قمر چودھری

لاس اینجلس

فنکار ہمیشہ اپنے داخلی اور خارجی احساسات، تجربات اور مشاہدات کو اپنے فن پاروں میں سمیٹتا ہے۔ ریحانہ بھی اپنے مشاہدات اور تجربات کو شعری پیکر میں ڈھالتی ہیں۔ یہ مشاہدات جتنے پختہ ہوں گے اور ڈھالنے کی ریاضت کی جتنی عمر ہوگی، وہ آپ اپنی تصویر ہوگی۔

ریحانہ شاعری کی دنیا میں نووارد ہیں مگر بہت نووارد بھی نہیں۔ پچھلے دو تین سالوں میں وہ لاس اینجلس کی کئی شعری محفلوں میں شریک ہوئیں اور دیکھتے دیکھتے انہوں نے اپنا ایک مقام بھی بنا لیا۔ خود ریحانہ کی شخصیت کا بھی اس میں دخل ہے کہ وہ لوگوں کی بے لوث خدمت کو تیار رہتی ہیں اور خاص کر دنیائے ادب میں وہ دامے درمے قدمے سخنے کبھی پیچھے نہیں رہتیں۔

شاعری کی ابتداء کی تو انہوں نے لاس اینجلس کے معروف مزاح گو شاعر جناب اسد اللہ حسینی چکر کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور حسینی صاحب نے بھی ریحانہ کو شاعری کے رموز و اوقاف سکھانے میں پورے خلوص سے کام لیا۔

ریحانہ کو شاعری کا شوق تو ہمیشہ سے رہا۔ اس پر حسینی صاحب کی معاونت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ یوں ریحانہ نے زود گوئی سے کام لیتے ہوئے سال بھر تک اتنی جدوجہد کی کہ ان کا مجموعہ کلام "سوچ کی دہلیز پر" کے عنوان سے تیار ہوگیا۔ یہ 1997ء میں لاہور کے الرزاق پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ نومبر 1997ء میں ریحانہ نے لاس اینجلس میں اپنی کتاب کی تقریب رونمائی منعقد کی۔ اس میں مقامی مقتدر شعراء و شاعرات کے علاوہ کراچی سے ایک

عالمی مشاعرے میں شرکت کرنے والے لاہور کے معروف شاعر جناب عباس تابش اور کراچی کے مزاح گو معروف شاعر جناب ضیاء الحق قاسمی بھی شریک تھے۔ ریحانہ نے بتایا کہ تقریب کامیاب رہی اور اب 1998ء میں "سوچ کی دہلیز پر" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔

ریحانہ 11 ستمبر 1962ء کے دن ٹوبہ ٹیک سنگھ (پنجاب) میں پیدا ہوئیں۔ پورا نام ریحانہ یاسمین ہے۔ ابھی انہوں نے بی ایس سی کیا تھا کہ ان کی شادی ہو گئی اور ریحانہ امریکہ آ گئیں۔ پچھلے سترہ سالوں سے ریحانہ امریکہ میں مقام ہیں اور تقریباً 16 سال سے اپنا ذاتی کاروبار کر رہی ہیں اور اس میں کامیاب ہیں۔ ریحانہ کا کلام لاس اینجلس کے ہفت روزہ "پاکستان لنک" اور "پاکستان ٹوڈے" کے علاوہ پاکستان کے ماہنامہ عہد آفریں، فنون اور ادبی افق میں شائع ہوتا ہے۔

شاعری میں اظہار کے لئے ریحانہ نے غزل کے میدان کا انتخاب کیا ہے کیونکہ اپنی کیفیات کے اظہار کے لئے غزل سے زیادہ موزوں صنف ان کے نزدیک اور کوئی نہیں اور جہاں تک کسی مکتب فکر سے وابستگی کی بات ہے تو ریحانہ کے بقول انہوں نے اپنے آپ کو کسی نظریے کا پابند ہی نہیں کیا۔ جہاں بھی کسی اچھی فکر سے متاثر ہوئیں اسے اپنا لیا۔ البتہ انہیں ان شاعرات سے اختلاف ہے جو اپنی شاعری میں جنس کے عنصر کو اجاگر کر کے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں لگی رہتی ہیں، ان کے خیال میں عورت کو شعر میں کھل کر سامنے نہیں آنا چاہئے، یہی باتیں استعاراتی انداز میں بہتر طور سے کہی جا سکتی ہیں۔

ریحانہ کہتی ہیں "میں جدوجہد کی زندگی پر یقین رکھتی ہوں، مجھے ایک واقعہ نہیں بھولے گا۔ لاس اینجلس میں چیریٹی کے لئے ایک واک کا اہتمام کیا گیا، اس میں 25 میل تک پیدل چلنا تھا، تمام شرکاء میں میں واحد خاتون تھی، جس نے اتنا طویل راستہ طے کیا اور اس چیریٹی کے لئے ایک خطیر رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔"

اردو زبان کے سلسلے میں عرض ہے کہ اردو ایسی زبان ہے، جس کو کبھی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں رہی۔ بھارت میں تو اس کا رسم الخط تبدیل کر کے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس زبان میں اتنی کشش اور توانائی ہے کہ یہ بغیر کسی سرپرستی کے پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی علاقہ ہو، جس میں اردو بولنے یا سمجھنے والے موجود نہ ہوں۔ میں اردو کے مستقبل سے پرامید ہوں۔ اب تو امریکہ میں بھی والدین اپنے بچوں کو اردو پڑھانے پر خصوصی توجہ صرف کر رہے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ پاکستانی تہذیب و ثقافت کو بچانے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے بچوں کو اردو سے آگاہ کیا جائے۔

نثری نظم کے حوالے سے ریحانہ کہتی ہیں۔ "میرے نزدیک شاعری غنائیت کے بغیر صرف لفظوں کا گورکھ دھندہ ہے اور غنائیت صرف اسی وقت پیدا کی جا سکتی ہے، جب شاعری

مروجہ اوزان میں ہو۔ بے وزن شاعری' شاعری نہیں ہوتی۔ نثری نظم کا چکر غیر تخلیقی لوگوں کا چلایا ہوا ہے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں' جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے' وہ زیادہ تر تفریح کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ بہت سے شعراء نے اپنے آپ کو مشاعروں کے تقاضوں کا پابند کر کے ایسی شاعری کی ہے' جس سے ان کے قدو قامت میں کمی آئی ہے لیکن اب بھی ایسے شعراء موجود ہیں جو مشاعرے کی سطح پر نہیں اترتے بلکہ اپنے خوبصورت کلام کے ذریعے مشاعرے کو اپنی بلند سطح پر لے آتے ہیں۔ مشاعرے کی چند قباحتوں کے باوجود اب بھی مشاعرہ ہماری تہذیب کی علامت ہے۔ امریکہ میں تو مشاعرہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہاں اردو کو پروان چڑھانے کا اس کے علاوہ کوئی موثر ذریعہ نہیں۔ ویسے نشستوں کی افادیت اپنی جگہ ہے۔"

اگلے سوال کے جواب میں ریحانہ کا کہنا ہے کہ "یہ تاثر بالکل غلط ہے' ادب تو زندگی آمیز اور زندگی آموز ہوتا ہے' میں تو اس سے تازگی حاصل کرتی ہوں۔ میری زندگی میں بہت سی تبدیلیاں ادب کو پڑھ کر آئیں چنانچہ میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ادب بندے کو بے عمل بناتا ہے اور اپنے سینئرز کی رائے سے اختلافات کرتے ہوئے میں کہنا چاہوں گی کہ ادب پر کسی بھی ملک کے ادب کے دروازے بند نہیں کئے جاسکتے۔ ویسے ادب اثرات قبول کرتا رہتا ہے۔ ہر دور میں مختلف ملکوں میں چلنے والی تحریکیں نہ صرف ہر جگہ کے ادب کو متاثر کرتی ہیں بلکہ اس ملک کے ادب کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ہمیشہ تخلیقی سطح پر اثرات قبول کرنے چاہئیں۔ بڑا شاعر اثرات قبول کر کے بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔ پاکستانی ادب پر مجموعی طور پر تقلید کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔ 60ء کی دہائی کے کچھ نظم نگاروں نے نئی نظم کہنے کے شوق میں مغرب کی اندھا دھند تقلید کی۔ انہوں نے نیا موضوع تو شاید باہر سے سیکھ لیا لیکن ان کی نظموں پر ترجمے کا گمان گزرنے لگا۔ میرے خیال میں ادب کو اپنے خون کا حصہ بنا کر اظہار خیال کرنا چاہئے۔ اس طرح مثبت معنوں میں آدمی متاثر ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تمام تر اثرات کے باوجود بڑا ادب وہی ہوتا ہے جو اپنی زمین سے جڑا ہوا ہو۔"

عکسِ فن

غزل

وہ شخص جزو اگرچہ مری ہی ذات کا ہے
بتاؤں کیا کہ مجھے دکھ اسی کی بات کا ہے

رکھا تھا اس نے مری آنکھ پر ہتھیلی کو
اب انتظار نظر کو اسی کے ہاتھ کا ہے

سفر طویل نہیں تیرے گھر تلک لیکن
سفر یہی تو مری جان پل صراط کا ہے

گراں نہ گزرے تری جان پر صف آرائی
سمجھ نہ یہ کہ ہمیں خوف اپنی مات کا ہے

ملیں تو کیسے ملیں شمس اور قمر جاناں
کہ ایک دن کا مسافر تو ایک رات کا ہے

وہ تو کچھ یوں ہی لگی تم سے محبت ورنہ
ہم وہ خودسر ہیں کہ اپنی بھی تمنا نہ کریں

لیث قریشی
کراچی
۹/۲/۹۸

Lais Quareshi
C-265, Block-6
F.B. Area
Karachi-75950, Pakistan

لیث قریشی

کراچی

ہے تو واقعی عجیب بات لیکن سچ بھی ہے کہ انہوں نے چالیس سال تک بینک کے بہی کھاتوں میں سر کھپانے کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق شعری کو بھی نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اپنی فکر کو بھی تازگی دی۔

یہ ابو اللیث قریشی ہیں جو ادبی حلقوں میں لیث قریشی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ 6 مئی 1922ء کو یوپی (ہندوستان) کے ضلع غازی پور کے ایک غیر معروف گاؤں بھوجا پور میں پیدا ہوئے۔ ویسے ان کا آبائی وطن اعظم گڑھ یوپی ہے۔ امتیازی نمبروں سے بی۔ اے اور پھر بینکاری کی سند ڈی۔ اے۔ آئی۔ بی۔ بی حاصل کرنے کے بعد کلکتہ کے ریزرو بینک آف انڈیا سے وابستہ ہوئے۔ چار سال کے بعد پاکستان کے نیشنل بینک سے اپنی محبتیں جوڑیں اور باعزت ریٹائر ہوئے۔

لیث قریشی شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھتے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ "ناسور" دہلی کے ایک غیر ادبی ماہنامہ فلم "لائٹ" میں 1945ء میں شائع ہوا تھا' جس کے مدیر عیسیٰ غزنوی تھے۔ گزشتہ اٹھارہ برس سے نثر پر کام کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں.... "پہلے میں نے سوچا کہ معاشرے پر ایک کتاب لکھی جائے لیکن میں نے دیکھا کہ اگر میری یہ کتاب منظر عام پر آگئی تو لوگ میری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ تب میں نے کتاب کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا لیکن اب جب لوگ اپنے مضامین اور کالموں میں معاشرے کی ساری بد اعمالیاں کھل کر لکھ رہے ہیں تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ اب میں نے تنقیدی مضامین پر کام شروع کر دیا ہے۔ کچھ شاعروں کے کلام کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ کچھ پر مضامین مرتب کر چکا ہوں۔ جب یہ کتاب مکمل ہو جائے گی تو اس

کی اشاعت کا اہتمام کروں گا۔

اردو کے مستقبل سے لیث صاحب مایوس نہیں اور اس کے تابناک مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔۔۔۔ شاعری میں ان کا کوئی استاد نہیں۔ وہ علامہ اقبال اور حضرت احسان دانش کو اپنا معنوی استاد تصور کرتے ہیں۔ ویسے شاعری میں ان کا رویہ کلاسیکی ہے۔ انہوں نے ادب کی زندہ روایت سے رشتہ جوڑا ہے۔ معنی اور صورت 'خیال اور ہیئت دونوں کو اہم سمجھتے ہیں۔ غالب سے متاثر ہیں اور اسی مکتب فکر سے وابستگی ہے۔ زبان انہوں نے اپنے والد محترم سے سیکھی۔ انہوں نے لیث کو الفاظ کو برتنے کا ہنر سکھایا اور زندہ زبان کا شعور دیا۔ گو ان کا بچپن انتہائی غیر شاعرانہ ماحول میں گزرا لیکن شعر گوئی عطیہ قدرت کی طرح انہیں ملا تھا چنانچہ 1943ء سے شعر گوئی کا آغاز کیا جو اب تک جاری ہے۔

برصغیر کی تقسیم سے پہلے ان کا کلام دہلی کے ماہنامہ جمالستان اور ہفت وار **الجمعیت** کے علاوہ کلکتہ کے ہفت وار نقاش اور تقسیم کے بعد ماہنامہ نگار لکھنؤ میں شائع ہوتا رہا۔ علاوہ ازیں کراچی کے ماہنامہ **الشجاع**' مہر نیم روز' جام نو' افکار اور لاہور کے فنون میں بھی شائع ہوتا رہا۔

اب تک ان کے چار مجموعہ ء کلام شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا لمس گریزاں (نظم و غزل 1976ء) دوسرا عکس لرزاں (نظم و غزل 1983ء) تیسرا تاباں تاباں (حمد و نعت و منقبت 1991ء) چوتھا شعلہ رقصاں (نظم و غزل 1996ء)

غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے۔ کہتے ہیں نظم کا بھی اپنی جگہ ایک مقام ہے۔ بشرطیکہ اس میں حسن تنظیم ہو۔ نثری نظم کو لیث قریشی شاعری کی کسی صنف میں جگہ دینے کو تیار نہیں کیونکہ بہرحال نثر نثر ہے اور نظم نظم نثری نظم کیا ہوئی بھلا؟

لیث بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ کہنے لگے۔۔۔۔۔ "میں ایک عالم دین کا بیٹا ہوں مگر اس کو کیا کہا جائے کہ بینکاری بھی کی اور شاعری بھی کی جبکہ یہ دونوں ہی فعل غیر شرعی ہیں حالانکہ مجھے اردو زبان کے واسطے سے ادبی ماحول نہیں ملا تھا لیکن میں ہندی بھاشا اور سنسکرت کے ذخیرہ ء الفاظ سے بہت حد تک آشنا ہوں اور اسی ماحول میں رہ کر اردو شاعری کی ابتداء کی تھی۔ مجھے اپنی صلاحیت پر کبھی کبھی خود بھی حیرت ہوتی ہے چنانچہ اسے میں عطیہ ء خداوندی کہوں گا۔

میرے اس سوال پر کہ آج ادب کا اپنے قاری اور عمل سے رشتہ کٹ گیا ہے۔ انہوں نے کہا "ایک ادیب اور شاعر ہی کیا' اس کائنات میں بسنے والی اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق جسے وہ اپنا شاہکار کہتا ہے' اس کی اکثریت (زور کس پر ہوا؟ اکثریت پر) بے عمل ہو گئی ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے کلام پاک کے تیسویں پارے کے سورہ **العصر** میں فرمایا ہے۔ "قسم ہے زمانہ کی'

یقیناً "انسان خسارے میں رہا (کہ کسب سعادت اور کسب فیض سے محروم رہا) مگر (اس ناقابل تلافی نقصان سے وہی محفوظ ہے) جو (خدا اور خدا کے رسولؐ پر) ایمان لائے اور ایمان پر اکتفانہ کی بلکہ نیک عمل کئے اور (یہی نہیں بلکہ) آپس میں ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور صبر استقلال کی تاکید کرتے رہے۔"

لیث قریشی تخلیقی نشستوں کے حامی ہیں بشرطیکہ اس میں تحسین و ستائش باہمی کا شائبہ تک نہ ہو۔

آخری سوال کے جواب میں **لیث قریشی** صاحب نے کہا۔۔۔۔ "ایک ادبی فیشن کیا اب تو غیر ممالک کے ہر سماجی فیشن کو اپنانا ہم اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ حافظ، سعدی، نظیری، صائب، فردوسی، عراقی، عمر خیام، امیر خسرو، جامی، غالب، ذوق، میر، مومن، آتش، ناسخ، داغ، انیس و دبیر، **مصحفی**، اقبال، اکبر العبادی، **چکبست**، احسان دانش، فیض اور احمد ندیم قاسمی سمیت بہت سے شعراء نے کون سی فکر اور کون سے خیال کو چھوڑ دیا ہے، جس کو دنیا کے کسی زبان کے شاعر یا ادیب نے پیش کر کے ہماری رہنمائی کی ہے۔"

والد محترم مولوی ابوالحسن کے نام

خود شناسی کا مجھے تو نے ہی بخشا ہے شعور
تو فقط تو ہے ملا جس سے مجھے ذوق سخن

محترم میرے لئے کون ہے تجھ سے بڑھ کر
جس کی خدمت میں کروں پیش یہ سرمایہ فن

○

لیث یہ اعزاز کیا کم ہے ہمارے واسطے
ترجمان عصر حاضر ہے ہماری شاعری

عکس فن

غزل

ہے بجا، لیکن وہ اک حسرت جو میرے دل میں ہے
جادہ پیمائی کی لذت سعی لاحاصل میں ہے

میں تو اک رسوائے عالم ہوں مرا کیا تذکرہ
کوئی بتلائے مجھے، خوف خدا کس دل میں ہے

ہے یہی قانون فطرت، ہوشیار اے ناخدا
شورش طوفاں اسی خاموشی ساحل میں ہے

یوں ہی جنت کے نظارے چھوڑ آتا ہے کوئی
کیا کہوں کتنی کشش دنیائے آب و گل میں ہے

یوں غم حالات نے تقسیم کر ڈالا مجھے
ذہن میرے ساتھ ہے اور دل تری محفل میں ہے

ہم رہان شوق میں فکر و نظر کا یہ تضاد
میں ہوں اک آوارہ راہی قافلہ منزل میں ہے

سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آجاتا ہے لیث
ہائے! میرے عہد کا انسان کس مشکل میں ہے

خط میں گنجائش احوال نہیں یوں سمجھو
آکے دیکھو گے تو پہچان نہیں پاؤ گے

مقصد الہ آبادی
۱۲ اگست ۱۹۹۷ء

Maqsad Allahabadi
20806 Crestmont. Ln.
Dearborn Heights , MI 48127
U.S.A

مقصد الہ آبادی

مشی گن

بلاشبہ زندگی کرنا آسان نہیں۔ یوں تو زندگی سبھی گزار لیتے ہیں لیکن اپنے ضمیر کو زندہ سلامت رکھتے ہوئے ذہنی کشمکش اور روحانی کرب کے ساتھ پولیس کے محکمے میں کم و بیش ساڑھے چوبیس سال گزار لینا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں لیکن مقصد اسم بامسمیٰ ہیں۔ اپنے نام کی آبرو رکھنا بھی ان کا مشن تھا اور ہے۔ پولیس کے محکمے میں کیا کچھ نہیں ہوتا لیکن ان کی زندگی کا یہ واقعہ اس المیے کی طرف بھی روشنی ڈالتا ہے کہ محض چند ٹکوں کی خاطر ایک انسان دوسرے کو کتنی آسانی سے سولی پر چڑھا دیتا ہے اور معاشرے میں "قاتل" بھی نہیں کہلاتا۔

مقصد کہہ رہے تھے.... "غالباً" 1985ء کی بات ہے' میں ان دنوں ٹونڈلہ کوتوالی (ہندوستان) میں انسپکٹر تعینات تھا۔ (ضلع آگرہ میں) تقریباً" گیارہ بجے دن میں ایک آدمی نے کوتوالی میں آکر اطلاع دی کہ اس کے باپ کو اس کے چچا اور چچا کے دو لڑکوں اور اس کے ایک داماد نے گلا دبا کر رات میں قتل کر دیا اور اس کی لاش آبادی سے دور لے جا کر نیم کے پیڑ پر ٹانگ دی ہے۔ مرنے والے کی عمر 65 سال اور ملزم چچا کی عمر تقریباً" 70 سال تھی جائے واردات کوتوالی سے صرف ڈیڑھ میل دور تھی۔ میں فوراً" موقعہ پر گیا اور معائنہ کیا۔ قتل کے تینوں ملزمان بھی موقعہ پر ہی مل گئے۔ لاش کا بغور معائنہ کرنے سے صاف ظاہر تھا کہ یہ معاملہ خودکشی کا ہے گلا دبانے کا الزام غلط ہے لیکن پھر بھی لاش کو پنچایت نامہ لے کر پوسٹ مارٹم جانچ کے لئے بھیج دیا اور گواہان سے پوچھ تاچھ شروع کی تو ایف آئی آر میں نامزد تین چشم دید گواہوں میں سے ہر گواہ کا بیان مختلف تھا اور ایک دوسرے کی تردید کرتا تھا۔ معلوم

ہوا کہ مہلوک کی اس کے بھائی سے کچھ نا اتفاقی چل رہی تھی چونکہ مہلوک دمہ کا مرض تھا اور کافی تکلیف رہا کرتی تھی' اس لئے اس نے رات میں کسی وقت باہر آکر پیڑ میں رسی سے لٹک کر خود کشی کر لی تھی' اس کے لڑکوں نے گاؤں کے ایک آدمی سے جو وکالت کرتا تھا' مشورہ کرکے جھوٹا مقدمہ قتل کا لکھ دیا۔ پرائمری ہیلتھ سینٹر کے ڈاکٹر صاحب نے بھی بتایا کہ مہلوک دمہ کا مریض تھا اور ان کے زیر علاج ایک عرصہ سے چلا آرہا تھا۔ اس واقعہ سے ایک روز پہلے جب وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا تھا تو ان سے کہہ رہا تھا کہ لگتا ہے خود کشی ہی کرنی پڑے گی' یہ تکلیف تو برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ میں اس بوڑھے اور اس کے دونوں بیٹیوں کو جو ملزم لکھائے گئے تھے۔ لے کر تھانے آگیا اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے آنے کا انتظار کیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ڈاکٹر نے تصدیق کردی کہ اس کی موت خود کشی سے ہوئی ہے' گلا دبا کر نہیں مارا گیا۔ سرکل آفیسر صاحب بھی آئے' ان کو میں نے پورا واقعہ بتایا اور پوسٹ مارٹم رپورٹ دکھلائی' انہوں نے موقع پر ہی جاکر تصدیق کی اور میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مقدمہ کو خارج کرنے کی سفارش کی اور ملزمان کو بے گناہ بتاتے ہوئے انہیں چھوڑنے کو کہا۔ میں نے ان کے سامنے ہی ملزمان کو رخصت کردیا اور عنقریب تھا کہ فائنل رپورٹ لگا کر مقدمہ کو ختم کردیتا کہ اچانک بڑے کپتان صاحب کا فون آیا کہ آپ اس مقدمہ میں فائنل رپورٹ نہیں لگائیں گے۔ میں نے اس حکم کی تعمیل سے معذوری ظاہر کی تو کہنے لگے کہ آپ فوراً" آکر مجھ سے ملیں۔ میں شہر جاکر ان سے ملا اور ساری بات انہیں بتلائی اور کہا کہ یہ کوئی معمولی مارپیٹ کا مقدمہ نہیں قتل کا کیس ہے۔ ملزمان بے گناہ ہیں' انہیں پھانسی بھی ہو سکتی ہے کیس مکمل جھوٹا بنایا گیا ہے۔ جواب ملا کہ آپ کو آتما پرماتما کا اتنا ہی خیال ہے تو پولیس کی ملازمت کیوں کر رہے ہیں۔ میں حلقہ کے MLA (ممبر اسمبلی) کو ناراض نہیں کر سکتا۔ اس نے مدعی کی سفارش کی ہے اور کیس کو سچ بتایا ہے اور کہا ہے کہ آپ اور آپ کے سرکل آفسر صاحب گھپلا کر رہے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان اس معاملے پر خاصی گفتگو ہوئی مگر بے سود۔ وہ بھی جانتے تھے کہ میں سچ پر ہوں مگر اپنے MLA کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ دوسرے دن SSP صاحب کا حکم آیا کہ آپ اس کیس کے ملزمان کو گرفتار کرکے جیل بھیج دیں اور مقدمہ کی چارج شیٹ عدالت میں بھیج دیں۔ میں نے اس حکم نامہ کو کیس ڈائری میں نقل کردیا اور ایک کانسٹبل کو بھیج کر ملزمان کو کوتوالی بلوالیا۔ وہ بے چارے جیسے پہلے آتے تھے پھر آگئے۔ میں نے کہا تم لوگ جانتے ہو' تمہیں کیوں بلوایا گیا ہے۔ بولے جی ہاں جیل بھیجنے کے لئے آپ نے بلوایا ہے۔ "اور تم لوگ چلے آئے" میں نے کہا "آپ اگر ہم کو پھانسی پر لٹکانے کے لئے بھی بلاتے تو ہم چلے آتے" بڈھے نے جواب دیا.... "آج کل کسی بے گناہ غریب آدمی کے لئے کون اتنا کرتا ہے' ہمیں سب پتہ چل گیا ہے

کہ آپ نے ہم لوگوں کے لئے کس کس سے لڑائی مول لی ہے۔ تعجب ہے کہ آپ جیسے لوگ بھی پولیس میں موجود ہیں۔ ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آپ ہمیں جیل بھیج دیجئے۔" اور میں نے انہیں جیل بھیج دیا لیکن پہلی ہی پیشی میں مقدمہ عدالت نے خارج کردیا اور ملزمان گھر آگئے۔ SSP صاحب کچھ دنوں تک مجھ سے ناراض رہے۔ ایک روز اکیلے میں کہنے لگے..... "مقصود! مجھے اپنی غلطی کا بعد میں احساس ہوا۔ پارٹی پالیٹکس میں پڑ کر MLA نے مجھے گمراہ کیا تھا۔ میں نے کہا حقیقت آپ کو ابھی بھی معلوم نہیں ہوئی MLA سے نے دس ہزار روپے لئے تھے، جھوٹی سفارش کے لئے۔ یقین نہ آتا ہو تو۔۔ روپے دینے والے سے پوچھوا دوں۔"

اس واقعے کو بیان کرنے والے مقصود احمد صدیقی اپنا تخلص مقصد الہ آبادی کرتے ہیں۔ 10 جون 1940ء کو قصبہ مسافر خانہ ضلع سلطان پور، یوپی، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن موضع رسول آباد کوٹلہا ضلع الہ آباد ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے 1958ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ اگلے سال LLB میں داخلہ لیا لیکن کچھ نامساعد حالات کی بنا پر انہیں سلسلہء تعلیم منقطع کرنا پڑا۔ 1960ء میں ایم۔ اے اردو میں داخلہ لیا لیکن اسی سال مرکزی حکومت کی ایک ملازمت (آڈیٹر کنٹرولر آف ڈیفنس اکاؤنٹس) مل گئی لیکن یہ ملازمت ان کی افتادِ طبع سے قطعی میل نہ کھاتی تھی۔ ان کا ارادہ شروع سے فوج میں جانے کا تھا اور اس لئے انہوں نے ملٹری سائنس کی تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ اپنے نصب العین کو تو حاصل نہ کرسکے لیکن پولیس کی ملازمت کو انہوں نے بہرحال ضرب تقسیم کی ملازمت پر ترجیح دی اور 1963ء میں سب انسپکٹر پولیس کی حیثیت سے منتخب کرلئے جانے پر مراد آباد ٹریننگ کالج گئے اور ٹریننگ مکمل کرکے 1964ء میں کانپور میں متعین ہوئے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تھانہ مسافر خانہ ضلع سلطان پور، جہاں یہ پیدا ہوئے تھے اور جہاں ان کے والد 1940ء میں تھانہ انچارج تھے، وہیں یہ آخری بار بحیثیت تھانہ انچارج 1974ء میں تعینات ہوئے اور وہیں سے 1977ء میں ان کا پروموشن انسپکٹر کے عہدہ پر ہوا۔ بیوی اور بچے 1986ء میں امریکہ ہجرت کرکے آگئے تھے، اس لئے مقصود قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر 1988ء میں امریکہ آگئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

شاعری کی طرف شروع سے میلان طبع تھا۔ عام اردو شعراء کی طرح غزل گوئی سے شروعات کی۔ بارہ یا تیرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ شروع کی دو چار غزلیں انہوں نے اپنے ہی گاؤں کے "عیش" صاحب مرحوم کو دکھلائیں، جنہوں نے شعر کے حسن و قبح اور لوازمات شعری سے انہیں تھوڑی بہت واقفیت بہم پہنچائی لیکن جلد ہی یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ انہوں نے کبھی کسی سے باقاعدہ اصلاح کے لئے رجوع نہیں کیا خود ہی اپنے کلام پر بار بار نظر

کرتے رہے اور اپنی ہی فہم و تمیز کے مطابق اس میں وقتاً "فوقتاً" اصلاح کرتے رہے۔ اقبال، غالب اور فیض سنجیدہ شاعری میں اور اکبر الہ آبادی بحیثیت طنز و مزاح نگار ان کے پسندیدہ شاعر ہیں اور غزل ان کی محبوب ترین صنف سخن ہے۔ کہتے ہیں۔۔۔۔ "غزل کی لطافت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں عصری و آفاقی مضامین کو فنکارانہ طور پر نظم کرنے کا قائل ہوں۔ میں رجعت پسند نہیں لیکن بے ساختہ ترقی پسند بھی نہیں کہ غزلیں پتھراؤ کا سامنظر پیش کرنے لگیں۔ میں رند اوباش نہیں اور نہ ہی زاہد خشک ہوں بلکہ آج کی ہنگامہ خیز زندگی کا ایک عالم انسان ہوں جو باوجود تمام تر دشواریوں اور پریشانیوں کے زندہ رہنے اور اپنے ماحول کو زندہ رکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ میں سنجیدہ او ر ظریفانہ دونوں طرح کے کلام کہتا ہوں۔ 1988ء میں میرا پہلا مجموعہ کلام "شعلہء گل" شائع ہوا جو کہ طنزیہ و مزاحیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ 1995ء میں میرا دوسرا مجموعہء کلام "حرز جاں" شائع ہوا جو سنجیدہ کلام پر مشتمل ہے۔ زمانہء طالب علمی میں میرا کلام پاکستان کے کچھ رسالوں میں شائع ہوتا رہا (لوح قلم، سوداگر وغیرہ میں) ہندوستان میں اخبار "قومی آواز" (لکھنؤ) اور امریکہ میں "اردو ٹائمز" نیویارک میں میرے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ مذہبی مضامین مقصود احمد صدیقی کے نام سے اور تنقیدی و ادبی، طنزیہ و مزاحیہ مضامین مقصد الہ آبادی کے نام سے لکھتا ہوں۔

اردو کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہنے لگے۔۔۔۔ "حالانکہ "اردو زبان" اس بد قسمت اولاد کی طرح ہے، جس کے والدین ہی اسے پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں لیکن میں نہ صرف باامید ہوں بلکہ اس کے خوش آئند مستقبل کا یقین رکھتا ہوں۔ آپ میرے جملے پر چونکیں نہیں "اردو" ہندوستان میں پیدا ہوئی، اس ہندوستان میں جو متحدہ تھا، جہاں ہندو مسلمان سبھی رہتے تھے، جیسے پنجابی، سندھی، بنگالی سبھی بولتے تھے۔ بیرون ملک سے آئے ہوئے حکمراں اور اندرون ملک کی رعایہ نے ایک رابطہ کی زبان کے طور پر اس کی تخلیق کی تھی، اس لئے سب کو یکساں عزیز تھی پھر اسی اردو کے انقلاب زندہ باد کے سایے میں ہمیں آزادی ملی لیکن آزاد ہوتے ہی سب سے بڑا عتاب اگر کسی زبان پر نازل ہوا تو اسی اردو پر۔ ہندوستان میں اسے مسلمانوں کی زبان کہہ کر زندہ درگور کیا جارہا ہے۔ پاکستان میں علاقائی عصبیت کا عفریت اس کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے (حالانکہ سرکاری اور قومی زبان کی حیثیت اسے وہاں پھر بھی کافی تحفظ حاصل ہے) بنگلہ دیش میں بنگالیوں نے اردو کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا ہے۔ اس سب کے باوجود ہندوستان بلکہ برصغیر میں رابطہ کی زبان اگر کوئی کہی جاسکتی ہے تو وہ اردو ہی ہے اور اب تو بیرون برصغیر جہاں جہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی ہے خواہ وہ یورپ ہو یا امریکہ یا دبئی وغیرہ، ہر جگہ لوگ اردو بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں اور اردو کی مختلف تنظیمیں جگہ جگہ قائم ہیں اور آپ جیسے لوگ اپنے اپنے طور پر اس کے

لئے حتی المقدور کوششیں کر رہے ہیں۔

ان کا کہنا ہے۔۔۔ "غزل کو میں اظہار خیال کے لئے سب سے بہتر سمجھتا ہوں کیونکہ یہ اشارات (Symbols) کا استعمال کرتی ہے اور بڑے سے بڑے خیال کو دو مصرعوں میں نظم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ اس میں گل وبلبل اور شمع پروانے کی حکایتیں ہی نظم کریں آپ کسی بھی موضوع پر (تصوف، سیاست، مذہب، محبت، اشتراکیت وغیرہ پر) گفتگو کر سکتے ہیں اور اس انداز میں کر سکتے ہیں کہ آپ پر کوئی گرفت بھی نہیں کر سکتا بقول غالب۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بادہ و ساغر ہی کیوں تمام نئے نئے استعارات، لوگ استعمال کر رہے ہیں اور ہر مکتب فکر کی نمائندگی غزل میں ہو رہی ہے اور آپ نثری نظم کو نظم ہی کیوں کہیں نثر کہنے میں کیا قباحت ہے اگر خیالات واقعی شاعرانہ ہیں تو اسے نثری شاعری کہنا میری سمجھ میں زیادہ مناسب ہوگا، اس لئے کہ جب تک آپ اپنے شاعرانہ خیالات کو منظم نہ کریں، وہ نظم یا نظم کی کسی صنف میں شمار کئے جانے کی چیز میری رائے میں نہیں ہوتی۔"

مشاعروں کے سلسلے میں ہنس کر بولے۔۔۔ "مشاعروں میں آج تک دو قسم کے شاعر کامیاب ہوئے بلکہ تین قسم کے پہلے نمبر پر وہ جن کا ترنم اچھا ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جن کی شخصیت ادب میں بھاری بھرکم ہوتی ہے جنہیں سامعین اس لئے ہوٹ کرنے سے کتراتے ہیں کہ جب یہ اتنا بڑا شاعر ہے تو ضرور کوئی اچھی بات ہی کہی ہوگی خواہ اس نے بالکل لچر شعر ہی کیوں نہ سنائے ہوں۔ تیسرے نمبر پر آتے ہیں سستی مزاح نگاری کرنے والے شاعر یہ عام طور پر اپنے مضحکہ خیز تخلص، مضحکہ خیز حلیہ، مضحکہ خیز الفاظ اور اداکاری سے مشاعرے لوٹتے ہیں۔ ایسے مزاح نگاروں کی تخلیقات پر ہنسنے والے اگر تھوڑی دیر کے لئے سنجیدگی سے غور کریں کہ وہ کس بات پر ہنس رہے ہیں تو شاید اسی بات پر انہیں رونا آجائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مشاعروں میں کبھی معیاری کلام سننے کو نہیں ملتا۔ دراصل آج کل سامعین کا معیار بھی اتنا گر گیا ہے کہ اچھے شعراء بھی اپنا اچھا کلام مشاعروں میں سنانے سے کتراتے ہیں۔ ظاہر ہے جس مال کی مارکیٹ میں ڈمانڈ ہوگی، اسی مال کی سپلائی بھی کرنی پڑتی ہے، اس لئے وہ بیچارے بھی کیا کریں، مشاعروں کے لئے ہلکی پھلکی اور چٹپٹی غزلیں اور نظمیں کہہ کر رکھتے ہیں چونکہ سامعین کی پسند اور معیار فہم خاصہ بگڑ گیا ہے، لہٰذا مشاعروں میں اچھی ادبی تخلیقات عموماً سننے کو نہیں ملتیں، ہاں نشستوں میں اچھے شعر اور معیاری کلام اب بھی اکثر سننے کو مل جاتے ہیں۔ اردو زبان کو عوام میں پاپولر بنائے رکھنے کے لئے مشاعرے بہرحال اچھا رول ادا کرتے

ہیں۔ وہ ادب جو زندگی کی ترجمانی کرتا ہے ہمیشہ مقبول و پسندیدہ رہا ہے، آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس دور میں ادیب اور قاری کا رشتہ ہی کیا سارے ہی رشتے کمزور پڑ گئے ہیں۔ انہی کمزور رشتوں کی ہی عکاسی تو آج کا ادب کر رہا ہے۔ یہ دور افلاطون اور سقراط کی طرح فرصت کا دور نہیں ہے نہ غالب اور مومن کی طرح ہر لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنانے کی کسی کو فرصت ہے، نہ آتش کی طرح شاعری مرصع سازی کا ہنر رہ گئی ہے۔ ہم جس دور میں جی رہے ہیں ہمارے پارۂ ادب اسی دور کی عکاسی کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ کچھ بنیادی مسائل ہیں جو ہر جگہ مشترک ہوتے ہیں لیکن ان کی نوعیتیں جداگانہ ہوا کرتی ہیں۔ تکنیک اگر مفید ہے تو اسے مغرب سے یا کہیں سے بھی لینے میں کوئی عیب نہیں۔ ہر ادیب کو اپنے ملک اور ماحول کے مسائل کا ادراک ہونا چاہئے اور وہی اس کے احساس و شعور کا محور ہونا چاہئے اور اسی کے حل کی اسے جستجو اور فکر ہونی چاہئے۔"

عکسِ فن

غزل

موت میں عافیت نظر آئے
زندگی کیا اسی کو کہتے ہیں

کچھ نہ اپنے سوا دکھائی دے
روشنی کیا اسی کو کہتے ہیں

اپنے ہی آپ کو نہ پہچانے
آگہی کیا اسی کو کہتے ہیں

○

مٹ گئے سارے حرف رشتوں کے
خواندگی کیا اسی کو کہتے ہیں

سب پرائے ہوئے جو اپنے تھے
مفلسی کیا اسی کو کہتے ہیں

جس سے شیطاں بھی ہو خجل مقصد
آدمی کیا اسی کو کہتے ہیں

جتنے بھی کانٹے ہیں سب پلکوں سے اپنی چن لو
آنے والوں کے لئے راہ تو آساں ہوگی

منصور ملتانی

Mansoor Multani
212/14 Old Area, Airport
Karachi-75200, Pakistan

منصور ملتانی

کراچی

1989ء میں منصور ملتانی کی غزلیات و رباعیات پر مشتمل پہلا مجموعہ "سورج زمیں پر" شائع ہوا اور اگلا مجموعہ بھی ممکن ہے غزلیات پر مشتمل ہوتا کہ 1992ء میں اللہ تعالٰی نے انہیں ایک نئی راہ منتخب کرنے کا موقع دیا۔ انہیں ایک مشاعرے کے دعوت نامہ کے ساتھ نعت کہنے کی فرمائش ملی۔ انہوں نے نعت شروع کی تو صرف چار اشعار کے بعد گاڑی رک گئی اور کوششوں کے بعد بھی طبیعت رواں نہ ہوئی۔ ان کے اندر کی پکار میں جذب تھا فریاد بھی تھی کہ ان کے ہیڈ آفس سے انہیں عمرہ ادا کرنے والی ٹیم کا سربراہ بنا کر معہ ٹکٹ و اخراجات روانہ کر دیا گیا۔ پھر تو نہ صرف وہ نعت مکمل ہو گئی بلکہ وہ سلسلہ شروع ہوا کہ اللہ کے خاص فضل اور اس کے محبوبؐ کے کرم سے حمدیہ و نعتیہ قطعات کا ایک مجموعہ "مرسل و مرسل" کے نام سے اسی سال 1998ء میں "ڈائیلاگ پبلی کیشنز" کے تعاون سے شائع ہو کر آ گیا۔ زیرِ طبع و ترتیب میں مزید 4 مجموعے "سید البشر' خواب زدہ رت جگے' اعلان سحر اور چشم خوش گماں" کے علاوہ سرائیکی افسانوں کا مجموعہ "دابندی دی کندھ" بھی شامل ہے۔

ان کا نام تنویر عارف خان ہے۔ منصور تخلص ہے۔ 23 جولائی 1950ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ گریجویشن کے بعد ملازمت کے دوران بیرونی امیدوار کے طور پر پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ شاعری کے علاوہ تحقیقی مضامین اور تبصرے بھی لکھتے ہیں۔ کسی خاص مکتب فکر سے وابستگی نہیں۔ اپنے گرد و پیش جو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں' اپنے لہو میں شامل کر لیتے ہیں۔ یہی تجربہ اور مشاہدہ اشعار کے روپ میں ڈھلتا ہے۔

اردو کے مستقبل سے پر امید ہیں کیونکہ اسے اقوام متحدہ کی سرکاری زبانوں میں شامل

کرنے کی تحریک جاری ہے۔ دنیا کی تیسری بڑی زبان کی حیثیت سے یہ اپنی جگہ آپ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

شاعری کی صنف میں غزل کو اظہار کا موثر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ نظم کی مثال ایک مفصل پینٹنگ کی طرح ہے، جس کی ایک ایک تفصیل کی وجہ سے قاری یا سامع اپنے آپ کو اس میں شریک نہیں پاتا۔

نثری نظم کے لئے اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔۔۔ "کیا رجب علی بیگ سرور کی تحریر نثری نظم نہیں تھی۔ ہاں البتہ شدت اظہار کے نام پر ہر قسم کی پابندیوں سے مراد فرار کے شوقین خواتین و حضرات کی دل پسند صنف نثری نظم ہی ہو سکتی ہے۔ ہر معاشرہ کچھ نہ کچھ اصول و ضوابط کے تحت قائم ہوتا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان زندگی تو کچھ اصول و ضوابط اور فطری اور جبلی تقاضوں کے مطابق گزارے اور تخلیقی عمل کے سلسلے میں کسی ضابطے کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ یہ بات کچھ غیر فطری نہیں معلوم ہوتی؟

منصور کہتے ہیں۔۔۔ "مشاعرے کبھی بھی ادب عالیہ کی تخلیق میں معاون ثابت نہیں ہوتے۔ مشاعروں میں بطور تہذیبی رویے کے جو تبدیلی ظہور پذیر ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں صرف سطحی شاعری کی حوصلہ افزائی ممکن ہے۔ یوں کسی بھی شاعر پر اس بیداد کا اثر منفی طور پر پڑ سکتا ہے اور شاعر کی مخفی صلاحیتیں جو عظیم ادب کی تخلیق کی اہل ہو سکتی ہیں خوامخواہ سستی واہ واہ کے شوق میں ضائع ہونے لگتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں تخلیقی نشستیں بہتر تخلیقی معاون ہیں اور اگر عوام الناس تک یہ ادبی تخلیقات لکھی ہوئی حالت میں پہنچتی رہیں تو انہیں بھی تحریر شدہ الفاظ کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی عادت پڑے گی، جس میں مشاعروں کے اسٹیج پر شعراء حضرات کی گلے بازی اور اداکاری کا زور شامل نہیں ہوگا۔"

ان کے خیال میں ادب کا رشتہ قاری سے کبھی نہ کٹتا اور نہ ہی کمزور پڑتا ہے اور یہ کہنا کہ دور حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے۔ صورتحال کی درست عکاسی نہیں ہے بلکہ آج کا ادب تو عملی فضا ہی میں سانس لے رہا ہے اور عمل سے اس کی قربت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ دراصل ہر طرف غیر فطری زندگی گزارنے کی کوششیں اتنی زیادہ بڑھ چکی ہیں کہ خواہشوں کے ہجوم میں گھرا ہوا انسان نا آسودگی اور نارسائی کے جہنم میں جل رہا ہے اور ایسے میں صرف ادب ہی ہے جو اسے سکون و عافیت کے چند لمحے فراہم کر سکتا ہے۔ زندگی جتنی زیادہ مشینی ہوتی جا رہی ہے، اتنا ہی اس جدید دنیا کو ادب کی ضرورت ہے تاکہ انسان کی جمالیاتی حس بالکل مردہ نہ ہو جائے اور وہ انسان کے بلند مرتبے سے پستی میں نہ گرے اور مشین بن کر نہ جائے۔

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔۔۔ "میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ادب

عالیہ کا رشتہ اس زمین سے کبھی نہیں ٹوٹتا' جہاں وہ تخلیق ہو رہا ہو۔ سانچے اور اصناف مختلف ہو سکتے ہیں۔ چاہے وہ مقامی ہوں یا در آمد شدہ۔ یہ تو طبائع کی موزونیت پر منحصر ہے۔ حقیقی تخلیق کار ہمیشہ اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے مسائل سے حسیت کشید کرتا ہے اور کائنات کا مطالعہ ہمیشہ اپنی ذات کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس لئے وہ کسی صنف سخن کو بطور فیشن کبھی نہیں اپناتا۔ ہاں کچھ موزوں طبع لوگ جو موقع پرست ہوتے ہیں اور مختلف مواقع مل جانے پر کچھ کر گزرنے کے شوق میں اور انفرادیت کے اظہار کی جستجو میں کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں جو وقتی طور پر تو ادب عالیہ نظر آتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقی قدر و قیمت کا تعین ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ موقع پرست ہنرمند جو کچھ لکھتے رہتے ہیں' ان سے زبان و ادب کے دامن میں کچھ نہ کچھ گرتا ہی رہتا ہے۔ چاہے وہ پھول کی ایک پتی ہی کیوں نہ ہو۔ جاپانیوں نے تو کبھی سوچا بھی نہ ہو گا کہ ان کی ہائیکو کبھی اردو زبان کا حصہ بنے گی اور اس میں حمد و نعت لکھی جائے گی یا سانیٹ بھی وجود میں آئیں گے لیکن یہ طے ہے کہ ادب عالیہ کی تخلیق میں کوئی تخلیقی سانچہ کبھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ ہر مسائل' حسیت اور احساس و شعور ہماری اپنی زمین سے متعلق ہونے چاہئیں۔"

عکس فن

الحکیم (حکمت والا)

حکمت دیں میں تمہیں بخشے گا وہ اعلیٰ مقام
حکمت دنیا تو ہے اس کے غلاموں کی غلام
دین و دنیا کے تمہارے کام رک سکتے نہیں
ورد ہی کرتے رہو' ہے "الحکیم" اس کا ہی نام

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

جو طلوع صبح سے پیشتر اٹھیں اور رب کی ثنا کریں
ہے انہی سے میری یہ التجا' مرے حق میں اتنی دعا کریں
کروں رب کے بعد جو حمد تو وہ رسولؐ پاک کی حمد ہو
ہو زباں پہ اسم محمدؐ تو درود اشک پڑھا کریں

بچھڑنا ہے تو مت الفاظ ڈھونڈو
ہمارے واسطے لہجہ بہت ہے

جاوید منظر

Javed Manzar
Al-Aalameen,
B-361, Block-N,
North Nazimabad
Karachi-33, Pakistan

جاوید منظر
کراچی

یہ 1960ء کی دہائی کا واقعہ ہے۔ ریڈیو پاکستان کی بزم طلباء کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ ہوا، جس کے پروڈیوسر یاور مہدی تھے۔ یوں تو ریڈیو سے جب بھی مشاعرے ہوئے تو ہر کالج سے ایک اور یونیورسٹی سے دو طالب علم یا طالبہ کو شرکت کی اجازت تھی۔ اس زمانے میں ٹی وی شروع نہیں ہوا تھا۔ کالج کے ہر طالب علم کی معراج ہوتی تھی کہ بحیثیت شاعر وہ ریڈیو کے طلبہ کے پروگرام میں اپنی نگارشات پیش کرے۔ یوں کالج کے پرنسپل اور ریڈیو کی انتظامیہ پر سفارشوں کی بھرمار ہوتی تھی اور ہر دو ادارے بہت پریشان تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ طالب علم شعراء جو خود شعر کہتے تھے' عجیب محرومی کی کیفیت سے دوچار تھے کیونکہ جو طالب علم بحیثیت شاعر شرکت کرتے تھے' ان میں زیادہ تعداد ان کی ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں سے شعر کہلواتے تھے اور اچھی آواز اور بہتر ادائیگی کا سہارا لیتے ہوئے مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل طالب علم شعراء میں حقیقت سے آشنا تھے مگر مجبور تھے۔ پھر ہوا یوں کہ ایک دن ریڈیو پاکستان بزم طلبہ کی انتظامیہ نے ہر کالج اور جامعہ کراچی میں یہ اطلاع نامہ بھجوایا کہ آپ کے پاس جو بھی شاعر یا شاعرہ ہیں۔ وہ اپنی تخلیق لے کر ریڈیو اسٹیشن کراچی پہنچ جائیں' سب کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ چنانچہ ہر درسگاہ سے بہت سے طالب علم مشاعرے میں شرکت کرنے بھیجے گئے۔ جب تمام طالب علم اپنے مختلف کاموں سے فارغ ہو گئے تو ان سے یاور مہدی صاحب نے مختصر خطاب کیا اور کہا کہ آپ اپنی لائی ہوئی غزل یا نظم ہمارے معاون پروڈیوسر کے پاس جمع کرا دیں۔ سب نے یہی کیا۔ جب سب شریک شعراء و شاعرات اس عمل سے فارغ ہو گئے تو ہر ایک کو ایک ایک گتہ اور پھنسل دے کر اسٹوڈیو کا

دروازہ مقفل کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اس فرش نشست پر آپ سب لوگ تشریف رکھیں۔ آپ کو مصرعہ طرح دیا جاتا ہے، آپ سب کو فی البدیہہ شعر کہنا ہے۔ کم از کم پانچ اشعار ہوں اور زیادہ کے لئے کوئی قید نہیں۔ بس جناب یہ سنتے ہی چند کے علاوہ سب ہی طالب علموں کے چہرے فق ہو گئے اور وہ باہر نکلنے کی سبیل ڈھونڈنے لگے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کمرے میں جو شعراء باقی رہ گئے وہ یہ تھے۔ اشرف شاد، ثروت حسین، ضیغم زیدی، اقبال فریدی، نقاش کاظمی، ولی رضوی، تاجدار عادل، ایوب خاور، جاوید منظر اور خود پروین شاکر، پروین نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا اور اب جاوید منظر اپنی زندگی کا یہ دلچسپ واقعہ یاد کر کے مجھے سنا رہے تھے اور محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس کے بعد دو اور فی البدیہہ مشاعرے پرنسپل پروفیسر خواجہ آشکار حسین صاحب کے دور میں بنی باغ کالج میں منعقد ہوئے اور یوں جو طلباء و طالبات خود شعر نہیں کہتے تھے، وہ رفتہ رفتہ ریڈیو پاکستان کے مشاعروں اور مختلف کالجوں کے انعامی مشاعروں سے دور ہوتے چلے گئے۔

جاوید منظر "قلم قبیلہ" کی چیئرپرسن محترمہ ثاقبہ رحیم الدین کی دعوت پر 1992ء میں کوئٹہ میں کل پاکستان مشاعرہ پڑھنے بھی گئے، جس میں ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا، افتخار عارف وغیرہ بھی شریک تھے۔ مشاعرے میں انہیں بہت پذیرائی نصیب ہوئی اور یوں یہ مشاعرہ ان کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

آیئے اب "سخن ور حصہ سوم" کے لئے جاوید منظر سے تفصیلی ملاقات کرتے ہیں۔ نام ان کا کاظم جاوید عالم ہے اور تخلص منظر۔ یوں یہ جاوید منظر کہلاتے ہیں۔ 25 ستمبر 1948ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ پریمئیر کالج سے بی کام کرنے کے بعد جامعہ کراچی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ انکم ٹیکس پریکٹیشنر سینٹر بورڈ آف ریونیو اسلام آباد سے اور سی اے (آرٹیکل شپ برائے چارٹرڈ اکاؤنٹنسی بھی میسرز فیروز شریف اینڈ کمپنی کے زیر انتظام 1975ء میں ختم کی۔ 1976ء سے 1978ء تک منسٹری آف ڈیفنس سلطنت آف عمان کے شعبہ اکاؤنٹس میں ملازمت کی۔ 1979ء میں پاکستان اسٹیل مل کے آڈٹ ڈپارٹمنٹ سے بحیثیت مینجر وابستہ ہوئے اور مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے 1995ء سے اسی ادارے میں شعبہ انشورنس کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔

جاوید منظر کے والدین کا تعلق بدایوں کی اس عظیم الشان بستی سے ہے، جہاں محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت امیر خسروؒ نے بھی جنم لیا۔ اودھ کی تہذیب اور علم و ادب کی خوشبو والدین سے ان تک بھی پہنچی۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 1961ء سے کیا۔ جیل روڈ کے گورنمنٹ ہائی اسکول کے مجلّہ "بہار نو" میں ان کا کلام چھپا تو ان کے حوصلے بلند ہوئے۔ یہ مجلّہ حضرت سیماب اکبر آبادی کے شاگرد حضرت صبا متھراوی

کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ 1967ء میں ان کی پہلی غزل ماہنامہ "سیپ" کراچی میں چھپی جو نسیم درانی کی ادارت میں اب بھی شائع ہوتا ہے اور اپنے وقت کا ایک معتبر جریدہ کہلاتا ہے۔ اس کے بعد تو ان کا کلام فنون' اوراق' محراب' دنیائے ادب' مجلّہ بدایوں' شمع اور شمع دہلی میں باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ "خواب سفر" 1986ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ کلام "بے صدا بستیاں" 1996ء میں شائع ہوا۔

جاوید منظر بنیادی طور پر غزل کو شاعری کی اساس جانتے ہیں اور زیادہ تر غزل کو اظہار کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ گو کہ نظمیں بھی کہتے ہیں اور دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نثری نظم کے لئے ان کی رائے ہے کہ نثر اور نظم کو یکجا کرنے پر نثری نظم کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے جو قابل اعتراض نہیں مگر ہر صنف ادب کو اس کی حدود میں رکھ کر پروان چڑھانے کے حامی ہیں۔

جاوید منظر اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ کہتے ہیں.... "یہ حقیقت ہے کہ اردو دنیا کی زبانوں میں سے ایک بہت ہی اہم زبان ہے۔ اس زبان میں ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے اردو دنیا کے تقریباً" ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو زبان کو پچھلے دس پندرہ سال کے عرصے میں اردو شاعری نے دنیا کے سامنے متعارف کرایا ہے' لہٰذا ہمیں اردو کے مستقبل سے پرامید رہنا چاہئے۔ مشاعروں کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ آج کے دور میں مشاعرے اردو کو پروان چڑھانے کا باعث تو بنتے ہیں مگر ادب کی تخلیق میں کوئی نمایاں کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں جبکہ شعری نشستیں ادب کی ترقی و ترویج میں نہایت بہتر طور پر کام کر رہی ہیں۔ ان تخلیقی نشستوں کو بہتر طور پر پرنٹ میڈیا کے ذریعے ادب کے قاری تک پہنچانے کی زیادہ کوششیں کرنی چاہئیں۔" جاوید منظر اس رائے سے متفق نہیں کہ ادب سے قاری کا رشتہ کٹ گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب کا تعلق ادب سے نہ کبھی کٹا ہے اور نہ آئندہ کسی دور میں کٹ سکنے کی توقع ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ لوگوں کی زندگی زیادہ مصروف ہو گئی ہے چنانچہ ادب کے لئے وقت نکالنے کے بارے میں نئی تراکیب اور نئے انداز کو پیش کرنا بہت ضروری ہے تاکہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور تصورات کو ادب کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے قارئین ادب کو ہمیشہ نئی تخلیقات فراہم کی جائیں۔ اس طرح شعور کی بلندی سے انسانی فکر میں مثبت تبدیلی رونما ہو گی۔

عکس فن

غزل

چلو پہلے ہم اپنی دوستی پر غور کرتے ہیں
پھر اپنے دوستوں کی دشمنی پر غور کرتے ہیں

نہیں کوئی جو دل کے ٹوٹ جانے کا سبب جانے
یہاں سب لوگ آنکھوں کی نمی پر غور کرتے ہیں

بہت ماضی میں ہم چاہے گئے چاہا نہیں ہم نے
تو آؤ آج اپنی سادگی پر غور کرتے ہیں

حقیقت کو حیات و موت کی سمجھے نہ ہم لیکن
کوئی مرجائے اس کی جانکنی پر غور کرتے ہیں

اگر دوچار بہتر بن گئے ہم میں تو کیا گنتا
یہاں سب اپنی اپنی بے بسی پر غور کرتے ہیں

وہاں انصاف کی کیسے توقع ہو جہاں منصف
کسی کو بھول جاتے ہیں کسی پر غور کرتے ہیں

کلی کی بے کسی کا ایک بھی منظر نہیں دیکھا
کلی کب توڑنے والے کلی پر غور کرتے ہیں

شاعر تو حقیقت کا فقط شیش محل ہے
شیشہ تو کسی کا بھی طرفدار نہیں ہے

فہیم باٹلہ
۷ فروری ۱۹۹۸

Dr. Fahim A. Batla
1528 Cameo Drive
Redlands, CA 92373
U.S.A.

ڈاکٹر فہیم باٹلا

لاس اینجلس

ڈاکٹر فہیم باٹلا نے اردو زبان سے محبت ورثے میں پائی ہے چنانچہ اردو کے پودے کی آبیاری کے لئے دامے درمے قدمے سخنے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں انہوں نے اپنے گھر پر ایک سالانہ شعری محفل سجائی۔ 25 کے قریب شریک شعراء و شاعرات نے بڑی پیاری نظمیں، غزلیں سنائیں۔ ان کی بیگم ناظمہ باٹلا نے مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا۔ ڈنر کے بعد چائے کا دور چلتا رہا اور لا اینجلس کی وہ سرمئی شام جب رات سے گلے ملی تو چائے، چاہ اور اور اشعار کی گرمی نے پاکستان کی ان خنک راتوں کی یاد دلادی جب ہم استاد قمر جلال آبادی کی صدارت میں کبھی نواب شاہ، کبھی میرپور خاص اور کبھی جیکب آباد میں چاندنی کی چھاؤں میں مشاعرے پڑھا کرتے تھے۔

ڈاکٹر فہیم باٹلا سلامت رہیں کہ ان جیسی شخصیات کے دم سے مخالف ہواؤں کی زد میں ہوتے ہوئے بھی اردو کے چراغ کی روشنی مدھم نہیں ہونے پائی۔ میرے سوالنامے کے جواب میں فہیم باٹلا لکھتے ہیں۔ "سلطانہ بہن، مجھے بہت مسرت ہے کہ آپ اپنی تصنیف "سخن ور" کا حصہ سوئم مرتب کر رہی ہیں۔ میرے لئے باعث عزو فخر ہے کہ آپ مجھے بھی اس میں شامل کرنا چاہتی ہیں مگر آپ کے ہر سوال کا جواب دینا میرے لئے جوئے شیر لانا ہے۔

بہرحال آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اپنے متعلق چند سطور حاضر ہیں۔

میرا نام فہیم احمد ہے۔ آبائی شہر دہلی تھا اور وہیں پیدائش ہوئی۔ خاندانی نام بٹلہ ہوا کرتا تھا جو انگریزی میں لکھنے کی وجہ سے باٹلا ہو گیا۔ بعد میں میں پی ایچ ڈی کی وجہ سے ڈاکٹر بھی نام کے ساتھ لگ گیا۔ نہ جانے کس خوش فہمی یا غلط فہمی کی بنا پر بزرگوں نے فہیم نام رکھ دیا تھا،

جسے درست کرنے کے لئے ناداں کا تخلص اختیار کرلیا۔

ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ 'اوکھلا' دہلی میں ہوئی جو اس وقت شہر سے کئی میل باہر تھا۔ وہیں ہوسٹل میں رہا کرتا تھا۔ انگریزی حکومت کو جامعہ ملیہ خار کی طرح چبھتی تھی چنانچہ آزادیء ہند سے پہلے وہاں بجلی اور پانی کی سہولتیں مہیا نہیں تھیں اور سبھی غرباء' رؤسا اور نوابوں کے لخت جگر لالٹینوں اور رہٹ کے کوئیں پر گزارا کرتے تھے۔ پھر بھی کیا دن تھے! اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین خان جو بعد میں ہندوستان کے صدر بنے۔ جامعہ ملیہ کے سربراہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب دل و جان سے کانگریسی تھے اور والد مرحوم' حاجی محمد بٹلہ والے' درمے اور سخنے پکے مسلم لیگی۔ اس اختلاف کے باوجود دونوں میں بہت گہری دوستی' ادبی اور سماجی تعاون اور برصغیر ہند کے مسلمانوں کے مسائل پر اتفاق تھا۔ جامعہ کے برابر ہماری خاندانی زمینیں اور باغات تھے۔ اسی دوستی اور جذبہ کے تحت والد صاحب پاکستان آتے ہوئے وہ سب زمینیں اور باغات جامعہ ملیہ کے نام کر آئے۔ سنا ہے کہ اب وہاں بٹلہ نگریا ایسے ہی کسی نام سے ایک شہر آباد ہے۔ بہرحال بچپن اس طرح سے گزرا کہ ایک طرف جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان' مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت گوپی ناتھ امن جیسی شخصیات اور کانگریس کی جدوجہد آزادی اور قربانیوں اور جلیاں والا باغ کے سانحہ سے واقفیت ہوئی تو دوسری طرف گھر میں قائداعظم محمد علی جناح' قائد ملت نوب زادہ لیاقت علی خان' مسلم لیگ اور خواب اقبال کا ذکر رہتا تھا۔ شاید اسی تضاد کی وجہ سے مجھ میں اس حقیقت کا احساس و شعور پیدا ہوا کہ خلوص و محبت' جرات اور قربانی کا صرف ایک ہی رنگ اور روپ نہیں ہوتا۔

اردو زبان سے میری محبت اور لگن والد صاحب کی مرہون منت ہے۔ وہ صاحب اردو کے بے حد شیدائی اور ادب پرست انسان تھے۔ جامعہ ملیہ میں اردو اور عربی شروع سے پڑھائی جاتی تھیں۔ جمعرات اور جمعہ اور دوسری چھٹیوں کے دنوں میں گھر پر بھی ان سے نجات نہیں ملتی تھی۔ ہم سب بھائیوں کی اردو اور فارسی کی مزید تعلیم کے لئے نجی اساتذہ مقرر تھے اور مجھے ان عالم و فاضل اساتذہ کے حلقے تازہ کرنے کے شرف کے ساتھ ساتھ اس نوعمری میں دیوان میر و غالب' مضامین چکبست اور حالی کے مقدمہء شعر و شاعری جیسے ادبی خزانوں سے علم و فن کے نگینے چننے کا موقع بھی نصیب ہوا۔ پرانی دہلی کے اکثر مکانوں میں بڑے بڑے صحن ہوا کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں بھی ایسا ہی ایک صحن تھا' جس میں کم از کم تین سو افراد آسانی سے سما جاتے تھے۔ اس صحن میں اجلی اجلی چاندنیاں بچھا کر اور چاروں طرف رنگ برنگے گاؤ تکیے لگا کر شعر و ادب کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ ان محفلوں میں جگر مراد آبادی' اسرار الحق مجاز' جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی جیسے عظیم شعراء اور عالم و فاضل شخصیات کے کلام اور علم و فکر سے آگاہی ہوئی۔ ایک دفعہ میں مجاز کے کلام کے دوران

شرارت پر مصر تھا اور والد صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا تو مجاز صاحب نے بہت محبت مگر سخت ہاتھوں سے پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور میں ان کے کلام سے زیادہ ان کے گلے کی نسوں کے اتار چڑھاؤ سے محظوظ ہوتا رہا۔

غالب اردو آم کے حوالے سے بچپن کا ایک واقعہ مجھے بخوبی یاد ہے۔ والد صاحب آموں کے رسیا تھے۔ گھر کی نچلی منزل میں ایک تہہ خانے نما کمرہ تھا، جس میں وہ اپنے ہاتھ سے ان آموں کی پال ڈالتے تھے اور گرمیوں کی محفلوں میں آموں سے مہمانوں کی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ ایک انگریز پولیس افسر کی والد صاحب سے دوستی تھی۔ وہ بھی اکثر ان محفلوں میں آجاتا تھا۔ سب لوگوں کو بہت تعجب ہوتا تھا کہ ایک انگریز شخص اردو اور خصوصاً اردو شاعری کا اتنا شوقین ہے لیکن لحاظ میں اس سے کچھ پوچھتے نہیں تھے۔ ایک شام وفا دہلوی چپ نہ رہ سکے اور اس سے کہہ بیٹھے کہ بھائی تمہیں اردو کی الف اور بے بھی نہیں معلوم پھر بھی ان محفلوں میں آتے ہو اور اچھے شعر پر داد بھی دیتے ہو تو اس انگریز نے بتایا کہ وہ تو محض حاجی صاحب یعنی میرے والد مرحوم کے آموں کے شوق میں آتا تھا اور جب لوگ واہ واہ کرتے تھے تو آداب محفل کا لحاظ کرتے ہوئے خود بھی وہی کرنا شروع کردیتا تھا۔ وفا صاحب نے جواب میں فرمایا کہ چاہے تم اردو نہ جانتے ہو مگر غالب کے چیلے ضرور لگتے ہو۔

آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ شاعری کے کس مکتبہ ء فکر سے میری شاعری متاثر ہے؟ اس کا جواب تو میں نہیں دے سکتا لیکن اتنا ضروری عرض کروں گا کہ میں اس طرح کی دوستانہ، پر از خلوص اور شستہ ماحول اور گفتگو اور اس زمانے کی محفلوں کے آداب و اخلاق سے ہمیشہ بہت متاثر رہا ہوں۔ جوش صاحب کی مجاز اور شاہد احمد دہلوی سے مستقل نوک جھونک رہتی تھی لیکن مجال ہے کہ کسی نے بھی کبھی تہذیب و اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہو یا ذاتیات تک نوبت پہنچی ہو۔ ان لوگوں کی ایک دوسرے پر چوٹیں بھی علم و ادب اور لطافت زبان کا مظہر ہوتی تھیں، جن سے سامعین بے مزا ہونے کی بجائے خوب محظوظ و مسرور ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ بیرون دہلی سے ایک نوجوان شاعر بھی مشاعرے میں شرکت فرما تھے۔ ان کا کلام تو بہت خوب تھا مگر "ق" کو "خ" پڑھ رہے تھے۔ ان کے کلام کے دوران تو جوش صاحب نے ان کے ہر اچھے شعر پر حسب مناسبت داد دی۔ جب وہ پڑھ چکے تو جوش صاحب نے فرمایا کہ صاحب زادے، یہ تقریب مشاعرہ ہے، تخریب مشاعرہ نہیں! ہائے کیسے کیسے لوگ خاک طاق ماضی ہوگئے!! شاید انہی محفلوں میں میرے ذہن و شعور کے کسی گوشے میں ادب اور شاعری کے پودے نے جنم لیا تھا، جسے نشوونما کے لئے خون جگر کی ضرورت تھی۔ اس پر مزید تبصرہ میں آگے چل کر کروں گا۔

1947ء میں والدین کراچی، پاکستان منتقل ہوئے تو نہ صرف آبائی وطن اور اس ماحول اور

محفلوں سے محرومی ہوئی۔ حصول تعلیم میں بھی رخنے پڑتے رہے۔ کراچی کے مدرسوں میں بھی شاید میں اسی خلوص و محبت اور اساتذہ سے انفرادی توجہ کے ماحول کو تلاش کرتا رہا، جس کی عادت مجھے جامعہ ملیہ دہلی میں پڑگئی تھی۔ 1947ء میں آٹھویں جماعت چھوڑ کر آیا تھا۔ جوں توں کر کے کافی عرصہ کے بعد میٹرک سے نجات حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو اور فارسی کے مضامین کے ساتھ داخلہ لیا مگر گورنمنٹ کالج کی رنگینیوں کے باوجود حصول تعلیم سے دل اچاٹ رہا اور ایک سال بعد کالج چھوڑ دیا۔ لاہور میں مزید ایک سال ایسے ہی گزارا۔ لاہور کے وہ دو سال مجھے خوب یاد رہیں گے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ لاہور کی بات کچھ اور ہی ہے۔ میرا اشارہ صرف انار کلی کی رنگینیوں، تانگوں میں جتے ہوئے سجیلے اور توانا گھوڑوں، موٹی موٹی ملائیوں والے دودھ اور لسی کے گلاسوں، لکشمی چوک پر چانپ تکے کی دوکانوں، چھپے چوری چھتوں پر ہیر اور رانجھا کی ملاقاتوں یا موسم گرما کی سوندھی سوندھی شاموں کی طرف نہیں ہے۔ میں ادب و سخن کی ان محفلوں کی بھی بات کر رہا ہوں جو لکشمی چوک پر اس وقت کے انڈیا کافی ہاؤس میں سجا کرتی تھیں۔ رائل پارک میں میرے اوپر والے فلیٹ میں چراغ حسن حسرت کی رہائش تھی۔ ان کے صاحب زادے ظہیر جاوید میرے ہم عمر اور گہرے دوست تھے اور ہر شام ہم دونوں انڈیا کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے ہوتے تھے۔ کس کس کا ذکر کروں۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی نامور شاعر، ادیب یا صحافی ایسا ہو جس کا وہاں سے کبھی گزر نہ ہوا۔ جیل میں بند ہونے کی بات الگ ہے۔

جب پڑھائی میں دل نہ لگا تو کچھ عرصہ گنوانے کے بعد کاروبار کی سوجھی اور میں 1955ء میں اپنے بہنوئی کے پاس اس وقت کے مشرقی پاکستان پہنچ گیا جو وہاں کاروبار کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ہی بنگالی پاکستان کے سیاسی حالات سے مایوس اور متنفر ہونے لگے تھے اور وہ سبھی لوگ جو ہندوستان یا مغربی پاکستان سے وہاں منتقل ہو گئے تھے، اس مایوسی اور نفرت کا نشانہ بن رہے تھے۔ یہ صورتحال دیکھ کر میں 1958ء میں کراچی واپس آگیا۔ اس وقت کا ایک واقعہ ہمیشہ میرے دل و دماغ پر نقش رہے گا۔ دہلی دیکھنے کے شوق میں، میں نے سوچا کہ ڈھاکہ سے ریل کے ذریعے دہلی اور لاہور ہوتا ہوا کراچی جاؤں۔ 1947ء کے بعد پہلی مرتبہ دہلی جانے کا موقع ملا تھا۔ اپنے علاقے کی گلیوں اور اپنے آبائی مکان کو دیکھنے کی شدید خواہش تھی۔ دہلی پہنچتے ہی پہلے تو بقول مجاز ان گلیوں میں آوارہ و حشت زدہ پھرتا رہا۔ ہر دیوار اور ہر سایہ اجنبی لگا پھر ہمت کر کے اپنے آبائی مکان کے دروازے پر دستک دی تو ایک معمر خاتون نے دروازہ کھولا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں تو کہنے لگیں کہ وہ لوگ پاکستان سے اپنا آبائی شہر اور احباب چھوڑ کر بے سرو سامان دہلی آئے تھے اور بہت محبت سے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہمارے ایک بہت پرانے خاندانی

ملازم ہوا کرتے تھے، جنہیں سب لوگ بڑے میاں کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ پاکستان نہیں آئے اور تقسیم ہند کے دو تین سال بعد ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ میں انہیں بہت تنگ کرتا تھا اور اکثر ان کے حقے کی چلمیں توڑ دیا کرتا تھا مگر وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور ضعیفی کے باوجود مجھے اپنے کاندھے پر بٹھا کر سودا سلف لینے جایا کرتے تھے۔ جیسے ہی میں ڈیوڑھی میں داخل ہوا پہلے تو بڑے میاں کے کھنکھارنے کی آواز آئی اور پھر وہ کہنے لگے کہ فہیم بیٹا، برسوں بعد خبر لی ہے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟ میری کچھ ایسی کیفیت ہوئی کہ ان خاتون کا شکریہ ادا کر کے وہیں سے لوٹ گیا۔

1958ء میں کراچی واپس پہنچ کر جامعہ ملیہ، کراچی میں انٹرمیڈیٹ سائنس کے لئے داخلہ لیا اور 1964ء میں این ای ڈی انجینئرنگ کالج سے بی ای کی ڈگری حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کے لئے 1968ء میں امریکہ آیا اور یہیں کا ہوگیا۔ پرڈیو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد یونیورسٹی میں پروفیسر اور ساتھ ساتھ ناسا (NASA) کا ریسرچ اسکالر رہا مگر دل اور ذیابطیس کی بیماریوں کی وجہ سے 1989ء میں قبل از وقت ریٹائر ہونا پڑا۔

ویسے تو میں جب تک پاکستان میں رہا حتی الامکان شعر و ادب کی سبھی محفلوں میں جایا کرتا تھا لیکن کبھی کہیں پڑھا نہیں تھا۔ 1958ء سے 1964ء تک کراچی میں طالب علمی کے دوران جب بھی موقع ملا، کالجوں کے مباحثوں میں بحیثیت مقرر اور مشاعروں اور ادبی محفلوں میں بحیثیت شاعر اور ادیب باقاعدہ شرکت رہی لیکن اس زمانے میں میری غزلوں، نظموں، افسانوں اور مضامین کی اشاعت کالج کے رسالوں تک محدود رہی۔ 1952ء سے 1954ء تک۔ البتہ لاہور کے رسالوں "چاند" اور "آداب عرض" میں میرے چند افسانے شائع ہوئے تھے اور کچھ عرصہ تک میں "چاند" میں "پے پر کی" کے عنوان سے ایک مزاحیہ کالم بھی لکھتا رہا۔ پہلی مکمل غزل میں نے 1959ء میں کہی تھی جو اس وقت کالج کے رسالے کے علاوہ 1995ء میں لاس اینجلس، کیلیفورنیا سے شائع ہونے والے جریدے "پاکستان لنک" میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ یہی غزل میں نے غالباً 1994ء میں لاس اینجلس کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی، جس کی نظامت آپ نے کی تھی۔ میری اس پہلی غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔۔۔

نیند آنکھوں سے اڑائی چاند نے
یاد کچھ ایسی جگائی چاند نے

رات کی چادر اٹھائی چاند نے
چاندنی اپنی بچھائی چاند نے

تو نہیں آیا مرے گھر' کیا ہوا
دوستی اپنی نبھائی چاند نے

عشق اور ناداں' عجب سی بات ہے
یہ بلا اس کو لگائی چاند نے

1964ء سے 1989 تک پیشے کی ذمہ داریوں اور پھر 1991 تک شدید علالت کی وجہ سے "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" کی مصداق زندگی اس طرح گزری کہ بے انتہا شوق اور خواہش کے باوجود شعروادب کی طرف بالکل توجہ نہ کر سکا۔ 1991ء سے 1996ء تک کچھ غزلیں کہیں' جن میں سے چند "پاکستان لنک" میں شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ میرے ذہن و شعور کے کسی گوشے میں شاید بچپن ہی میں ادب اور شاعری کے پودے کا جنم ہو چکا تھا' جسے نشو و نما کے لئے خون جگر کی ضرورت تھی۔ 1996ء میں آخر کار اس پودے کی آبیاری اس طرح سے ہوئی۔ اس سال پاکستان کے ایک نامور اور پرانے شاعر امریکہ کے دورے پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ کسی زمانے میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں اور قلم کو پاکستان کے مالک جاگیرداروں اور آمرانہ فوجی طبقے کے ظلم و ستم اور معاشرے کی برائیوں کے خلاف جہاد کا ذریعہ بنایا ہوا تھا۔ مجھے ان سے ملاقات اور تبادلہ ء خیالات کی بہت عرصہ سے تمنا تھی' جب وہ امریکہ آئے تو ایک عزیز دوست کے توسط سے کسی کی رہائش گاہ پر نجی محفل میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ تھوڑی دیر بعد پاکستان کے حالات پر گفتگو چھڑی تو ان شاعر نے اس وقت کی ظالم و قاتل پاکستانی حکومت اور اس کے پشت پناہ جاگیرداروں اور فوجی آمروں کی شان میں قصیدے شروع کر دیئے۔ چند لمحے تو میں سکتے میں رہا کہ ایسا مفکر و مجاہد شخص سرکاری وظیفے کے خاطر حقیقت کی تحریف کر رہا ہے۔ پھر جب شعور نے مجھے سمجھایا کہ انسانی تاریخ میں پہلے بھی ہزاروں مفکر و مجاہد چاندی اور سونے کے چند سکوں کی خاطر خود کو بیچ چکے ہیں' تجھے اتنی حیرت کیوں ہے تو بے اختیار اسی وقت مندرجہ ذیل قطعہ ہو گیا جو میری زندگی کا پہلا قطعہ تھا۔

یہ جھوٹی داستان برتری اچھی نہیں لگتی
مجھے ان رہزنوں کی رہبری اچھی نہیں لگتی
کریں تعریف جو ظلم و ستم اور قتل و غارت کی
اب ایسوں کی زباں سے شاعری اچھی نہیں لگتی

آداب مہمان نوازی کی وجہ سے میں نے یہ قطعہ اس محفل میں نہیں سنایا مگر یہ قطعہ "

پاکستان لنک" میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک اور قطعہ جو حقیقت کا غماز ہے، پیش کر رہا ہوں۔۔

قصیدہ حسن قاتل کا سنانا تھا، سنا کر چل دیئے
ہمارے اس دکھی دل کو جلانا تھا، جلا کر چل دیئے
بہت اک شاعر دانا ہمارے گھر پہ آئے تھے کبھی
کسی ناداں کو بھی شاعر بنانا تھا، بنا کر چل دیئے

جیساکہ میں نے عرض کیا یہ میری زندگی کے پہلے قطعات تھے جو ایک خاص واقعے کے رد عمل کا نتیجہ تھے لیکن یہ قطعات "پاکستان ٹوڈے" کے مدیر جناب تشبیہ سید صاحب اور اس کے قارئین کو اتنے پسند آئے کہ تشبیہ سید صاحب کی ہمت افزائی پر میں نے "پاکستان ٹوڈے" کے لئے ہر ہفتہ پاکستان کے تازہ حالات پر قطعہ لکھنا شروع کر دیا۔ ایک قطعہ اور سن لیجئے۔۔

خادم بنا ہوں جب سے دنیا غلام ہے
فضل خدا سے میرا اعلیٰ مقام ہے
قرآن میں ہے دیکھا اور نہ حدیث میں
پھر یہ کہاں سے آیا رشوت حرام ہے

اردو زبان کے مستقبل سے ہمیں اس وقت تک مایوس نہیں ہونا چاہئے جب تک اس کے پرستار اور شیدائی اس کی حفاظت کر رہے ہیں لیکن ادب دوستی کے پردے میں ادب دشمنی کے جو مظاہرے آجکل مشاعروں میں ہو رہے ہیں، انہیں دیکھ کر کہوں گا۔۔

اڑائی ہے کسی دشمن نے بے پر کی
کہ ہے تحریر ملت کے مقدر کی
بجائے "روز اول گربہ کشتن" ہو
بنے بلی محافظ اب کبوتر کی

نثری نظم میں نے نہیں لکھی لیکن قطعات کے ساتھ 1996ء سے غزلیات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور جب سے ہر دو یا تین ہفتے بعد "پاکستان ٹوڈے" میں میری نئی غزل شائع ہوتی رہتی ہے۔ غزلوں اور قطعات کے علاوہ اسی دوران میں "بیکار سی لڑکی" کے عنوان سے پاکستان ٹوڈے میں ایک افسانہ، "انداز بیان" کے عنوان سے "پاکستان پوسٹ" نیویارک میں ایک مزاحیہ مضمون اور "ملک بچ گیا" کے عنوان سے اردو ٹائمز نیویارک میں ایک سیاسی تبصرہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔"

عکسِ فن

غزل

فرشتوں نے جھکایا سر سمجھ کر آدمی مجھ کو
مگر اس برتری پر آرہی ہے خود ہنسی مجھ کو

بنالوں آئینہ میں بھی نظر جس میں نہ آؤں میں
سکھا دے ناصحا اپنا فن شیشہ گری مجھ کو

تعلق توڑنا ہی تھا تو پھر شکووں کا کیا مقصد
پریشاں کر گیا اس کا پیام آخری مجھ کو

عجب کچھ حال ہے میرا کہ بچتا ہوں میں ساحل سے
رہا طوفاں میں اتنا میں کہ عادت ہوگئی مجھ کو

مقابل خنجر قاتل ہے جسم ناتواں کب سے
بہت حیرت سے تکتی ہے صبح و شب زندگی مجھ کو

اندھیروں کو اجاگر کررہی ہے لو چراغوں کی
نظر اس روشنی میں آرہی ہے تیرگی مجھ کو

صلیبیں ہوں یا زنجیریں یا کوئی زہر کا پیالہ
نہ جانے کس طرف لے جائے میری شاعری مجھ کو

شہنشاہ خرد ہو تم میں اک ناچیز ناداں ہوں
عنایت بس کرو اتنی کہ جینے دو یونہی مجھ کو

اے نازؔ غم یہی جو فرشتہ نہ بن سکا
کیوں اہرمن کے روپ میں انسان ڈھل گیا

Rahmat
8/2/98

Rahmatunnisa Naz
D.T 66, Block-11, F.B. Area
Karachi-75950, Pakistan

رحمت النساء ناز

کراچی

رحمت النساء ناز بہت اچھی اور سینئر شاعرہ ہیں مگر گوشہ نشین کیونکہ انہیں حلقہ بگوشی کے ہنر نہیں آتے۔ کسی زمانے میں ہم طرحی نشستیں کیا کرتے تھے' اس میں محترمہ سعیدہ عروج' عروج بھائی' میمونہ غزل' ڈاکٹر اختر' بدر جعفری' تحسین سروری' فضل گلبرگوی نیاز گل برگوی اور کبھی کبھی مسعود جاوید اور عشرت انجم بھی شریک ہوتے تھے۔ سعید رضا صاحب اور عروج بھائی طرح مصرعہ ڈھونڈتے تھے۔ سعیدہ عروج اور میمونہ غزل کا ترنم بڑا کیف آور ہوتا تھا۔ ایسی محفلیں جمتی تھیں کہ پھر کبھی ان محفلوں جیسا طرب اور سکون نصیب نہ ہوا۔ ایسی ہی ایک نشست میں رحمت النساء ناز نے ترنم سے طرحی غزل سنائی' جس کے اس شعر نے رحمت النساء ناز کا پیارا مکھڑا ہمیشہ میرے سامنے رکھا۔ شعر دیکھئے۔۔۔

کیا مری خطاؤں میں تم نہ تھے کبھی شامل؟
ہوگیا زمانہ کیوں' ایک میرے سر تنہا!

اب کے مدتوں بعد رحمت النساء ناز کو میں نے محترم مسعود جاوید کے توسط سے ڈھونڈ نکالا اور ان سے جو پوچھا ان کی زبانی سنیئے تو لطف دوبالا ہوگا۔

ناز کہتی ہیں۔۔۔۔ "میں 28 جون 1932ء کو بنگلور ضلع کرناٹک سابق ریاست میسور (ہندوستان) میں پیدا ہوئی۔ 16/ اپریل 1945ء کو میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ 12 اپریل کو میری شادی ڈاکٹر محمد غوث شریف سے ہوگئی۔ ایک طرف تو والدہ کو شادی کی جلدی تھی تو دوسری طرف مزید تعلیم دلانے کا شوق بھی تھا' لہٰذا نتیجہ کے بعد میں نے مہارانی کالج

بنگلور میں داخلہ لے لیا۔ اچانک والدہ اور ایک بھائی کا تین دن میں انتقال ہوگیا۔ میں اپنے سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور والدین کی چہیتی۔ مجھ سے یہ غم برداشت نہ ہوا۔ تعلیم کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ ادھر پاکستان وجود میں آچکا تھا۔ میرے شوہر کو پاکستان آنے کی شدید خواہش تھی۔ میں نے ان کا ساتھ دیا۔ ایک چھوٹا بھائی میرے ساتھ آگیا۔ میں سمجھتی تھی کہ پاکستان آکر میں غم بھول جاؤں گی مگر یہاں آکر یہ احساس ہوا کہ میں کیسی کیسی جنتیں چھوڑ کر آئی ہوں۔ ایک ماں کے سوا سب کچھ تو وہیں رہ گیا۔ باپ معصوم بھائی اور دیگر عزیز و اقارب۔ یکم جنوری 48ء کو میں کراچی پہنچی تھی۔ وقت نے مرہم رکھا۔ میری ایک بیٹی کے بعد کچھ غم ہلکا ہوا تو میں نے اپنے آپ کو سمیٹنے کے لئے اسلامیہ کالج میں داخلہ لے کر سندھ یونیورسٹی سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ اے فائنل میں تھی کہ اچانک میرا بھائی نہر خلیلی میں ڈوب گیا۔ لاش بھی نہیں ملی۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی مچھیرے کی بستی میں ہوگا۔ میں ایک بار پھر ٹوٹ گئی۔ تعلیم کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ میں نے ملازمت کو سہارا بنایا تو اندازہ ہوا کہ ادھوری تعلیم بیکار ہے۔ کالج چھوڑے 8 سال ہوگئے تھے۔ بس سی آئی ٹی کرکے ایک ٹرینڈ ٹیچر کی حیثیت سے مصروف رہی۔ یکایک خیال آیا کہ کیوں نہ کنٹرولر کراچی یونیورسٹی سے ملا جائے۔ میں نے خصوصی اجازت لے کر 9 سال بعد بی۔ اے پاس کر ہی لیا۔ پھر میں نے ایم اے کیا اور دوسرے ہی سال بی ایڈ کرلیا۔ شہر کے مشہور و معروف اسکول میں صدر معلمہ کے فرائض انجام دیتی رہی۔ 20 سال پرائیویٹ ملازمت کرنے کے بعد مزید 20 نیشنلائزڈ اسکول میں گزیٹڈ افسر کی حیثیت سے 1992ء میں ریٹائر ہوئی۔ 78ء میں میرے شوہر کا انتقال ہوچکا تھا۔ 79ء میں چند ناگزیر حالات کی بنا پر میرا اکلوتا بیٹا ملک سے باہر چلا گیا جو 10 سال مجھ سے جدا رہا۔ 10 سال بعد آیا۔ ساڑھے تین سال رہ کر پھر ہالینڈ چلا گیا۔ اب پھر 3 سال سے جدائی کے دن برداشت کررہی ہوں۔ تین بیٹیاں اپنے اپنے گھر کی ہیں۔

جس محلہ میں رہتی ہوں بڑے بھولے اور سیدھے سادے لوگ ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کام جس میں تعلیم کی ضرورت ہے، مجھ سے مدد لیتے ہیں۔ دو سال کی تگ و دو کے بعد میں نے خدمت خلق کی بنیاد پر مرد و عورتوں کی مدد سے ایک ایک پل تعمیر کروایا جو دو محلوں کو ملاتا ہے۔ لوگ میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ میں کبھی کبھی کچھ لکھ لیتی ہوں۔ ہم جیسے گمنام لوگوں میں لکھنے کی تحریک بھی کم ہوتی ہے نہ وہ پہلے جیسی محفلیں نہ تحریک۔ وقت کا پہیہ گھوم رہا ہے۔ ہم ہیں اور ہماری تنہائی۔

شاعری کے علاوہ ادب کی کسی اور صنف سے وابستگی نہیں۔ جوں جوں شعور بیدار ہوتا رہا، مطالعہ وسیع ہوتا رہا۔ وقت اور مواقع کے ساتھ تعلیم کے دوران حالی، اقبال، غالب، حسرت، جگر اور جوش وغیرہ کو پڑھنے کا موقع ملا۔ دور حاضر کئی شعراء کو بھی پڑھا۔ میرا کلام

جنگ کراچی' سب رس اور مجلہ جامعہ عثمانیہ میں چھپتا رہا۔ ہم جیسی گمنام شاعرہ کو کراچی والے کب موقع دیتے ہیں۔ مجھے یہاں اپنا کلام شائع کروانے کی خواہش بھی نہیں ہوتی ہیں جو کچھ لکھتی ہوں پابندی سے بنگلور (ہندوستان) بھیج دیتی ہوں اور زمیندار' پاسبان اور گیسوئے تابدار (سہ ماہی رسالہ) میں کلام چھپتا رہا۔ اب مشہور اخبار "سالار" میں تمام عزیز و اقارب میرا کلام شوق سے پڑھتے ہیں۔ مجموعہ کلام کی طرف توجہ اس لئے نہیں ہوئی کہ حالات کی اذیت سے تاحال چھٹکارا نہیں ہوسکا۔ امید ہے میرے بعد یا کسی وقت میرا بیٹا یہ کام کرلے۔ اس کی بڑی خواہش ہے یا ہو سکتا ہے میرا چھوٹا بھائی ضیاء کرناٹکی یہ ذمہ داری قبول کرلے۔ وہ میرا کلام جمع کررہا ہے۔ وہ ایک مشہور شاعر اور ایوارڈ یافتہ افسانہ نگار ہے۔

میری زندگی کا اہم اور دلخراش واقعہ یہ ہے کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر میں نے اپنا آدھے سے زیادہ کلام ضائع کردیا۔ اردو دنیا کی چوتھی زبان ہے۔ میں اس کے مستقبل سے پرامید ہوں۔ یہ صرف برصغیر کی ہی زبان نہیں بلکہ دنیا کے کئی ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دیار غیر میں رہ کر بھی ہمارے ادیب' شاعر اور صحافی ترقی اردو سے غافل نہیں۔ غیر ممالک میں بھی کئی انجمنیں قائم ہوئی ہیں۔ مذاکرات' مشاعرے اور رہنما ہوتے ہیں۔ زندہ اور تازہ مثال خود محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ ہیں جو دیار غیر میں رہ کر بھی ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ امریکہ' کینیڈا اور عرب امارات میں اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد ہے' جو اپنی زبان کی اور اپنے کلچر کی آبیاری کے لئے بڑی محنت کرتے ہیں' جہاں تک انڈیا کا تعلق ہے' میں خود وہاں دیکھ کر آئی ہوں خاص کر کاناٹک اور آندھرا پردیش قابل ذکر ہیں۔ کرناٹک میں دیگر مقامی زبانوں میں مڈل تک تعلیم دی جاتی ہے۔ وہاں تنقیدی' شعری اور افسانوی نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ کئی انجمنیں قائم ہیں۔ ہندو شعراء کی تعداد بھی خاصی ہے۔ میرے اپنے بھائی ضیا کرناٹکی نے اپنی زندگی ادب کی خدمت کے لئے وقف کردی۔ میری موجودگی میں انتظار حسین تشریف لائے تھے' جنہیں یاترا ایوارڈ دیا گیا۔ بڑی عزت دی گئی۔ پاکستان سے جو بھی جاتا ہے' اس کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ اکثر ان کا کلام بھی چھپتا رہتا ہے۔

ایک نشست میں یہ طے پایا کہ جس طرح تمام سائن بورڈ مقامی زبانوں میں یا انگریزی میں ہوتے ہیں۔ اب اردو میں بھی ہونے چاہئے۔ وہاں ہر ریاست میں اکیڈمی قائم ہے اور گرانٹ بھی ملتی ہے۔

میں نے شاعری میں اظہار خیال کے لئے غزل کو ہی بہتر سمجھا ہے۔ ویسے کچھ نعتیں اور نظمیں بھی میں نے لکھی ہیں۔ نثری نظم کے بارے میں میرا خیال ہے ہر شخص کو اپنی اپنی طبیعت کے مطابق آزادی ہونی چاہئے۔ بعض اچھی نثری نظمیں میری نظر سے گزری ہیں مگر میرے خیال میں شاعری کے لئے ایک خاص آہنگ ہونا ضروری ہے۔

دور حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے۔ یہ بات کسی حد تک تو درست کہی جاسکتی مگر مکمل طور پر نہیں۔ ادیب ہو یا شاعر وہ بھی اسی دنیا میں اور اسی ماحول میں رہتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی نگاہیں، ان حساس معاملات پر پڑتی ہیں، جن پر عام لوگوں کی نظریں نہیں پڑتیں۔ اسی طرح قاری کا رشتہ ادب سے کبھی نہیں ٹوٹتا۔ اس مشینی دور میں انسان مصروف ضرور ہوا ہے۔ ذرائع ابلاغ نے کتابوں سے دور کیا ہے مگر وہ بھی ادب کی محتاج ہیں۔

عکس فن

غزل

بے سبب اپنے جی کو جلاتا ہے کون
رات بھر یونہی آنسو بہاتا ہے کون

خوں بہا کی ضرورت نہیں ہے ہمیں
اپنے پیاروں کی قیمت لگاتا ہے کون

راز اس میں پنہاں تو ہوگا کوئی
اپنے گھر اپنے ہاتھوں جلاتا ہے کون

چپکے چپکے بناتے ہیں باتیں سبھی
سر کھلا ہو تو چادر اڑھاتا ہے کون

سامنا حق کا کرنے کی جرات نہیں
ورنہ اس طرح آنکھیں چراتا ہے کون

عمر گزری ہے سب کو مناتے ہوئے
نازؔ روٹھے تو دیکھو مناتا ہے کون

کوئی اندھا کوئی بہرہ کوئی گونگا ناچیز
صنم اس خانۂ دل سے میرے کیا کیا نکلے

ناہید ورک
11-20-97

Naheed Virk
47791 Walden
Macomb Township, MI 48044
U.S.A

ناہید ورک
مشی گن

بیٹیوں کو اعلیٰ عہدے پر فائز اور سکھی دیکھنے کی تمنا سبھی ماں باپ کی آنکھوں میں ستاروں کی مانند چمکتی اور جگمگاتی ہے۔ یہی خواب ناہید کے ابو نے بھی اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے دیکھے تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ عورت کو زندگی کے ہر میدان میں اپنی حیثیت منوانا چاہئے اور ہر محاذ پر بہادری سے جہاد کرنا چاہئے۔ اسے کردار کی ان بلندیوں کو چھونا چاہئے کہ ناساز گار حالات کی لہریں اس کے قدموں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو کر لوٹ جائیں۔ وہ ناہید کی زندگی کو ایک مثالی زندگی بنانا چاہتے تھے چنانچہ ناہید کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ارفع تربیت بھی دی گئی مگر ابا کو موت کے پنجوں نے آدبوچا۔ انہیں اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ اپنے خواب کو شرمندء تعبیر دیکھ سکتے۔ جس دن ناہید کو بی ایس سی کی ڈگری ملنا تھی' ابا کی طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ پھر سنبھل نہ سکی اور وہ 7 جون 1995ء کو ناہید کو تنہا چھوڑ گئے اور ناہید اس عالم میں تھی کہ۔

دل تھا کہ دھڑکنا بھول گیا
آنکھیں تھیں کہ برسنا بھول گئیں

پھر ناہید نے خود کو سنبھالا۔ اسے معلوم تھا کہ اپر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے اس کے ابو پاکستان کے روایتی ماحول کو خیرباد کہہ کر جب امریکہ کے آزادانہ ماحول میں آن بسے تو انہوں نے بیٹی کو وہ اعتماد بھی بخشا کہ جس کے سہارے ناہید نے طوفانوں کے رخ موڑ دیئے۔ مشی گن کی وینے اسٹیٹ یونیورسٹی سے بی ایس سی اور پھر ایم بی اے بھی کیا۔ ناہید اب پروگرام منگ میں انجینئر اور ڈیولپر ہیں اور ایک مقامی فرم سے وابستہ ہیں۔

5/اکتوبر کو فیصل آباد میں جنم لینے والی ناہید کوثر ورک نے اپنے نام کے ایک حصے کو تخلص بنالیا اور کچے پکے شعر کہتے کہتے اپنا مطالعہ اتنا بڑھالیا کہ اب ایک کتاب جتنا کلام غزل، نظم اور گیت کی صورت اکٹھا ہوگیا ہے۔ شاعری کے علاوہ ناہید مضامین بھی لکھتی ہیں مگر اشاعت کے لئے دینے کی نوبت نہیں آئی۔

میں نے پوچھا آپ اظہار کے لئے شاعری کی کس صنف کو پسند کرتی ہیں؟ ناہید نے کچھ سوچا.... تھوڑا سا مسکرائیں، پھر بولیں۔ ایک بار کچھ پڑھتے ہوئے ایک عبارت نظر سے گزری، جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ نظم پانچ روزہ ٹیسٹ میچ ہے اور غزل ون ڈے فائنل میچ، جس میں کھلاڑی کی اچھی کارکردگی اسے ون ڈے میچ کے لئے اہل قرار دیتی ہے چنانچہ ایک شاعر کی شعری صلاحیت کا پتہ بھی اس کی نظم سے ملتا ہے اگر نظم اچھی ہے تو شاعر غزل بھی اچھی تخلیق کرسکتا ہے۔ ویسے میں ذاتی طور پر غزل اور نظم دونوں کے حسن سے متاثر ہوں۔ غزل میں جہاں ماضی کو پکارنے کی دردناک صدائیں آتی ہیں، وہیں نظم میں جدید دور کا اضطراب بھی ملتا ہے۔ غزل کا جھکاؤ روایت کی طرف ہے تو نظم روایتی بندھنوں سے آزاد۔ غزل میں دریا کو کوزے میں بند کردیا جاتا ہے تو نظم میں دریا کو بہنے کے لئے خیالات کی فراوانی مہیا کی جاتی ہے۔ نظم کے بارے میں جو اعتراض سننے میں آیا ہے، وہ صرف اتنا کہ ایسی شاعری موسیقی میں ڈھل نہیں سکتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اچھی شاعری اور پر اثر سوچ کو کسی صنف کا محتاج نہیں ہونا چاہئے۔"

ناہید کہتی ہیں.... قاری اور لکھاری کی سوچ میں فرق ہمیشہ رہا ہے اور اگر عصر حاضر میں ادب کا تعلق قاری سے کٹ گیا ہے تو جس طرح بدلتے حالات انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، وہیں ادب بھی اس کی لپیٹ میں آتا ہے۔ اگر عصر حاضر کو شام کے منظر سے تشبیہ دی جائے اور شام کے وقت اگر سمندر کے وسیع وجود پر نظر ڈالی جائے تو لہریں تھکی تھکی، نڈھال محسوس ہوتی ہیں مگر شام کے سینے میں کہیں صبح کا سورج بھی ہے، جو کچھ ہی دیر بعد نکل پڑتا ہے اور نڈھال لہریں تازہ دم ہوجاتی ہیں، اسی طرح عصر حاضر پر بھی شام کا وقت ہے مگر صبح کا سورج جلد طلوع ہوگا اگرچہ یہ دور میر اور غالب کا دور نہیں ہے۔ اقبال اور فیض بھی نہیں ہیں مگر وقت دوبارہ میر، غالب اور اقبال پیدا کرے گا اور ضرور کرے گا۔ بس تھوڑا دل جمی سے انتظار چاہئے کہ آج کی نسل میں عقل و شعور کی کوئی کمی نہیں ہے۔ رہی ادب کے بے اثر ہونے کی بات تو ادب بے اثر کبھی نہیں ہوسکتا، بس اس کو سمجھنے کے لئے صحیح دماغ چاہئے۔ ایک روشن پڑھا لکھا دماغ، وگرنہ کسی جاہل کو رباعی سنائی جائے اور اس سے تعریف کی توقع بھی رکھی جائے تو پھر واقعی ادب بے اثر ہوکے رہ جائے گا۔"

اردو زبان کے مستقبل کے سوال پر ناہید نے بڑے عزم سے کہا کہ "اردو کی بقا کے لئے

شروع سے لے کر اب تک کام ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا، جس طرح نسل کو آگے بڑھانے کے لئے ایک بھی وارث دل کو ڈھارس دیتا ہے اسی طرح اردو کے مستقبل کے لئے اگر تھوڑا بہت بھی کام ہو رہا ہے تو اردو کا مستقبل روشن ہے اور میرے خیال میں اردو کی سلامتی کا انحصار صرف شاعروں اور ادیبوں پر ہی نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہر اس اہلِ خانہ پر بھی ہونا چاہئے جو اردو زبان سے بہرہ ور ہے تاکہ اپنی نئی نسل میں وہ اردو منتقل کر سکے۔"

آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے بولیں۔ "دراصل شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے علمی سفر میں مطالعہ ایک اہم کڑی ہے۔ مطالعے سے مشاہدے کو جلا ملتی ہے اور مشاہدہ جتنا وسیع ہوگا، شاعری میں اس کا اثر اتنا ہی گہرا نظر آئے گا۔ مغربی ادب کا مطالعہ الگ بات ہے اور اپنے کلام کو مغربی ادب کے رنگ میں رنگنا الگ بات، مطالعہ کرنا چاہئے ضرور کرنا چاہئے کہ اس سے ذہن کے سوئے تار جاگ اٹھتے ہیں اور کسی چیز کے اثرات اگر مثبت پہلو لئے ہوں تو فائدہ شرطیہ ہے۔ آزادی سے بعد کی شاعری پر اگر نظر دوڑائی جائے تو پرانی غزل اور نئی غزل میں ایک فرق صاف نظر آئے گا اور وہ ہے غزل گوئی میں استعاروں کی زبان جو جدید شاعری کا حصہ بن چکی ہے اگر تو یہ رجحان مغربی ادب کے مطالعے سے پیدا ہوا ہے تو اس کے اثرات مثبت پہلو لئے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی شاعر ماضی کی مری ہوئی زندہ تصویروں کو حال کے شفاف آئینے کو، مستقبل کے پرکیف خوابوں کو احساس و شعور کے بغیر غزل میں کیسے منتقل کر سکتا ہے؟ لکھنے کے لئے جس مشاہدے، تجربے اور مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اگر شاعر کے پاس نہیں تو وہ پھر درباری شاعر تو ہو سکتا ہے۔ ایک تخلیقی شاعر نہیں اور اس وقت مغرب سے درآمد شدہ ادب بھی مددگار ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔"

عکس فن

"معصوم محبت"

خوشبوؤں کا سفر کرنے والی
گلاب پتیوں سا کومل وجود لئے
کانٹوں کی آغوش سے اپنا آغاز کرتی
سجل سپنوں کی دہلیز پر
انجانا سا دکھ لئے
ان دیکھے دیاروں کا انتظار کرتی
گلابوں کو پوجنے والی جانتی ہے
کانٹوں کی چبھن زخم دیتی ہے
لیکن ہوائے غم کو گلے لگائے
وفاؤں کے موتی اپنی پلکوں سے چنتی ہے
وفاؤں کا زعم اتنا بھاری ہے
کہ جذبے کو بے پایاں نہیں ہونے دیتی
آنکھیں برستی بھی ہیں
تو نمی دل میں چھپائے رکھتی ہے
اک کم سن احساس اسے سمجھاتا بھی ہے
راہوں کی مشکلیں اسے دکھاتا بھی ہے
کہ فاصلوں کا بوجھ اکیلے کب سہا گیا؟
شب کی پہنائی اسے اپنے آپ میں سمیٹتی بھی ہے
مگر وہ خود سے کہتی ہے
"رات کی بانہوں، خود سپردگی سے کیا حاصل
ارمانوں کے شہر صحرا میں بھٹکنے سے کیا حاصل؟"
گمنام جزیروں کے بلند چبوتروں پر
اس کے ہونٹ وا تو ہوتے ہیں
لیکن وہ شکوہ پھر بھی اس سے نہیں کرتی
وہ جو کہتا ہے "میں ہر جگہ موجود ہوں"
کیونکہ وہ جانتی ہے
اس کی ہر سوچ پر اسے دسترس ہے
وہ اسے پکارتی ہے تو اس لئے
کہ سجدوں کی روایت بکھر نہ جائے
اس کی عبادت گاہ کے مینار ڈھے نہ جائیں
محبتوں کو پوجنے والی
کچھ مانگتی ہے تو صرف
اپنی معصوم محبت کی سچائی

رقص کرتی ہوئی زندگی
جس میں رقاص نظر نہیں آتا
مجھے ایک ایسی ہی لذت بھری زندگی سے گلے ملنا ہے
تاکہ میری موت بھی خوبصورت ہو۔

اصغر ندیم سید

Asgher Nadeem Syed
F/122, Block-N
Model Town
Lahore-54700, Pakistan

اصغر ندیم سید

لاہور

اصغر ندیم سید غزل نہیں کہتے۔ نظم کہتے ہیں اور تخلص استعمال نہیں کرتے اس لئے پورا نام اصغر ندیم سید ہی لکھتے ہیں۔

ان سے میری ملاقات لاہور میں میرے اپنے ماہنامہ "روپ" کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ میں نے ان کا انٹرویو کیا تھا بحیثیت ٹی وی ڈرامہ نگار کے۔ ویسے تو یہ ٹی وی پر ڈرامے لکھنے کا سلسلہ 1980ء سے شروع کر چکے تھے لیکن 1984ء تک خود کو منوا چکے تھے اور مشہور ڈرامہ نویسوں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔

14 مئی 1949ء کو ملتان شہر میں اپنے نانا غلام رضا شاہ کے گھر جنم لیا۔ یہ گھر محلہ بٹی شیر خان ملتان میں اب بھی موجود ہے۔ ان کے والد غلام اکبر شاہ سبزواری نے اپنی ملازمت کا آغاز ملتان سے کیا۔ ان کا تعلق خان پور کے نواحی گاؤں سے ہے۔ اب بھی اصغر کی دادی وہاں قیام پذیر ہیں۔ (خان پور ضلع رحیم یار خان میں ہے) ان کے والد صاحب کا شعبہ کاشتکاری ہے لیکن انہوں نے خود کبھی کاشت میں حصہ نہیں لیا۔ وہ زرعی جائیداد کی نگرانی کے ماہر ہیں۔ اصغر ندیم سید نے تعلیم ملتان میں حاصل کی اور پھر گورنمنٹ کالج ملتان سے ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ لیکچرار مقرر ہوئے اور پاکستان کے مختلف شہروں میں فرائض انجام دینے کے بعد گذشتہ دس بارہ سالوں سے گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا رہے ہیں۔ اس وقت ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ اصغر گھر میں سب سے بڑے تھے۔ یہ پانچ بہن بھائی ہیں۔ ان کی شادی فرزانہ سے 1978ء میں ہوئی۔ بڑے صاحبزادے پری انجینئرنگ میں سال دوم کے طالب علم ہیں۔ دو بیٹیاں اسکول میں ہیں۔

اصغر ندیم سید ٹی وی کے لئے اب تک چودہ پندرہ سیریل لکھ چکے ہیں۔ ان کے لکھے سیکڑوں کھیل ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں۔ مشہور سیریل چاند گرہن' پیاس' خواہش' آوازیں' ہوائیں' نجات' الاؤ' میگھ ملہار' سمندر رہے درمیاں وغیرہ ہیں۔

اصغر ندیم سید بتاتے ہیں' انہیں شاعری کے علاوہ تنقید' ناولٹ اور ڈرامہ نگاری سے بھی دلچسپی ہے۔ شاعری میں آزاد نظم اور نثری نظم لکھی ہے۔ اس حوالے سے جدید اور نئی شاعری کے مزاج سے متاثر ہونے کی وجہ سے شاعری کے بین الاقوامی مزاج سے وابستہ ہیں۔ ان کی شاعری فنون' اوراق' پاکستانی ادب' سیپ وغیرہ کے علاوہ بے شمار دوسرے رسائل میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ ان کا مجموعہ کلام "جنگل کے اس پار جنگل" شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ زیر اشاعت ہے۔ تنقید کا مجموعہ "طرز احساس" شائع ہوا ہے۔ ناولٹ "آدھے چاند کی رات" اور اس کے علاوہ ڈراموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

میں نے پوچھا آپ کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ جس نے زندگی کو ایک نیا موڑ دیا ہو؟ نہیں کر بولے....."میری زندگی میں انشاء اللہ ابھی کئی دلچسپ واقعات آنے ہیں۔ ابھی تک زندگی ایک سفر کی طرح جاری ہے۔ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے۔ میں نے دنیا کے بے شمار ملکوں کا سفر کیا ہے اور بے شمار دوست بنائے ہیں۔ میرے لئے زندگی خود بہت دلچسپ رہی ہے۔ زندگی کے ہر واقعہ کو میں بہت اہمیت دیتا ہوں۔ ایک معمولی گھر سے سفر کر کے ہر طرح کے مشکل موڑ دیکھ کر ابھی تک عملی زندگی کے تجربوں سے لطف اٹھا رہا ہوں۔"

اصغر ندیم اردو کے مستقبل سے پر امید نہیں ہیں۔ اس سوال سے پژمردہ ہو کر بولے.... "اردو غالباً" دنیا کی چوتھی زبان نہیں ہے کیونکہ بھارت میں اردو اسکرپٹ ختم ہو چکا ہے اور افسوس کی بات ہے کہ اب صرف پاکستان اردو کا گھر ہے۔ اردو کا مستقبل صرف پاکستانیوں سے وابستہ ہے۔ اردو کی کتاب اب بھارت میں پڑھی نہیں جا سکتی۔"

اگلے سوال کے جواب میں اصغر ندیم کہتے ہیں۔ "شاعری شاعری ہونی چاہئے' کسی صنف میں ہو۔ میں آزاد نظم کو اپنے خیال اور مزاج کے بہت قریب پاتا ہوں۔ نثری نظم اگر اپنے اندر اپنا جواز پیدا کر لیتی ہے تو مجھے قبول ہے۔ شرط یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ شاعری ہونی چاہئے۔ شاعری میں خیال اور امیج کے ساتھ احساس اور وژن بھی ہوتا ہے۔ اس کا تناسب شاعر اپنے تخلیقی جوہر سے کراتا ہے۔ مشاعروں کے سلسلے میں میرا خیال ہے کہ آج مشاعرے کا مفہوم ختم ہو چکا ہے' یہ صرف چند شاعروں کی مالی مدد کے لئے ہوتے ہیں۔"

ادب سے قاری کا رشتہ کمزور ہونے کا جواز دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "آج ہمارے ملک میں ادب پڑھنے والے اس لئے کم ہیں کہ ہم نے علم و فن کی روایت کو آگے نہیں بڑھایا۔ ہمارا تعلیمی اور معاشرتی ڈھانچہ بے حد ناقص بنیادوں پر قائم ہے۔ ادب اب ایک

با معنی تجربہ نہیں بن رہا۔ میڈیا نے بھی کسی حد تک قاری کو کتاب سے دور کرنے میں کردار ادا کیا ہے۔"

آخری سوال کے جواب میں اصغر ندیم سید کہہ رہے تھے کہ "اس وقت دنیا سمٹ گئی ہے۔ ہم جزیرے میں نہیں رہ رہے۔ ہمیں اپنا ادب دنیا کے دھارے میں شامل کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم کہیں کے نہیں رہیں گے' اس لئے آج کا ادب گلوبل زندگی کا تجربہ ہونا چاہئے۔ ہمیں اپنے آپ کو منوانے کے لئے اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھنا چاہئے۔ دنیا میں اپنا ثبوت دینے کے لئے ہمیں عالمی ادب کے اثرات قبول کرنے چاہئیں۔"

عکس فن

نظم

جیسی زندگی ہم گزارتے ہیں
ویسی موت ہمیں ملتی ہے
ہم بزدل زندگی گزارتے ہیں
تو ہماری موت بھی ویسی ہی بزدل ہوتی ہے
ہم محبت کی زندگی گزارتے ہیں
تو موت بھی محبوبہ کی طرح ملتی ہے
ہم خوبصورت زندگی جیتے ہیں
تو موت بھی خوبصورت ملتی ہے
انسان نے ہر شے کو گدلا کیا ہے
ہر قیمتی آرائش کو میلا کیا ہے
ہر لفظ کو بے معنی کیا ہے
اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے
حتی کہ سچ کو بھی اور سورج کی روشنی کو بھی
لیکن انسان موت کو گدلا نہیں کر سکا
بے معنی نہیں کر سکا
مسخ نہیں کر سکا
موت سے زیادہ خالص شے دنیا میں نہیں ہے
اس سے زیادہ با معنی شے موجود نہیں ہے
مگر میں کیوں ایسا کہہ رہا ہوں
مجھے تو ایک بہت ہی خوبصورت زندگی بسر کرنی ہے
رقص کرتی ہوئی زندگی
جس میں رقاص نظر نہیں آتا
مجھے ایک بے حد لذت بھری زندگی سے گلے ملنا ہے
تاکہ میری موت بھی خوبصورت ہو!

زندگی

روشن آرا نزہت

کتنے سورج دیکھے
ہو گئی کالی رنگت
کہتے ہیں کہ روشنی ہے زندگی!

Roushan Ara Nuzhat
B.O.F-53, G.O.R III
Shadman Colony
Lahore, Pakistan

روشن آرا نزہت

لاہور

"میرا نام تھا روشن۔" انہوں نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا تو مجھے قتیل شفائی کا کہا شعر یاد آگیا۔

اک لڑکی بھولی بھالی' اس کا مردوں جیسا نام

میں زیر لب مسکرائی تو وہ اس کا مفہوم سمجھ کر بولیں۔

"ہاں یہ اس وقت کی بات ہے۔ جب میں "روشن" کے ساتھ آرا نہیں لگاتی تھی۔ ایک مضمون لکھا تھا۔ میرے استاد ڈاکٹر مہدی حسن نے فرمایا جا کر خود چھپنے دے آؤ' لہٰذا میں ایک مقامی پرچے کے دفتر چلی گئی اور ایک چٹ پر صرف "روشن" لکھ کر ایڈیٹر کو اندر بھجوا دی۔ وہ گھنٹے تک انتظار کرتی رہی۔ چپراسی کو یاد دہانی کرائی اور جب اندر بلایا گیا تو ایڈیٹر صاحب کرسی سے اٹھ کر بے ساختہ بولے۔ اچھا تو یہ آپ ہیں۔ یعنی لڑکی ہیں...... !میں نے برجستہ کہا۔ تو آپ مجھے لڑکا سمجھ کر سزا دے رہے تھے۔ تب وہ بہت شرمندہ ہوئے۔ پھر میں نے اپنے نام کے ساتھ آرا لگانا شروع کیا۔ لکھنا شروع کیا تو نزہت کا اضافہ کیا۔ یوں میں روشن آرا نزہت کہلائی۔"

1950ء میں دہلی سے 35 میل دور پٹودی میں پیدا ہوئی۔ بی۔اے تک تعلیم ہندوستان میں حاصل کی۔ ہندی مضامین کے علاوہ اردو ادیب' ادیب عالم اور ادیب فاضل پاس کئے۔ میرے والد محترم کی خواہش تھی کہ اردو ادب کو بھی تعلیم میں شامل ہونا چاہئے۔ 1971ء میں ہندوستان سے ہجرت کی اور پاکستان آئی۔ پہلے پہل اجنبی پن کا احساس کاٹتا رہا مگر ساتھ یہ بات

بھی دل کو لگی تھی کہ یہی سرزمین اپنی آماجگاہ ہے۔ لاہور آکر شعبہ ء صحافت میں داخلہ لیا اور ایم اے صحافت ور ایم اے اردو کی ڈگریاں حاصل کیں۔

ملازمت کا آغاز 74ء میں کیا' جو تاحال جاری ہے۔ ڈپٹی ڈائریکٹر (پریس) سول سیکریٹریٹ پنجاب میں فرائض انجام دے رہی ہوں۔ لکھنے کا جب آغاز ہوا تو نثر ہی میں لکھا۔ افسانے اور ناول وغیرہ لکھتی تھی۔ نوعمری کے زمانے سے لکھنے کی ابتدا ہندوستان میں ہو چکی تھی۔ میں کسی مکتب فکر سے متاثر نہیں۔ ہاں پہلے پہل تو قدرتی مناظر ہی متاثر کرنے کا باعث ہے۔ موروں کا ناچ' لہلہاتے سبزہ زار' ندی کی روش' سورج کا ڈوبنا اور طلوع ہونا ہی میرے لئے بہت کچھ مہیا کرتے تھے۔ میں قدرت کی گود میں رہ کر لکھتی رہی ہوں۔ ہاں ساحر لدھیانوی نے مجھے بہت پہلے ہی متاثر کر دیا تھا اور پھر "ملاپ" دہلی کے چیف ایڈیٹر رنبیر سنگھ سے میں نے دور بیٹھے ہی تحریروں کے ذریعہ بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے بھی میری تحریروں کو چھاپنے میں بہت مدد کی۔ اس لئے میں نے نظمیں لکھنا شروع کیں جو وطن کی محبت میں سرشار ہو کر لکھی گئیں' وہ بھی چھپتی رہیں اور بہت سے لوگ سراہتے رہے۔ ملاپ' گرج امروز' اوراق' چمن' تخلیق' ادب لطیف' شاہین اور دیگر پرچوں میں افسانے اور نظمیں وغیرہ چھپتی رہیں۔

میری نظموں کا مجموعہ زیر طبع ہے۔ ایک ناول "بوند بوند زہر" زیر طبع ہے۔ دو ناول چھپ چکے ہیں۔ روشنی کے پاؤں اور راجی کہانیوں کا بھی ایک مجموعہ "ایک چہرہ میرا بھی" شائع ہوا ہے۔"

اردو کے مستقبل کے متعلق ان کا کہنا ہے..... "یقیناً" اردو کا مستقبل روشن ہے روشن رہا ہے اور رہے گا کیونکہ اس میں کشش ہے۔ اظہار کی قوت ہے۔ لشکری زبان ہونے کی وجہ سے یہ بولی بھی جاتی ہے اور سمجھی بھی جاتی ہے۔ ابلاغ کے لئے اس کی بہت ضرورت اور اہمیت ہے۔ عوام الناس کی زبان ہے' جہاں کوئی اور زبان نہیں پہنچ پاتی' وہاں اردو کی پہنچ ہے۔"

مشاعروں کے سلسلے میں فرماتی ہیں۔"مشاعرے ادب کی تخلیق میں جس طرح کردار ادا کرتے ہیں' اسی طرح تخلیقی نشستیں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ دونوں کا رول دراصل ایک ہی ہے۔ اظہار خیال کے لئے کوئی قید نہیں ہونی چاہئے اور یہ کہنا کہ ادب سے قاری کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے تو میرے خیال میں ادب سے زندگی کا اور زندگی کا عمل سے تعلق ہے۔ اگر یہ تعلق' جاندار ہے تو قاری سے اس کا رشتہ کمزور نہیں ہو سکتا۔"

آخری سوال کے جواب میں نزہت کہتی ہیں۔ "ادب ایک زندہ جاوید سلسلہ ہے۔ جو دور تک منسلک ہے۔ ہم یہاں کے ہیں' یہاں ہمارا ہے اور جب ہم لکھتے ہیں تو ظاہر ہے' اسی احساس کو لے کر جس کی کوکھ سے ہم نے جنم لیا ہے۔ جنم لینے والے سے وہی مسائل

حسیت اور احساس و شعور وابستہ ہوتے ہیں' جو اس کے اپنے ہوں۔ دوسروں کی پیروی کرنا جرم نہیں ہے لیکن زیادہ پیروی کرنا خود فریبی ہے۔ میری رائے میں اس کے پیچھے زیادہ دور اور دیر تک چلا نہیں جاسکتا۔ واپسی تو بہت ضروری ہوتی ہے اور اگر ہم اپنی سرزمین سے پیار کرتے ہیں تو ان رجحانات کو اپنا ہی نہیں سکتے جو ہمارے نہیں ہیں۔"

عکس فن

"تمہارے لئے"

اک دیا
شام میں نہ رات میں
دوپہر میں
میری قبر کے سرہانے جلا دیا کرنا
جب میری باتیں' میری کہانیاں
یاد آئیں کبھی
تو مری مٹی سے ہاتھ دھو لیا کرنا
ہاں! جب کبھی' کہیں' کوئی
اپنے آپ
پھول گرے
تو تم اسے
میری قبر پر چڑھا دیا کرنا

زندگی

کتنے سورج دیکھے
ہو گئی کالی رنگت
کہتے ہیں کہ روشنی ہے زندگی!

اپنی دیوار گرائی بھی تو رستہ نہ کھلا
کوئی دیوار کھڑی تھی مری دیوار کے پاس

نقاش کاظمی

۳۱ر دسمبر ۹۷ء

Naqqash Kazmi
A-405, Block-3, Gulshan -e- Iqbal,
Karachi, Pakistan

نقاش کاظمی
کراچی

نام تو ہے ان کا سید حسبی اللہ کاظمی۔ تخلص کرتے ہیں نقاش کاظمی۔ 26 فروری 1944ء کو جون پور ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ سندھ مسلم کالج کراچی سے انٹرمیڈیٹ سائنس، اردو کالج سے گریجویشن، کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اردو لسانیات، ایم اے اردو ادبیات، ایم اے پولیٹکل سائنس اور ایل ایل بی کیا۔ ٹیلی کمیونیکیشن اسٹاف کالج ہری پور ہزارہ سے ٹیلی کمیونیکیشن انجینئرنگ کی۔ ڈویژنل انجینئر ٹیلی فونز کراچی سے وابستہ ہیں۔ ماضی میں لیکچرار شعبہ اردو ضیاء الدین میموریل کالج کراچی و سراج الدولہ کالج (شام) اور ممتحن بورڈ آف انٹرمیڈیٹ کراچی رہ چکے ہیں۔

معصوم صورت نقاش کاظمی نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں نڈر بن کر بڑے بڑے معرکہ کئے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ جب انہوں نے شاعری کا آغاز کیا تو ایک مرتبہ محلّہ کی ایک تقریب میں مدعو کئے گئے۔ نقاش بڑے جوش و خروش سے نظمیں سنا رہے تھے اور سامعین میں بزرگ، نوجوان اور ساتھی لڑکے بڑھ بڑھ کر داد دے رہے تھے کہ ایسے میں ان کے بڑے بھائی لوگ تشریف لائے۔ بس پھر کیا تھا۔ بقول نقاش "جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرلیں اور ایک لمحے کے لئے چپ ہوگیا۔ پھر فوراً" ہی آنکھیں بند کئے کئے ہی سناتا رہا۔"

زبان و ادب سے یہ لگن نہ ہوتی تو نقاش منزلوں پر منزلیں سر نہ کرتے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ پر لکھتے رہے۔ بہت سے ادبی سیاسی اور بچوں کے جرائد کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ بین الکلیاتی مباحثوں اور مشاعروں میں

کالج اور یونیورسٹی کی نمائندگی کرتے رہے۔ انعامات و اعزازات حاصل کر کے شہرت حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں نئی نسل اور نوجوانوں کی تحریکات سے وابستگی کی بنا پر "وائس آف یوتھ" کا خطاب حاصل کیا۔ اردو کالج میں طالب علمی کے زمانہ میں "برگ گل" سرسید نمبر شائع کیا جو کہ ایم اے کے نصاب میں شامل ہوا۔ بے شمار ادبی انجمنوں میں شامل رہے۔ ادبی و ثقافتی تنظیم "گل چہرہ اکیڈمی" قائم کی جو کہ جاری و ساری ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین رائٹرز گلڈ' اکیڈمی ادبیات پاکستان' یونی کیریئنز انٹر نیشنل اور آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی سے وابستہ رہے۔ یونی کیریئنز کی مجلس منتظمہ کے دوسری بار رکن ہیں اور اسی طرح آرٹس کونسل کے گذشتہ کئی سالوں سے گورننگ باڈی کے رکن منتخب ہوئے ہیں۔ تقریباً" 6 یا 7 سال تک آرٹس کونسل کی ادبی کمیٹی کے چیئرمین رہے اور خصوصاً" "محفل نقد و نظر" قائم کی' جس نے دنیا بھر میں شہرت حاصل کی۔

اوائل عمری سے ہی لکھنے لکھانے کی جانب مائل ہوئے۔ ان کے والد بھی علمی و ادبی شخصیت تھے۔ "اردوئے فصیح" نامی اردو کتاب کے علاوہ "ماہنامہ شمیم" جون پور سے شائع کرتے تھے۔ اردوئے فصیح پٹنہ یونیورسٹی (بہار) کے میٹرک کے نصاب میں 12 سال تک شامل رہی۔ نقاش نے ان سے ہی ابتدائی رہنمائی حاصل کی۔ کراچی کی ادبی فضا نے مناسب ادبی تربیت کی۔ دنیا کے بڑے بڑے مشاعرے پڑھے اور داد لی۔ انہوں نے نظامت کی مخصوص طرز کی بنا ڈالی اور ملک و بیرون ملک مشاعروں اور ادبی اجلاس میں نظامت' خطابت اور کلام کی خصوصیات کی بنا پر اس وقت سر فہرست لوگوں میں شامل ہیں۔ امریکہ' کینیڈا' انگلینڈ' عرب و امارات اور ملک کے تمام بڑے اور اہم مراکز میں اپنے کلام اور نظامت کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ جن اساتذہ کے ساتھ مواقع حاصل ہوئے۔ ان میں جوش ملیح آبادی' فیض احمد فیض' احمد ندیم قاسمی' علی سردار جعفری' کیفی اعظمی وغیرہ شامل ہیں۔ پاکستانی اکابرین میں بہت سے سربراہان مملکت سے شرف ملاقات حاصل کر چکے ہیں۔

شاعری کے علاوہ تنقیدی یا تاثراتی انداز نثر سے وابستگی ہے۔ ترقی پسندی یا سائنسی مکتب فکر سے تعلق ہے۔ ملک کے تمام اہم جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ اردو کے مستقبل سے نقاش قطعی مایوس نہیں۔ کہتے ہیں اردو اگر چوتھی زبان نہ بھی ہوتی تو بھی اس زبان کا مستقبل تابناک ہے۔ تاریخ کے حوالہ سے دیکھا جائے تو یہ زبان ابتداء میں کسی نمبر پر نہ تھی اور اب چوتھی زبان میں شمار ہوتی ہے۔ اردو زبان بطرز نظم و نثر ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے اور اب تو دنیا کے گوشہ گوشہ میں' یونیورسٹیوں میں اور عوام الناس میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگر اس زبان کا دارالترجمہ قائم ہو جائے اور سائنسی انداز میں ترویج و اشاعت کا کام ہو تو جلد ہی امید بر آئے گی۔ ٹائپ' کمپیوٹر آڈیو ویڈیو سسٹم نے بھی اردو کا بہت

ساتھ دیا ہے' جس میں فلم' ٹیلی ویژن' ریڈیو اور اخبارات و رسائل نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

نقاش ذاتی طور پر شاعری میں نظم کو اظہار خیال کا بہتر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نثری نظم بھی ایک "صنف" ہے۔ اگر نثری نظم کی لوازمات کو گرفت میں لے کر مختصریات کہی جائے تو خوبصورت نظمیں بھی وجود میں آسکتی ہیں لیکن نثری نظم کی بھی ایک روح ہوتی ہے۔ جو الفاظ' لائنوں اور علامتوں کے ذریعے محسوس کی جاتی ہے۔ اس شعبہ میں مشق سخن کی ضرورت باقی ہے۔

مشاعروں اور تنقیدی نشستوں کے بارے میں ان کا تجزیہ' یہ ہے کہ مشاعرے اور تخلیقی نشستیں لازم و ملزوم ہیں اور اس سے ادب ترقی پاتا ہے۔ مشاعرہ ادب کو اشعار کی صورت میں عام سامعین اور ادب کے شائقین تک برق رفتاری کے ساتھ لے جاتا ہے' جس سے ادب تیزی سے پھلتا پھولتا ہے۔ پرانے دور میں "تھیٹر" یہی کام کرتا تھا جبکہ تخلیقی نشستیں مخصوص لوگوں تک ہی رہتی ہیں اور اس انداز سے ادب کی گونج کا دائرہ آہستہ آہستہ سفر کرتا ہوا شائقین تک پہنچتا ہے۔ کبھی رکاوٹیں بھی ہوتی ہیں۔ اس عمل کو یا اس نظریہ کو میر کے اس شعر سے سمجھا جاسکتا ہے۔

شعر میرے ہیں گو "خواص پسند"
گفتگو پر مجھے "عوام" سے ہے

مشاعروں سے عام آدمی میں شعر و ادب کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور جبکہ دنیا ایک گلوبل ویلج (Global Village) میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ادب کو ہر گاؤں کے باشندے تک پہنچنا چاہئے۔ اس میں "برہمنی" کا انداز اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ دوسری جانب تخلیقی نشستیں ایک "کلاس روم" کی حیثیت رکھتی ہیں' جس کا دائرہ کار محدود ہو جاتا ہے۔

نقاش اس خیال سے متفق نہیں کہ دور حاضر میں ادب کا عمل سے تعلق کٹ سا گیا ہے اور قاری سے اس کا رشتہ کمزور ہو گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یونان سے لے کر آج کے دور تک "ادب" کا تعلق "عمل" سے یا "قاری" سے کبھی نہیں کٹا اور نہ بے تعلق ہوا بلکہ اس کی جہتیں تبدیل ہو گئی ہیں بلکہ یوں ہوا کہ ادب (تحریری طور پر) پتھروں' چمڑوں اور غاروں سے نکل کر "کاغذ" پر آگیا۔ پھر پرنٹ میڈیا میں تبدیل ہوا اور بہت تیزی کے ساتھ "الیکٹرانک میڈیا" میں داخل ہو گیا اور اب "کتابی صورت" Audio / Vidio سسٹم کی شکل میں تبدیل ہو رہی ہے بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ ادب کا عمل روزمرہ زندگی بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ علیحدہ مسئلہ ہے کہ ادب کی نوعیتیں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اب تو مغرب میں گھر گھر شیکسپئر کا چرچا ہے اور مشرق میں حافظ و غالب کا اور جہاں تک مغرب کے ادب اور اس کی پیروی کا تعلق

ہے اور یہ کہ وہاں کے ادبی "فیشن" کو اپنے "ملک" میں در آمد کر رہے ہیں۔ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے' یہاں کا کوئی ادب "پاکستانی ادب" اپنا نہیں ہے۔ یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ ہمارے ملک میں تمام ادب بیرون ملک سے در آمد شدہ ہے۔ یعنی عربی' فارسی سے بھی جس کا تعلق عرب اور ایران توران سے ہے۔ دوسری جانب جدید نشرو اشاعت کے ذریعہ مغرب سے بھی ادب اور اسلوب سیکھے جا رہے ہیں۔ "مغرب" کے مقابل میں ہم "مشرق" تو کہہ سکتے ہیں لیکن مغرب کے مقابل اپنے اپنے "ملک" کی ٹرم استعمال نہیں کر سکتے' لہٰذا اس طرح کی سوچ ہی بے بنیاد ہے اور وطن بھی کیا جس کا ایک علمی' ادبی و ثقافتی بازو عرصہ ہوا کٹ گیا۔ اب رہا سوال مغربی رجحانات اور مغرب کے ادب کی پیروی کا تو عرض ہے کہ مغربی دنیا' معیشت' سیاست' سائنسی ایجادات اور ذرائع ابلاغ میں روز افزوں بہت تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ ترقی ہی نہیں بہت طاقتور میڈیا ہے اور جس تحریک میں قوت ہوتی ہے' وہ کمزور کو متاثر کرتی ہے۔ عربی' فارسی کے بعد ہندو پاک کے ادب کو "روسی ادب" نے متاثر کیا۔ پھر فرانسیسی' انگریزی وغیرہ تمام ادب "امریکی ادب" کی جانب بڑھ رہا ہے۔ خواہ وہ پاکستان ہو یا ہندوستان۔ البتہ پاکستان میں جسے ہم ملکی ادب کہیں' اس میں نعت' قومی نغمات اور علاقائی گیت وغیرہ میں کام ہو رہا ہے لیکن اس طرز کے ادب کا دائرہ وسیع نہیں ہو سکتا۔ لیکن وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے لکھنے والوں میں اکثریت ایسے اہل قلم کی ہے' جن کے یہاں "عصری حسیت یا گر روح عصر" واضح طور پر موجود ہے اور اگر یہ یہی "روح عصر" عالمی سطح کی ہو تو ہمارا ملکی ادب دنیا کے ادب کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

نقاش کے تین مجموعہ کلام "چاندنی اور سمندر' رخ سیلاب اور رنگ سفر" شائع ہو چکے ہیں۔ نثر میں "افرو ایشیائی ادیبوں کے مسائل اور ان کا پس منظر" کے عنوان سے لکھ چکے ہیں۔ نثر اور شاعری پر کئی کتابیں زیر طبع ہیں۔ ساتھ ہی بچوں کی نظمیں اور کمیونی کیشن اور ٹیلی کمیونی کیشن پر بھی کام کر رہے ہیں تاکہ یہ کام کتابی صورت میں سامنے آئے۔

عکس فن

رسی

ایک رسی اللہ کی
ایک رسی تمہاری
اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا
رحمتوں اور برکتوں کا انعام ہے
ہاں۔ تمہاری رسی
گلا دبا کر

زبان اور آنکھیں
باہر نکال دیتی ہے
لیکن
"قد لمبا ہو جاتا ہے"

جب شہر سے لاشہ اٹھا تھا تو نوحہ گر چلایا تھا
اب نوحہ گر کے مرنے پر ہے شہر میں کیوں اتنا سناٹا؟

۹، فروری ۹۸ء
کراچی

Nigar Sajjad Zaheer
C-68, Staff Town,
University of Karachi
Karachi-75270, Pakistan.

نگار سجاد ظہیر
کراچی

یہ شعر نگار سجاد ظہیر کا ہے۔۔۔

تو نے جو خود کو جہانگیر بنا رکھا تھا
پا بہ جولاں ہے مری سلطنتِ دل کے قریب

نگار جتنی خوبصورت نثر لکھتی ہیں، اتنے ہی کاٹ دار شعر بھی کہتی ہیں۔ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی نثر بہتر ہے یا نظم کیونکہ نگار کے ہر کام میں نظم و ضبط ہے، سلیقہ ہے انہیں محبت کرنے کا بھی ڈھنگ آتا ہے۔ اسی محبت کے ہتھیار سے وہ اپنے پرائے سبھی کے دل فتح کرتی ہیں۔ تحریر میں بھی محبت کے کنول کھلانے کا ہنر انہیں آگیا ہے۔ تحقیق کے موضوع پر نگار نے "غلامی ایک تحقیقی جائزہ" کے عنوان سے قابل مطالعہ مواد جمع کیا جو 1987ء میں شائع ہوا۔ 1993ء میں تاریخ کے حوالے سے "مطالعہ تہذیب" کے عنوان سے 272 صفحات کی کتاب لکھی۔ سفرنامہ نجد و حجاز 1996ء میں "دشت امکاں" کے عنوان سے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت سے سامنے آئی۔ نگار کے کلام کا پہلا مجموعہ "حرف غلط" زیر طبع ہے۔ نگار کو افسانہ نگاری سے بھی دلچسپی ہے اور شاعری کے مقابلے میں افسانہ نویسی کو اپنی کتھارسس کا بہتر ذریعہ سمجھتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "دست قاتل" کے عنوان سے 1994ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کا کلام اور نثری تخلیقات معاصر، بتول (لاہور) روپ، تشکیل اور اخبار جہاں جنگ، جسارت کراچی کے علاوہ اردو نیوز جدہ میں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ نگار 20 دسمبر 1954ء کو الہ آباد (یوپی، ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ بی۔ اے آنرز اور تاریخ اسلام

میں ایم۔ اے کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کی تکمیل میں لگی ہوئی ہیں۔
جامعہ کراچی کے شعبہء اسلامی تاریخ سے 1987ء سے بحیثیت لیکچرار وابستہ ہیں۔

نگار کہتی ہیں میرے لئے میری زندگی کا اہم واقعہ میرا ایک خواب ہے، جس کے شرمندہ تعبیر ہونے کی شدت سے منتظر ہوں اور وہ یہ کہ "احترام آدمیت کا درس عام ہو جائے اور انصاف بن مانگے گھر کی دہلیز پر ملنے لگے۔"

نگار کہتی ہیں.... "اردو اس شمع کی مانند ہے، جس پر پروانہ وار فدا ہونے والے عاشقوں کی کمی نہیں اور یہ اس شمع کی خوش نصیبی ہے کہ اس کے عاشقوں میں صرف وہی شامل نہیں ہیں، جن کی مادری زبان اردو ہے بلکہ وہ بھی شامل ہیں، جن کی مادری زبان کچھ اور ہے مگر وہ اردو سے محبت کا حق ادا کر رہے ہیں۔ یہ آخرالذکر عشاق، اول الذکر عشاق سے زیادہ قابل تحسین ہیں۔ عشاق کے اس طویل سلسلے اور ان کی قابل ذکر جانثاری کو دیکھتے ہوئے میں اردو کے مستقبل کے بارے میں خاصی پر امید ہوں۔"

شاعری میں اظہار کے لئے نگار غزل کو بہتر ذریعہ سمجھتی ہیں۔ نثری نظم کے لئے ان کا خیال ہے کہ اگر شاعرانہ رچاؤ اور خیال آفرینی سے مزین ہے تو چل جاتی ہے ورنہ نہیں۔ آج کل کے مشاعرے، ادب کی تخلیق اور ترویج میں کوئی کردار اس لئے ادا نہیں کر سکے کیونکہ یہ پی آر کے زور پر چلتے ہیں، البتہ تخلیقی نشستیں عموماً" بہتر کردار ادا کرتی ہیں اور ادیبوں اور شعراء کے لئے مہمیز کا کام انجام دیتی ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ادب کسی دور میں بھی بے اثر نہیں رہا، جو چیز تخلیق ہی اثر کے زور پر ہو، وہ بے اثر ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ضرور ہے کہ اس مشینی دور میں لوگوں کے پاس ادب کے لئے وقت، اور ادبی کتب کی خریداری کے لئے پیسہ کم ہے مگر ادیب اور قاری کا رشتہ بہرحال قائم ہے۔ جب تک تحریروں میں ابلاغ ہے، ادب کا قاری سے رشتہ برقرار رہے گا، جب یہ ابلاغ ختم ہو جاتا ہے تو نہ صرف ادب و قاری کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے بلکہ تحریر کی دلکشی اور اثر آفرینی بھی فنا ہو جاتی ہے۔ تحریر اسی وقت اثر دکھاتی ہے، جب بات سلیقے اور خلوص سے کی جائے۔ ادب وقت گزاری کی چیز نہیں، ایک سماجی ضرورت ہے۔ یہ جتنا اہم ایک ہزار سال پہلے تھا، اتنا ہی اہم آج ہے اور اتنا ہی اہم ایک ہزار سال بعد بھی ہو گا۔

آخری سوال کے جواب دیتے ہوئے نگار نے کہا.... "ادب کو سرحدوں میں جکڑا نہیں جا سکتا۔ ادب نہ مغرب کا ہوتا ہے نہ مشرق کا، یہ آفاقی ہے۔ جہاں تک تکنیک کا معاملہ ہے، اس کی فکر نہیں کرنی چاہئے، وہ خود بخود متعین ہو جاتی ہے، جس طرح ایک اچھا عروض دان، اچھا شاعر نہیں ہوتا، اسی طرح ایک ادیب جو تکنیک کی فکر کرتا ہے، اس کی تحریر سے ادبیت غائب ہو جاتی ہے۔ ادب کا موضوع بنیادی طور پر انسان ہے، خواہ مشرق کا ہو یا مغرب کا۔

کراچی کے رہنے والے ایک بھوکے مزدور کے احساسات و جذبات فرانس کے رہنے والے ایک بھوکے مزدور کے احساسات و جذبات سے زیادہ مختلف نہیں ہوں گے۔ یہ ضرور ہے کہ زندگی کے بارے میں مخصوص عقائد و نظریات کی وجہ سے ان کا رد عمل مختلف ہو مگر دکھ ایک ہی ہوتا ہے۔ بہترین ادب وہ ہے جو ان کے دکھوں کو انہی کے سماجی پس منظر میں محسوس کرے اور ایک دوسرے سماج میں رہنے والوں تک اس کا ابلاغ کرے۔"

عکس فن

سربرانیکا کی عورت

شوہر کا بھی لاشہ تھا
بچوں کے بھی لاشے تھے
جو اس نے دبائے تھے
اس گھر کے صحن میں جو گلشن تھا کبھی اس کا
خوشیوں کا گہوارہ مسکن تھا کبھی اس کا
اس گھر کے صحن میں اب
پیاروں کی قبریں تھیں
ماں پرسوں مری تھی اور
ایک بھائی کو کل صبح
گھر دروازے پر سربوں نے مار دیا
وہ پگلی پوچھتی ہے
یو این کے سپاہی سے
کھانا کیوں لاتے ہو؟
کیا زہر نہیں ملتا؟
پھر ایک مبصر کے
وہ کان میں بولی تھی
میرے بچے چیختے تھے
کیوں کوئی نہیں سنتا؟
کیا بچے گونگے تھے
یا دنیا بہری ہے؟

اب کے ہولی میں
بھگون کے سب روپ ملے
بھیگی چولی میں
اب کے ہولی میں

Nigar Sehbai
A-509, Block-N, North Nazimabad
Karachi, Pakistan

نگار صہبائی

کراچی

1972ء کی بات ہے، بلوچستان کے مقام سوئی کے مشاعرے میں پہلی بار میں نے نگار صہبائی کو سنا تھا۔ نگار کا مخصوص دلربا ترنم، جس میں گلوکار جگ موہن کی آواز جیسا سوز اور رس گھلا ہوا تھا۔ اس پر ہندی کے میٹھے بولوں سے سجے گیت، چاندنی رات کا سحر دوبالا ہوتا جا رہا تھا۔ اس مشاعرے میں اطہر نفیس (مرحوم) بھی تھے اور دوہے پڑھنے والے جمیل الدین عالی صاحب بھی۔ پھر نگار صہبائی کو کسی بہت گھریلو نشست میں سنا ہو تو سنا ہو کیونکہ مشاعروں میں وہ جاتے نہیں۔ نگار کہتے ہیں مشاعرے ایک اچھے شاعر کی موت ہیں، لہٰذا نگار بڑی تندہی سے اردو گیتوں کی تخلیق میں مصروف رہے اور یوں نگار صہبائی کے گیتوں کے دو مجموعے تخلیق ہو گئے۔ پہلا "جیون درپن" جو یو ایس لائبریری آف کانگریس کے تحقیقی شعبے کے لئے منتخب کیا جا چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ "من گاگر" ہے، جس کے بارے میں میرٹھ یونیورسٹی کے صدر شعبہء اردو ڈاکٹر بشیر بدر نے کہا کہ "من گاگر" کی علمی و ادبی حیثیت متعین ہو چکی ہے۔

پاکستان کے ایک مشاعرے میں بشیر بدر شریک تھے۔ ایک نجی شعری محفل کے بعد انہوں نے ضمیر صدیقی (جو شاعر تو نہیں مگر سخن فہم ضرور ہیں اور کی۔ وی پالش کمپنی میں لاء افیسر رہ چکے ہیں) سے کہا کہ ہم پاکستان کے شہر کراچی میں کئی مشاعرے پڑھ چکے ہیں مگر ہم نے آپ کے A گریڈ شاعر عزیز حامد مدنی کو کبھی مشاعرے میں نہیں دیکھا اور نہ ہی نگار صہبائی کو۔ ہمارا بس نہیں چلتا کہ ہم نگار صہبائی پر ایک فیکلٹی کھول لیں۔ ضمیر صاحب نگار کو جانتے ضرور تھے مگر گیت نگار کی حیثیت سے نہیں۔ پھر جب وہ ملے تو بولے، بھائی آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ اب اپنے کسی گیت کا مکھڑا فوراً "سنائیں" نگار صہبائی گنگنائے۔

ایک طرح کے پھول کھلائے اب کے رت نے ہر آنگن میں
ایک کمہار جو کھو گیا بن میں آج ملا ٹوٹے برتن میں

اسکے نگار صہبائی سے "سخن در حصہ سوم" کے سلسلے میں میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے ان کے بارے میں پوچھا۔ نگار صہبائی نے بتایا کہ "میری پہچان میرے نام نگار صہبائی سے ہی ہے اور یہی میرا تخلص بھی۔"

نگار اگست 1926ء کو ناگ پور (ہندوستان اور سابق دارالحکومت صوبہ سی۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ میں نے پوچھا تعلیم کہاں حاصل کی تو غصے سے میری طرف دیکھ کر بولے۔ "کیا میرا شعر لکھنا میرے پڑھے لکھے ہونے کا منہ بولتا ثبوت نہیں؟ اور اگر میں انگریزی ادب کا گریجویٹ بھی ہوں تو معاف کیجئے گا۔ میری شاعری میں کوئی چار چاند نہیں لگ جائیں گے۔"

ویسے نگار صہبائی کی فکری تعلیم و تربیت میں ان کے ماموں عبدالوہاب (مرحوم) جو بہت پائے کے فارسی داں اور علامہ اقبالؒ کی شاعری کے پرستار تھے اور دوران تعلیم پروفیسر غلام محی الدین اثر کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا۔ نگار نے بتایا کہ کسی مقامی مشاعرے میں شرکت سے پہلے مجھ پر یہ فرض عائد تھا کہ دو زانو ہو کر ماموں کے سامنے جو کلام مجھے سنانا ہوتا تھا' وہ ترنم سے انہیں سنانا پڑتا۔ اس طرح ماموں کی سرپرستی کی چھاؤں میں میری سخن گوئی کا پودا ہولے ہولے پرورش پاتا رہا۔ پروفیسر اثر نے مجھے مدرسہ اعظم میں مسدس حالی جس طرح پڑھائی اس کی مثال آج تک نہ مل سکی۔ جب میں نے اول اول اپنا کلام انہیں اصلاح کی غرض سے دکھایا تو انہوں نے میری سرپرستی اور حوصلہ افزائی یہاں تک کی کہ میرا تخلص انہوں نے ہی تجویز فرمایا۔

1946ء میں جب میں ہائی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر ناگ پور لوٹ آیا تو یہاں پروفیسر منظور حسین شور (مرحوم) میری گہری دلچسپی اور شعری توجہ کا مرکز بنے' جس کے نتیجے میں میرا رجحان اردو نظم کی طرف بڑھا۔ 1947ء میں جب میں ناگ پور سے رائے پور پہنچا تو وہاں عزیز حامد مدنی جیسے صاحب علم و ادب کی محفل میسر آئی۔ اکتوبر 1947ء میں' میں پاکستان آگیا۔ یہاں 1955ء سے سلیم احمد کی ذہنی اور روحانی تربیت نے مجھے شاعری کے لازوال سرمائے سے مالا مال کیا۔ سلیم احمد (مرحوم) کو جب میں نے اپنی 1944ء سے 1955ء تک کی کہی ہوئی ساری نظمیں' غزلیں اور قطعات سنائے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ "گیارہ سال کی ساری قابل توجہ شعری کاوش میں میری کہیں بھی نگار صہبائی سے ملاقات نہیں ہوئی۔" تب میں نے ان کے کہے پر اپنا سارا کلام یک قلم رد کر دیا اور شعر کے نئے سفر پر روانہ ہوا۔ گیت کی صنف جو اردو شاعری کی آج تک معتبر صنف سخن نہ بن سکی اور جس کی اردو شاعری میں کوئی روایت بھی نہیں۔ اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ابتدا

کوئی مذاق نہیں تھی۔ بقول نگار یہ سلیم احمد ہی تھے' جنہوں نے ان کے جوہر کی نشان دہی کی تھی جو آگے چل کر اردو شاعری میں ان کی اکلوتی پہچان کا سبب بنی۔ اس کا ثبوت ان کے دو دوہ مجموعے ہیں' جن کا ذکر ابتداء میں آچکا ہے۔ ان کے گیتوں کا تیسرا مجموعہ "انت سے آگے" زیر طبع ہے۔

شاعری کے علاوہ انہوں نے دیگر شعراء پر لکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ان کا پہلا مضمون احمد نوید پر ہے جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا ہے اور نگار کی اردو نثر کو اس سے تقویت ملی۔ جہاں تک مکتبہء فکر کا تعلق ہے' نگار کا پسندیدہ مکتبہ مابعد الطبیعاتی ہے۔ ان کے گیت نیا دور' سیپ' فنون' سوغات' ادب لطیف اور ماہنامہ روپ میں شائع ہو چکے ہیں۔ نگار اردو زبان کے مستقبل سے بالکل مطمئن ہیں کیونکہ بقول ان کے اردو فقط زبان ہی نہیں بلکہ زندگی کا ایک مکمل رہن سہن ہے' جسے عرف عام میں کلچر کہتے ہیں اور یہ برصغیر کی دو تہائی آبادی کا حصہ ہے۔

نگار کے نزدیک شاعری میں گیت اور نظم اظہار خیال کی بہترین اصناف ہیں۔ نثری نظم کے سوال پر خفا ہو کر بولے۔ "نثری نظم اور بے ہودہ باتیں کرنا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔"

مشاعروں کے سلسلے میں ان کی رائے ہے کہ مشاعروں نے شاعر کو شہرت تو بہت دی لیکن صفحے پر کمزور کر دیا۔ اس کی جیتی جاگتی تصویر پچھلے پچاس برس کے مشاعرے ہیں۔ نشستیں مشاعروں سے بہت مختلف چیز ہیں۔

نگار کہتے ہیں۔ "ادب ہی سے عمل پیدا ہوتا ہے۔ قاری اور ادب کے درمیان جو تعلق ہے' اس کا نام تعلیم ہے۔ بدنصیبی سے پاکستان میں تعلیم کا معیار صفر ہے۔"

آخری سوال سن کر کہنے لگے۔ "آپ نے سینئر یعنی معمر ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔ اس حلقے میں آپ یقیناً" میرا بھی شمار کریں گی۔ 1979ء میں میری ملاقات ہندی ادب کے سب سے معتبر رسالے "دھرم یگ" کے مدیر شری دھرم ویر بھارتی سے بمبئی میں جاوید اختر کے مکان پر ہوئی تھی۔ میرے گیت سن کر انہوں نے بھی یہی کہا تھا کہ ہندی ادب کے لیکھک نے دھرتی سے اپنا ناتا توڑ لیا ہے اور وہ مغربی ادب کے کے چربے تیار کر رہے ہیں۔ مجھے سن کر انہیں تقویت ہوئی کہ گیت زندہ ہے' جس پر میں نے جواب دیا کہ ہاں گیت زندہ ہے لیکن پاکستان میں۔"

انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔۔ "محترمہ ان تمام باتوں میں کچھ نہیں رکھا ہے اگر آپ خود مضبوط ہیں اور آپ کے اندر تخلیقی جوہر پوری توانائی کے ساتھ کار فرما ہے تو آپ کو کسی چربہ کاری اور کسی اور طرف دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اردو ادب میں میرے گیتوں

کی پذیرائی کیا' اس کا ثبوت نہیں۔"

نگار کے گیتوں کے مجموعہ "من گاگر" حمایت علی شاعر سے شیخ ایاز (مرحوم) لے گئے۔ اسے پڑھ کر انہوں نے شاہ لطیف بھٹائی کے حوالے سے ڈیڑھ گھنٹہ بات کی کہ فلاں موضوع کو شاہ نے اس طرح لکھا اور نگار نے اس انداز میں بات کہی۔

ڈاکٹر گیان چند کو غلام عباس رضوی نے "من گاگر" دی تو انہوں نے نگار کے گیت پڑھ کر علامہ کی معرفت پیغام بھیجا کہ ان گیتوں کو پڑھ کر ایک غیر مسلم کو اسلام کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

انجم اعظمی (مرحوم) نے نگار پر لکھے گئے اپنے مقالے میں کہا۔ تاریخی تسلسل میں امیر خسرو اور آرزو لکھنوی کے بعد اردو گیت لکھنے والوں میں نگار صہبائی تیسرا بڑا نام ہے۔

ڈاکٹر ذکاء الدین شایان کہتے ہیں۔ "نگار عرفانیت کے موضوعات کو اگر رومانیت اور جنسیت کے پس منظر میں بیان کر سکتا ہے تو دوسری طرف اسے یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ وہ رومانی اور عشقیہ باتوں میں تصوف کے رموز بتانے لگے۔"

سلیم احمد (مرحوم) نے لکھا ہے کہ نگار نے اپنے مجموعے "جیون درپن" میں ہمیں اپنی نجی جذباتی زندگی کی جھلکیاں دکھائی تھیں لیکن اس کے بعد اچانک اسے درپن پار کے درشن نظر آنے لگے اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ بھگتی تحریک میں اسلامی روایت کے ایک ایسے رنگ کا آغاز کر رہا ہے، جو صرف نگار ہی کر سکتا ہے۔

خود نگار نے ڈاکٹر جمیل جالبی کے "نیا دور" میں اردو گیت کی پرکھ کے عنوان سے مضمون لکھا اور نسیم درانی کے "سیپ" میں علامہ آرزو لکھنوی پر مضمون لکھ کر نیو تھیٹوز کے گیتوں کی علمی و ادبی حیثیت متعین کی۔ اس پر جن لوگوں نے صاد لگایا ان میں پروفیسر مجتبیٰ حسین' پروفیسر یحییٰ اسلام' عزیز حامد مدنی اور سلیم احمد کے نام نمایاں ہیں۔ بحیثیت صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جناب آل احمد سرور نے اس مضمون کو پڑھ کر نگار کو خط لکھا کہ آرزو صاحب کے گیت کہاں سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

نگار نے ریڈیو پاکستان کے لئے جو پانچ سو کے قریب کمرشل گیت لکھے' وہ انہوں نے اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کئے حالانکہ ان کی اپنی بھی ایک ویلیو ہے۔ جس طرح مہندی پر لکھا ہوا یہ گیت۔

"مہندی سے لکھ دو ری ہاتھوں پہ سکھیو میرے سنوریا کا نام"

یہ گیت آج ہندو پاک کی مہندی کی کوئی تقریب ایسی نہیں جہاں نہ گایا جاتا ہو۔ اس گیت کو پہلے عشرت جہاں نے اور پھر بنجامن سسٹرز نے گایا تھا۔ ماہنامہ "روپ" نے خاص طور پر لڑکیوں کی فرمائش پر یہ گیت نگار صہبائی سے لکھوا کر چھاپا تھا۔ ایک بھارتی فلم ساز نے اسے

سرقہ کر کے اپنی فلم میں "مورے ہلموا کا نام" کا ٹکڑا لگا کے گوا لیا۔

مگر ہم بھارتیوں کو کیا کہیں ناقدری کا مظاہرہ کیا ہم خود نہیں کر رہے۔ نگار کی خدمات کا ہم نے خود کب اعتراف کیا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ منفرد اردو گیتوں کے اس خالق کو ان کی زندگی میں ہی ان کی خدمات کے اعتراف میں "تمغہ ءادب" دیا جاتا۔ ان کے تمام مجموعوں کے نئے ایڈیشن شائع کئے جاتے اور ان کی رائلٹی انہیں دی جاتی تاکہ ایک فنکار اس بے حس معاشرے میں خود کو تنہائی کے عذاب سے نکالنے کا حوصلہ پیدا کر کے کامیابی کے مزید افق تلاش کرے۔ علامہ اقبال آخر کون سے مواقع کے لئے کہہ گئے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نگار کہتے ہیں۔۔۔ "آج کتابوں کی پذیرائی نہ ہونے کی وجہ بھی یہی بے حسی ہے۔ نگار صہبائی کے ساتھ ان کے ہم نفس دوست شرف الدین صاحب بھی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لوگوں کو مطالعہ کا عادی بنانے کے لئے تحفے تحائف کے طور پر دیگر مادی چیزوں کی بجائے ہمیں کتابیں دینا چاہئیں۔ اسی طرح بچوں کی سالگرہ، عقیقے اور عید کے موقع پر بھی بچوں کو اچھی کتابوں کا تحفہ دینا بہت ضروری ہے۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔"

شرف الدین صاحب کی یہ بات واقعی وزن رکھتی ہے۔ ہمیں یہ تحریک بلاشبہ چلانی چاہئے۔

عکس فن

گیت

انت سے آگے ایک سفر ہے
سورج نے سمجھایا تھا
پیڑ کے نیچے شام کا ڈھلنا
گاڑی بان کو بھایا تھا
تن سے من تک میں ہی میں تھا
رات نے پردے اٹھا دیئے
پل نے پل کو دکھا کے درپن
سمے کے دو جگ بنا دیئے
اک جگ پائل ڈھونڈتے بیتا
دوجے نے سب گیت کہے
میں کل بھی بچپن کی گلی سے
تیرے گھر تک آیا تھا

شام ابھی سے گوندھ رہی ہے
گجرے تیری راتوں کے
جنگل میں بازار لگے ہیں
بھولی بسری باتوں کے
پتوں کی آہٹ میں مگن تھے
ہم پلیا پر بیٹھے تھے
آنچل مکھ پہ ڈال کے تو نے
روپ کا دیپ جلایا تھا

پل کا ایک پڑاؤ ملا تھا
چاند کے ڈھلنے سے پہلے
بیٹھے تھے باہوں کے سہارے
تن اور من تھے میت نئے
عجب گھڑی تھی عجب سے تھا
چاند تو کل بھی نکلے گا
کہاں سے لائیں پڑاؤ پل کا
جس نے ہمیں بلایا تھا

مجھ کو اپنی زندگی میں بس وہی لمحہ عزیز
جس میں تیرے بازوؤں کا ہالہ مجھ پہ تنگ تھا

Rukhsana Noor
404- Nargis Block,
Allama Iqbal Town
Lahore-54570, Pakistan

رخسانہ نور

لاہور

لاہور میں "مسکراہٹ" بانٹنے والے طفیل اختر نے رخسانہ نور کے پہلے شعری مجموعہ "الہام" میں لکھا کہ "رخسانہ نور تخلیق اور تعمیر کے دو خانوں میں بٹی ہوئی مگر دونوں میدانوں میں ڈٹی ہوئی ایک فنکار ہے۔ وہ شروع سے جب وہ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتی تھی اور ماہنامہ "دھنک" میں لکھتی تھی تو اپنے ہونے بلکہ دوستوں سے الگ ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ وہ آج بھی ویسی ہی ہے۔"

خود میرے ماہنامہ "روپ" کراچی میں جب رخسانہ جب مضامین لکھتی تھی، تب وہ رخسانہ آرزو تھی، اس کی محنت اور لگن کی تو میں تب سے ہی معترف تھی اور سمجھتی تھی کہ اگر یہ کسی کے عشق میں مبتلا ہو گئی تو اس کے قلم کا سفر سست روی کا شکار ہو جائے گا اور وہی ہوا۔

17 نومبر کو سیالکوٹ میں پیدا ہونے والی رخسانہ ثروت صدیقی پہلے رخسانہ آرزو بنی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے صحافت میں ایم اے کیا۔ دوران تعلیم ہی روزنامے جنگ لاہور میں صفحہ خواتین کی نگراں کی حیثیت سے ملازمت کی۔ 1984ء میں سید نور سے شادی کے بعد پھر رخسانہ نور بنی اور گھریلو ذمہ داریوں میں ایسی گھری کہ تین بیٹیاں نور امین، قرۃ العین اور ماہ نور کی پرورش میں خود کو بھول بیٹھی۔ 1991ء میں پھر "جنگ" سے منسلک ہوئی لیکن 1996ء میں پھر چھوڑ دیا۔ جولائی 1997ء میں اپنے بیٹے محمد شاہ ظل نور کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش میں لگ گئی۔ اس درمیان رخسانہ اپنے میاں سید نور کی "ہمراہی" میں فلمی کہانیاں اور اسکرین پلے لکھنے میں ان کی معاونت کرتی رہی اور اپنے محبوب سید نور کے عشق میں شعر

بھی کہتی رہی جو اکتوبر 1997ء میں "الہام" کے نام سے شائع ہوا اور جس کے پہلے صفحہ پر رخسانہ نور نے لکھا۔ "اپنے شاہ جی کی نذر' زندگی چاہت وفا اور یہ الہام بھی" الہام میں رخسانہ کی کئی ایسی نظمیں بھی ہیں جو ہمارے روزمرہ کے مسائل اور ان میں گھرے گھٹے ہمارے جذبوں کا سچا سادہ اظہار ہیں۔

رخسانہ بنیادی طور پر صحافی ہے۔ اس نے افسانے بھی لکھے اور بے شمار انٹرویوز مضامین اور فیچرز بھی۔ سید نور کے لئے انہوں نے فلمی کہانیاں بھی لکھیں۔ کہتی ہیں "سید صاحب کی وجہ سے فلمی کہانیوں کی طرف ضرور رغبت ہوئی لیکن فلمی کہانیوں کی تخلیق میں میرے صحافتی تجربے نے بہت معاونت کی۔ میری کہانی "ہوائیں" بھی میرے ایک اخباری فیچر ہی سے لی گئی تھی اور "دوپٹہ جل رہا ہے" اپنے ایک مضمون ہی کو میں نے کہانی کا روپ دیا۔ جہاں تک شاعری میں مکتبہ ء فکر کا تعلق ہے زندگی کی حقیقتوں کے قریب تر جن لوگوں نے لکھا وہی میرے آئیڈیل ہیں۔ "فہمیدہ ریاض" کو میں شاعر کی حیثیت میں اپنے قریب پاتی ہوں۔"

رخسانہ نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظم بھی۔ ان کا کہنا ہے کہ "شاعری میں اظہار خیال کا پر اثر ہونا تو شاعر کے انداز پر منحصر ہے۔ اچھا خیال پابند شاعری میں ہو یا آزاد شاعری میں۔ پڑھنے والے پر اپنا تاثر چھوڑ دیتا ہے۔ دراصل میرے نزدیک شاعری کی صنف سے اہم وہ احساس ہے' جس کو خوبصورت مصرعوں میں پرو دیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے لکھتے ہوئے کبھی سوچا ہی نہیں کہ مجھے غزل کہنی چاہئے یا نظم۔"

رخسانہ کا کہنا ہے کہ "اردو زبان کے مستقبل سے میں مطمئن اس لئے ہی ہوں کہ اب اس زبان کے پھیلاؤ میں جدید ترین میڈیا بھی شامل ہو گیا ہے اور اس زبان کو سیکھنے کا عمل کتابوں تک محدود نہیں رہا۔ اس طرح ایک امید تو بندھ رہی ہے کہ اب حدود میں مقید نہیں رہے۔

اردو کے فروغ کے لئے مشاعرے بھی اہمیت رکھتے ہیں لیکن آج کے مشاعروں اور تخلیقی نشستوں کا اگر موازنہ کیا جائے تو میرے خیال میں اچھی نشستیں ہمیں تخلیق کی نئی راہوں کو جنم دیتی ہیں لیکن پھر بھی تخلیق کے عمل کے لئے کوئی لگا بندھا قاعدہ تو ہے نہیں۔ یہ تو تخلیق کار کی سوچ پر منحصر ہے کہ وہ چیزوں باتوں یا واقعات کو کس طرح لیتا ہے۔"

رخسانہ کہہ رہی تھیں کہ ادب کا قاری سے رشتہ کمزور نہیں ہوا۔ دراصل ہمارے ہاں ادب کو ہمیشہ معتبر جان کر مخصوص طبقوں کی میراث بنا دینا مروج تو ہے لیکن ادب کسی کی جاگیر ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ادب برائے ادب والی بات میں حقیقت ہے۔ قاری اور کتابوں کا رشتہ کسی حد تک بے شک کمزور پڑا ہے لیکن ادب کے ساتھ رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ اب ادب زندگی میں اک حقیقت کی طرح شامل ہو چکا ہے چنانچہ ادب کبھی بھی بے اثر نہیں

ہوسکتا یہ الگ بات ہے کہ ادب کی صورت نے حقیقت کی چادر اوڑھ لی ہے اور وہی ادب اثر چھوڑ رہا ہے جو زندگی کی حقیقتوں سے قریب ترین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کتابی ادب کے لئے ہمارے ہاں لوگوں کے پاس نہ تو وقت ہے نہ ان کا مزاج ہے۔ صرف وہی لوگ ادب پڑھنے اور اس سے متاثر ہونے میں دلچسپی رکھتے ہیں' جن کا تھوڑا یا زیادہ ادب سے تعلق ہے ورنہ آج کی پود سیٹلائٹ اور انٹرنیٹ کی دنیا میں اپنے مزاج کے مطابق چیزیں تلاش کررہی ہے۔

اور سوال نمبر 7 کے حوالے سے میں کہوں گی کہ "مشرق اور مغرب کی اصطلاح دو دہائیاں پہلے تو قابل غور تھی اور مشرق و مغرب کے حوالے سے کوئی بھی بحث' کوئی بھی تنقید کسی حد تک دلچسپی لئے ہوئے تھی لیکن آج جب دنیا ایک نقطے پر آئی اور میڈیا کی ترقی نے مشرق و مغرب کی دوریاں ختم کردی ہیں' اب زبانوں کا فرق ضرور رہ گیا ہے ورنہ تکنیک کے لحاظ سے شاید ہی کسی زبان کا ادب کسی دوسری زبان کے ادب سے فرسودہ ہو۔ اردو ادب ہو کہ انگریزی' فارسی ادب ہو کہ فرانسیسی' یہاں تک کہ علاقائی زبانوں کے ادب بھی تکنیک اور خیال کے حوالے سے اس قدر جاندار اور پختہ ہیں کہ یہ کہنا کہ کوئی دوسرے کی پیروی کررہا ہے بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر علاقے کے ادیب اپنے ہی مسائل اور اپنی زمین کی تاثیر کے حوالے ہی سے بات کرتے ہیں۔ وہ عرب کی زمین ہو یا امریکہ یا انگلینڈ کی پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ پاکستانی ادیب امریکی معاشرت کے مسائل کو اولیت دیں یا یہ کیسے ممکن ہے کہ تخلیقی عمل کسی ایسے سماجی ماحول کا تابع ہو جائے' جس میں ادیب سانس نہ لے رہا ہو۔ ادیب یا شاعر اپنی محسوسات اور اپنی نظر کے حوالے ہی سے بات کرتا ہے۔ وہ خوشیوں کو' دکھوں کو..... مسائل کو کس حوالے سے دیکھتا اور کس طرح لیتا ہے۔ اسی لہجے میں بات کرے گا۔ باقی میرے خیال میں تو ایسا ممکن ہی نہیں کہ ہم اپنی ذات کے حوالوں کی نفی کرکے کسی اور کے خیالوں کی پیروی کریں اور جہاں تک مختلف زبانوں کے ادب سے سیکھنے کا تعلق ہے تو یہ عمل بھی ازل سے شروع ہے جو ابد تک جاری رہے گا۔ اگر ہم دوسری زبانوں کے ادب سے کچھ سیکھ رہے ہیں تو دوسری زبانوں کا ادیب بھی ہمارے ادب سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کررہا ہے۔ "

عکسِ فن

الجھن

اب مجھ میں جاناں
کیا کھوجتے ہو
اب میری آنکھوں میں
کیا ڈھونڈتے ہو
اب میری سانسوں میں
کیا سونگھتے ہو
اب میرے تن کے کنارے پہ جاناں
کیا گھومتے ہو
الجھن ہے جانے
کیوں مجھ کو جاناں
تجھ کو قسم ہے..... سچ سچ بتانا
تجسس میری ذات کا کچھ ہے باقی!
یا.............................؟
اگر ہو تجسس یا راحت وابستہ
تو پھر تن دریچے کو تم کھٹکھٹاؤ
وگرنہ تعلق کے دھاگے کی خاطر
تم جسم کھیتی میں ہل نہ چلاؤ

وہ شخص لے گیا ہے مری پرواز بھی گو
جیسے کسی نے کاٹ دیئے بال و پر مرے

شہناز نور
۱۷ دسمبر 199

Shahnaz Noor
B-54, Block-N,
North Nazimabad
Karachi, Pakistan

شہناز نور

کراچی

شہر کراچی میں شاعری کے میدان میں بڑے بڑے گوہر نایاب چھپے ہوئے ہیں۔ شہناز نور بھی انہی میں سے ایک ہے۔ بڑے سچے اور کھرے جذبوں کی شاعرہ شہناز کو بہت پہلے میں نے ایک مشاعرے میں سنا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

میں اوجھل ہوگئی ماں کی نظر سے
گلی میں آئی جب بارات کوئی

تو میری آنکھیں بھیگ سی چلیں۔ اس پر شہناز نور کا دل کو تڑپا دینے والا ترنم اور مدھر مدھر سا شعری لہجہ۔ جیسے ایک بے بس ماں، جس کے کاندھے پر جوان لڑکی کے گھر کی آبادکاری کا بوجھ ہو، اس کی بے بسی اور مایوسی ایک مجسم تصویر بن کر اس شعر کے ذریعے سامنے آجاتی ہے۔ پھر شہناز نور کا یہ دکھ کہ۔

زمینِ دل بڑی زرخیز تھی نور
برس جاتی اگر برسات کوئی

زندگی کے ان بدتر حالات کا مظہر ہے، جو سیاسی بھی ہیں، سماجی بھی، معاشی بھی اور ہماری اخلاقی پستی کا بھی اشتہار بنے ہوئے ہیں۔ آیئے اسی شہناز سے ملتے ہیں، جس نے اپنے تذکرے میں کہیں جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔

شہناز قریشی ان کا نام ہے۔ نور تخلص، جائے پیدائش سکھر (سندھ) ہے۔ تاریخ پیدائش

10 نومبر 1947ء- صحافت میں ایم اے کیا ہے۔ محکمہ اطلاعات سندھ سے بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر وابستہ ہیں۔ تفصیل بتاتے ہوئے شہناز نے کہا "درجہ اول سے ایم اے تک تعلیم کے سارے سال سکھر اور کراچی کی درسگاہوں میں تقسیم ہیں۔ بہرحال میٹرک کا امتحان سکھر ریلوے گرلز ہائی اسکول سے 1964ء میں اور بی اے کا امتحان 1968ء میں گورنمنٹ گرلز کالج سکھر سے دیا' جو اس وقت حیدر آباد بورڈ اور سندھ یونیورسٹی سے مربوط تھے۔ ایم اے کا امتحان دس سال کے وقفے سے 1978ء میں کراچی یونیورسٹی سے پاس کیا۔ 1967ء کے اواخر میں پیپلزپارٹی کی سیاسی اور سماجی بہبود کے لئے کام شروع کیا۔ "ممبران انجمن خواتین" سکھر کی سیکریٹری رہی۔ پاکستان یوتھ کونسل کی رکن ہوئی۔ 1971ء میں پیپلزپارٹی میں خواتین شعبہ کی علیحدہ بنیاد رکھی' جسے 1974ء میں ملکی سطح پر اپنا لیا گیا۔ 1976ء تک شہر اور ضلعی سطح پر تنظیم کے مختلف عہدوں پر کام کیا۔ اسی دوران سکھر کے معروف روزنامہ "کلیم" سے صحافت کا آغاز کیا۔ 1976ء میں محکمہ اطلاعات میں نائب افسر اطلاعات سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس طرح مستقل طور پر کراچی منتقل ہوگئی۔ تاحال کراچی میں مقیم ہوں۔ سرکاری ملازمت کی بناء پر سیاست سے ہاتھ چھڑا لیا لیکن سماجی بہبود کی مختلف انجمنوں سے منسلک ہوں۔ حسب استطاعت انسانیت کا وہ خاموش قرض اتارنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں جو اللہ نے بطور انسان ہر ایک پر واجب رکھا ہے۔"

اچھا کچھ اپنے ذاتی حالات کے بارے میں بتایئے اگر مناسب جانئے۔ میں نے پوچھا تو وہ سچائی سے بولی۔ "دیکھئے منافقت میرے بس کا کھیل نہیں' اس لئے میں وہ روایتی شادی نہیں کر سکی جو والدین کی خواہش تھی کیونکہ میں اسے نامناسب خیال کرتی تھی۔ اپنے اسی وصف کے سبب خود کو آج کی دنیا میں ایک ناکام فرد خیال کرتی ہوں۔ 1970ء میں والد کا انتقال ہوا۔ 1987ء میں والدہ کا۔ اپنا بوجھ خود اٹھائے ہوئے ہوں۔ اگرچہ یہ بھی ایک سچ ہے کہ میرے بہن بھائی انتہائی محبت کرنے والے اور مخلص ہیں۔

ادب کی جانب رجحان ورثے میں ملا ہے۔ والد سندھی اور پنجابی کے مستند شاعر تھے لیکن تعلیم کے زمانے میں شعر کہنے پر قدغن رہی۔ البتہ نثری تحریر و تقریری مباحثہ میں بہت آگے رہی۔ پہلا شعر درجہ ہفتم میں کہا جب اسکول میں ہی بیت بازی کے مقابلے میں اشعار کم پڑگئے درحقیقت اسی وقت مجھ پر یہ کھلا کہ میں شعر کہہ سکتی ہوں۔ اب رہی پڑھنے کی بات تو پہلا کل پاکستان مشاعرہ 1974ء میں سکھر میں پڑھا۔"

شاعری کے علاوہ اور کس صنف میں طبع آزمائی کی ہے؟ "شاعری کے علاوہ ہلکے پھلکے سیاسی سماجی مضامین صحافت کے ضمن میں لکھتی رہتی ہوں۔ افسانے بھی لکھے ہیں اور شائع بھی ہوتے رہتے ہیں' جو پسند بھی کئے گئے ہیں لیکن باقاعدہ ربط شاعری سے ہی رکھا ہے۔ انجمن

ترقی پسند سے وابستہ رہی ہوں۔ 1974ء میں سکھر میں اس کی کنوینر رہی۔ میرا ذہنی ربط آج بھی اسی سے ہے۔ کراچی میں ادبی تنظیم ''ارباب قلم'' جس کے صدر جناب شبنم رومانی ہیں' منسلک ہوں۔ اخبارات کے علاوہ ادبی جرائد میں کلام چھپتا رہتا ہے مگر کم کم۔ بہت کاہل بھی ہوں اور شہرت کے حصول کی بہت شوقین بھی نہیں ہوں۔ پاکستان سے باہر بھی مشاعرے پڑھے ہیں۔ سرکاری پابندیوں کے باعث ہندوستان جانا نہیں ہوا۔ گروپ بندیوں کی سیاست سے دور ہوں اور مطمئن ہوں کہ میری جو بھی تھوڑی بہت عزت اور شہرت مجھے اللہ نے دی ہے' میرے اپنے کام کی بناء پر ہے۔''

آپ کا کوئی مجموعہ ء کلام شائع ہوا؟ ''اردو مجموعہ ''نشاط ہجر'' زیر طبع ہے۔ پنجابی مجموعہ بالکل مکمل ہے۔ اردو مجموعے کے بعد شائع کرنا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کچھ منتخب ابواب کا ہائیکو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب بھی اردو مجموعے کی اشاعت کے فوراً بعد انشاء اللہ شائع ہو جائے گی۔ اردو کے علاوہ سندھی اور پنجابی میں شعر کہتی ہوں۔''

زندگی میں پیش آئے کچھ ایسے واقعات سنائیے جو یادگار ہوں۔ سوال سن کر شہناز سنجیدگی سے بولیں۔ ''زندگی بجائے خود ایک اہم واقعہ ہے۔ میرے لئے مزید اہم یوں ہے کہ میں 1947ء میں سکھر میں قائم مہاجر کیمپ میں پیدا ہوئی' جس کے اثرات آج تک میری زندگی پر ہیں اور میں ہنوز ایک کیمپ میں زندگی گزار رہی ہوں۔ دوسرا اہم واقعہ اپنے مزاج کے خلاف ملازمت کرنا ہے۔ جس نے بہرحال مجھے اعتماد ضرور دیا ہے کہ میں کسی کی دست نگر نہیں رہی۔ دلچسپ واقعات سے تو خیر روز واسطہ پڑتا ہے۔ پر ایک واقعہ ضرور سنانا چاہتی ہوں۔

میں نئی حسن کے اسٹاپ سے بس میں سوار ہوئی۔ دوسرے تیسرے اسٹاپ سے خالد چاؤلہ مدیر ''نورجہاں'' سوار ہوئے۔ آنکھوں میں شناسائی کی چمک جاگی۔ ہیلو ہائے کے بعد بولے ''روپ'' نہیں مل رہا۔ میں چکرا گئی۔ پھر فوراً خیال آیا' اچھا یہ مجھے سلطانہ مہر سمجھ رہے ہیں اور میں سلطانہ مہر بن گئی۔ تھوڑی دیر بعد میری ہنسی چھوٹ گئی اور ہنسی کے لہجے سے انہوں نے مجھے سلطانہ مہر سے مختلف محسوس کرلیا۔ انہوں نے اب گھور کے مجھے دیکھا تو قہقہہ لگا کے ہنس دیئے۔ ''ارے آپ تو شہناز نور ہیں'' بس میں سفر کرتے ہوئے اکثر میں یہ واقعہ خود سے دہراتی ہوں۔''

شہناز بھی اردو کے مستقبل سے مایوس ہیں۔ بڑے دلگیر لہجے میں بولیں اردو دنیا کی بیشک بڑی زبانوں میں سے ہے۔ آج برصغیر کے لوگ جہاں جہاں آباد ہیں' وہاں اردو موجود ہے۔ دنیا بھر میں ادب تخلیق ہو رہا ہے لیکن میں اس کے مستقبل سے مایوس ہوں۔ ہم لوگ اپنے عمومی کلچر سے دور ہو رہے ہیں۔ نجانے کس قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہیں کہ گھروں

میں بچوں سے اردو بولنا ترک کر رہے ہیں۔ شاید انہوں نے یہ حقیقت قبول کرلی ہے کہ اردو میں مہارت ان کے بچوں کے معاشی مستقبل میں کوئی مدد نہیں کرے گی۔ اس لئے جب اردو کے اس ملک میں جہاں "قومی زبان اردو" کا دعویٰ ہو اور وہاں اردو کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہو تو ان ممالک میں کیا توقع کی جاسکتی ہے، جہاں اردو صرف گھر میں بولی جانے والی اور محض بزرگوں کی زبان ہوتی جا رہی ہو۔"

اپنی پسندیدہ صنف سخن کے بارے میں اظہار خیال کرنا پسند کریں گی؟ "غزل میری پسندیدہ صنف ہے۔ اسے ہی سب سے زیادہ موزوں خیال کرتی ہوں۔ نثری نظم اور نظم دونوں کے سلسلے میں مثبت طرز فکر رکھتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کچھ موضوعات کے لئے نظم ہی بہترین طرز اظہار ہو سکتی ہے۔ نثری نظم شعریت کی زیادہ مانگ کرتی ہے لیکن عام طور پر لوگوں نے نثر کو دو تین جملوں میں تقسیم کرنے کا نام "نثری نظم" رکھ لیا ہے، جس کی بناء پر اسے سہل سمجھ کر نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ نثری نظم کے لئے ن م راشد اور فیض جیسی ذہانتوں کی ضرورت ہے۔ اب رہی مشاعروں کی بات تو حقیقت یہ ہے کہ سلطانہ آج کل کے مشاعرے شہرت اور معیشت کی افزودگی میں تو نمایاں کردار ادا کرتے ہیں، پر ان سے ادب کی خدمت نہیں ہوتی۔ خدمت شاعر کی ہوتی ہے یا پروگرام کے منتظم کی جبکہ شعری نشستوں میں اشعار پر توجہ دی جاتی ہے۔ لوگ محفل سے کچھ لے کر اٹھتے ہیں۔"

آج ادب سے قاری کا رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔ اس موضوع پر آپ کیا کہتی ہیں؟ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے شہناز نے کہا کہ "ہاں یہ ایک درست تجزیہ ہے۔ غم روزگار کا غلبہ اس قدر ہے کہ عام قاری کے پاس ادب پڑھنے کے لئے وقت نہیں رہا۔ کوئی تھوڑا وقت نکال پائے تو تفریح چاہتا ہے جو اسے ریڈیو اور خاص طور پر ٹی وی سے میسر آتی ہے۔ وہ اسی کو "ادب اور تفریح ساتھ ساتھ" کے احساس کے ساتھ حاصل کرنے کو کافی سمجھ رہا ہے لیکن ہم ادب کو بے اثر نہیں کہیں گے۔ قاری کا حلقہ کم ہوا ہے لیکن موجود ہے اور اس موجود سے انصاف کی توقع کی جاسکتی ہے کہ ٹی وی ریڈیو کی یکسانیت پھر انہیں کتاب کی طرف لائے گی۔"

شہناز اس خیال سے متفق ہیں کہ ہمارے ادب پر مغربیت کی چھاپ نہیں ہونی چاہئے؟ کہتی ہیں کہ ہمارے سینئر ادباء اور دانشوروں کا یہ تجزیہ انتہائی درست ہے۔ ہماری تہذیب و ثقافت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہم مغربی اقوام سے قطعی مختلف احساس فکر اور رشتوں کا ادراک رکھتے ہیں۔ ہمارے مسائل اور حسیت کا ان کے انداز زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، تو ہم ان کی ادبی اقدار کو اپنے ہاں کیسے کامیاب کہہ سکتے ہیں۔ ان کے رویوں کو خوش آمدید کہہ کر ہم اپنی تہذیب اور ثقافت کو قتل کریں گے۔ ہمارے مسائل، ہماری

تہذیب اور ثقافت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر تخلیق کیا گیا ادب ہی ہماری روح کی آواز ہو سکتا ہے۔ اسی سے ادب اچھا تخلیق ہو سکتا ہے۔ اسے اتنا اچھا ضرور ہونا چاہئے کہ اہل مغرب اس پر اسی طرح توجہ دے سکیں جیسے ہم اہل مشرق ان کے ادب سے متاثر ہیں۔ مغرب کے ادب میں مغرب ملتا ہے تو مشرق کے ادب میں مشرقیت ہی ہونی چاہئے۔

عکس فن

غزل

اب یہاں چراغوں کا سلسلہ نہیں کوئی
روشنی کے بارے میں سوچتا نہیں کوئی

ٹوٹ پھوٹ کی زد میں روز و شب گزرتے ہیں
سانحہ یہ سب کا ہے، مانتا نہیں کوئی

اس خیال سے کرنا روز بزم آرائی
کون کتنا تنہا ہے، دیکھتا نہیں کوئی

بس مجھے سمندر کا حوصلہ پرکھنا ہے
ورنہ کیا کنارے پر ڈوبتا نہیں کوئی

ہر جگہ نظر آئیں قد سے اونچی دیواریں
جیسے شہر میں اپنا اب رہا نہیں کوئی

اور کیا سفر کرنا، اب اسی کو گھر کرنا
دشت سے نکلنے کا راستہ نہیں کوئی

آزما رہا ہے کیوں اب مجھے مقدر نورؔ
پرے لب پہ مدت سے جب دعا نہیں کوئی

یہ عبادت کہ جو بے زیر و زبر لکھی گئی
وہی سمجھیں گے کہ جو زیر و زبر جانتے ہیں

احمد نوید
۲۵/۱۲/۹۷

Ahmad Naved
F-94, Al-Falah Soceity,
Malir Halt
Karachi, Pakistan

احمد نوید
کراچی

نگار صہبائی ہر کسی کی جا بے جا تعریف نہیں کرتے مگر کسی کا فن ان کے دل کے تاروں کو چھونے لگے تو کنجوسی بھی نہیں کرتے اور جی کھول کر حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ نگار صہبائی کا سخن میرے نزدیک معتبر ہے' لٰہذا احمد نوید کے تعارف میں' میں نگار صہبائی کی یہ رائے ضرور لکھنا چاہوں گی' جس کا اظہار انہوں نے اپنے مضمون ''احمد نوید..... شاعر جمالیات'' میں کیا ہے۔ نگار لکھتے ہیں۔

''کسی شاعر کا کلام دراصل اس کے مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے اور شاعر کا یہ مزاج اس کے اپنے خمیر سے اٹھتا ہے۔ اس میں اس کی اپنی جبلت کار فرما ہوتی ہے۔ اس کے حالات اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی تربیت اور خاندانی ورثہ بھی بیک وقت کام دکھاتے ہیں اور ان سب پر اس کا مطالعہ سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے اور پھر شاعر کا مزاج مختلف مدارج سے گزر کر جب تربیت پا رہا ہوتا ہے تو شاعر اس سے بے خبر ہوتا ہے لیکن شاعر کی جبلت جو بچپن سے سرگرم عمل ہوتی ہے۔ مزاج کے بننے میں اپنا منفرد رنگ ضروری گھولتی ہے۔ مزاج میں پختگی آنے کی منزل تک شاعر جن حسی تجربات سے گزرتا ہے' ان کے بے حساب رنگ اور زاویے ہوتے ہیں جو پتہ نہیں کہاں سے آتے ہیں۔ اس امر کی نشاندہی احمد نوید کے ابتدائی کلام سے ہوتی ہے' جب نوید کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی۔''

مفت کب ہاتھ یہ خاروں کا بچھونا آیا
گھر لٹا ہے تو ہمیں خاک پہ سونا آیا

ہائے وہ عشق وہ بچپن کہ مرے آنگن میں
چاند لے کر ترے چہرے کا کھلونا آیا

جس زمانے میں احمد نوید نے یہ شعر کہے یقیناً" نہ ان کا مطالعہ وسیع تھا نہ زندگی گزارنے کا تجربہ۔ پھر یہ تخلیقی قوت جو ان کے اشعار میں کارفرما تھی' یہ ان کی جبلت تھی جو دراصل مابعد الطبیعاتی کیفیت کی مظہر ہے' جس کا ادراک احمد نوید کو بہت آگے جاکر ہوا۔
اگلے پیراگراف میں انہوں نے احمد نوید کے دو شعر کے حوالے دے کر لکھا ہے۔۔

جیسے تم ہنس دیئے خدا کی قسم
جیسے موتی بکھر گئے مجھ میں

اس قدر مجھ کو مجھ میں گم پاکر
آئینے تھے کہ ڈر گئے مجھ میں

"آئینے" کا لفظ احمد نوید نے اپنے کلام میں جہاں جہاں برتا ہے' وہ کہیں علامت بن گیا ہے' کہیں معرفت بن گیا ہے' کہیں خود آئینہ بن گیا ہے' کہیں آئینہ ساز' کہیں آئینہ دیکھنے والا اور کہیں آئینہ دکھانے والا لیکن کمال فن یہ ہے کہ ان گنت جہتوں کے باوجود لفظ آئینہ' جوں کا توں استعمال کیا گیا ہے۔ میں یہ نوید سے کہہ چکا ہوں کہ ان کے کلام میں آئینے کا لفظ جن شعروں میں برتا گیا ہے اگر ان کو ایک منطقی ترتیب سے لکھ دیا جائے تو ایک مکمل مضمون کی صورت ہاتھ آجائے۔
نگار صہبائی کی رائے جو احمد نوید کے کلام کے بارے میں ہے متنازعہ نہیں کہ اس کی شاعری کو کئی لوگوں نے سراہا مگر اس کی شخصیت کے حوالے سے جب بھی بات ہوئی ایک مجموعی تاثر یہ ملا کہ وہ "فرسٹریشن" کا شکار ہے۔ یہ کیسا فرسٹریشن ہے' جس نے احمد نوید کو اس حال تک پہنچایا؟ میں نے احمد نوید کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہا تو مجھے اس کے کلام کا 1997ء میں شائع ہونے والا مجموعہ "ہاں اور نہیں کے درمیاں" اوج کمال (مدیر دنیائے ادب کراچی) کے توسط سے ملا۔ یہ مجموعہ اوج نے ہی اپنے ادارے سے چھاپا ہے۔ اس مجموعہ کے پیش لفظ میں احمد نوید کی بیوی عفت نوید لکھتی ہیں کہ
"میں ان خاتون کی شکر گزار ہوں' جن کی محبت میں یہ بارہ سال کی عمر میں گرفتار ہوئے اور پھر باقی ساری محبتیں اسی تسلسل میں کیں اور یوں۔۔

اک تھکن جسم و جاں میں پگھلتی رہی دیپ جلتے رہے

اعصابی تناؤ کا شکار احمد نوید نبود و بنود اور ہونے نہ ہونے کے چکر میں بہت دور نکل گیا۔

اس کا دماغ ان عمیق خیالات کو نہ سہہ سکا چنانچہ اس پر یکے بعد دیگرے سات شدید حملے ہوئے' جس نے اس کو حد درجہ لاپروا اور کاہل بنا دیا مگر اپنی محبتوں میں اس جیسا ہوشیار اور چست شاید ہی کوئی ہو۔

یہ تو عفت نے لکھا ہے (شوہر کے عشق کے ریلے اور تھپیڑے ایک آہنی دیوار بن کر سہے جانا عفت ہی کا حوصلہ ہے یا اس کی محبت کا جو اسے احمد نوید سے ہے) مگر خود نوید بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یہ ان دنوں کی بات ہے' جب میں مسلم لیگ کوارٹر ناظم آباد میں رہتا تھا۔ میری عمر گیارہ سال تھی اور میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اپنی ماموں زاد سے عشق کرتا تھا اور اپنے دوستوں سے جو مجھ سے عمر میں بڑے تھے' خدا کے ہونے اور نہ ہونے پر بحث کرتا تھا مگر اپنے دلائل کمزور پاتا تھا۔ پھر میں نے 1970ء میں کتب خانوں کا رخ کیا۔ (احمد نوید کی تاریخ پیدائش 4/اکتوبر 1958ء کراچی ہے۔ یوں وہ 1970ء میں بارہ سال کے ہوئے) اور تقریباً" دس سال تک پڑھتا رہا۔ اس دوران میں نے فلسفہ' ادب' سائنس اور الہامی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ 1979ء سے باقاعدہ شاعری کرنے لگا۔ 1981ء میں مجھے پہلا نروس بریک ڈاؤن ہوا' جب سے اب تک مجھے آٹھ اٹیک ہو چکے ہیں۔ مجھے زنجیروں سے باندھا گیا۔ میرے سر میں برقی رو دوڑائی گئی۔ اس طرح پندرہ سال تک نفسیات دانوں کیلئے تجربہ گاہ بنا رہا مگر اب دو سال سے روبصحت ہوں۔ مجھے سنبھالنے میں میری بیوی عفت کی بڑی قربانیاں ہیں اور میرے بیٹے علی رشک اور علی رامش میرے زندہ رہنے کا باعث ہیں۔"

سید احمد حسین جعفری سے احمد نوید تک پہنچنے کے لئے احمد نوید کی شخصیت کے ساتھ ان کے کلام کا مطالعہ بھی بے حد ضروری ہے۔ احمد نوید کی انا اس کا گوشۂ عافیت ہے۔۔

کیوں کسی سے رکھوں کوئی سروکار
آپ آقا' میں آپ اپنا غلام

اسی احمد نوید کو اس کی بے روزگاری کے دنوں میں ان احباب نے بھی بے یار و مددگار چھوڑ دیا' جو اس سے کلام لکھوا کر لے جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ آٹے' چینی اور دودھ کے پھیر میں پریشان تھا کہ کچھ لوگ کلام لکھوانے آئے اور پھر اسے نذرانہ دینے لگے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر اس حسن سلوک پر رویا۔۔

وہ در کھلا نہ ہم پہ وہ دیوار ہی گری
نالے ہمارے باثر ایسے کہاں کے تھے

احمد نوید کی شاعری بیدل' غالب اور اقبال سے متاثر ہے۔ شاعری کے علاوہ وہ تنقید اور ناول نگاری سے بھی دلچسپی ہے۔ چار مجموعہ درنیم وا' وجود' ایسی خلوت ہے کہاں اور ہاں اور

نہیں کے درمیاں شائع ہو چکے ہیں۔

احمد نوید کا کہنا ہے کہ "اردو زبان کا مستقبل اس وقت تک محفوظ نہیں، جب تک اسے پروفیشنل زبان کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا۔ ان کے بقول شاعری میں صنف سخن کا مسئلہ شاعر کی طبع اظہار کے مطابق ہوتا ہے۔ احمد نوید غزل اور نظم دونوں کہتے ہیں۔

نثری نظم کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا "میں اسے مشکل ترین صنف سخن قرار دیتا ہوں کیونکہ جب اوزان اور بحور کی قید سے شاعر آزادی چاہتا ہے (اپنے خیال کی وسعت کے پیش نظر) تو اسے یہ ثابت بھی کرنا ہوگا کہ اس کا خیال بہت وسیع ہے اور اوزان اور بحور کی قید میں نہیں سما سکتا، لہٰذا اتنا بڑا خیال کہاں سے لایا جائے کہ نثری نظم کا پیٹ بھرا جاسکے۔

جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے تو یہ مشاعرے اپنے عہد کے بڑے شاعر کے خلاف چھوٹے شاعروں کی سازش ہوتے ہیں۔ ہاں تخلیقی نشستیں ادب میں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ "

آج کا ادب بے اثر بن گیا ہے۔ اس حوالے سے احمد نوید نے کہا۔ "ادب کی اثر پذیری، عمل اور قاری تینوں ہی ادب سے مشروط ہیں۔ ادب کی اثر پذیری عمل اور قاری پر بات کرنے سے پہلے ادیبوں کی ادب سے غیر سنجیدہ روش پر بات ہونا ضروری ہے اور جہاں تک صرف مغربی تکنیک کو اپنانے کی بات ہے تو عرض یہ ہے کہ مسائل حسیت اور احساس و شعور کا براہ راست تعلق تکنیک سے ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم مغرب سے تکنیک تو لے لیں مگر ہمارے مسائل حسیت اور احساس و شعور مشرقی رہیں۔ دوسری بات یہ کہ ادب انسان کے المیے سے بحث کرتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انسان نہ تو مغربی ہوتا ہے اور نہ مشرقی یہ تفریق خواہ ادب کی بنیاد پر ہو خواہ تکنیک کی بنیاد پر ہو خواہ مسائل حسیت اور احساس و شعور کی بنیاد پر ہو ہر صورت غیر عادلانہ ہے۔ اچھا ادب ان تمام تفاریق سے بالاتر ہو کر محض انسان کے المیے کو بیان کرنے کا نام ہے۔"

عکسِ فن

غزل

تیزی نہ رہی خوں میں کہ اب دل نہ رہا وہ
دل ہو بھی تو کیا مد مقابل نہ رہا وہ

کر لیتا میں کیا اس کا جو غفلت بھی وہ کرتا
پر میری طرف سے کبھی غافل نہ رہا وہ

اب بھی مری رفتار وہی ہے مگر اے عشق
یہ کون سی منزل ہے کہ منزل نہ رہا وہ

سیکھے نہ بدلتے ہوئے صحرا سے نئے ڈھنگ
کیوں قیس رہے وہ کہ جو محمل نہ رہا وہ

ہوتا کوئی ہم دونوں میں آساں تو تھی مشکل
میں خود بھی تو مشکل تھا سو مشکل نہ رہا وہ

خود میں بھی تو پاتا نہیں پہلا سا وہ کس بل
کیونکر کہوں اب عشق کے قابل نہ رہا وہ

اک تیرا حوالہ ہے جو ملتی ہے یہ توقیر
ہم لوگ تو شائستہ آداب نہیں ہیں

وضاحت نسیم

Wazahat Nasim
A-891, Block-H
North Nazimabad
Karachi-74700, Pakistan

وضاحت نسیم

کراچی

وضاحت نسیم کے لئے کسی نے اپنے مضمون میں حضرت داتا گنج بخش ؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "انہوں نے فرمایا تھا "صوفی اپنے اندر کی تجلی سے بنتا ہے۔ جسم کے اوپر پڑے ہوئے کمبل سے نہیں۔" اسی طرح وضاحت نسیم اپنے مزاج' عادت اور کردار میں اپنی ظاہری عمر' مرتبے اور اپنے عہد سے بہت بلند تر ہے۔ اس نے دکھاوے کے واسطے کوئی کمبل نہیں اوڑھ رکھا مگر عبادات' تقویٰ اور پرہیزگاری نے اسے ذہنی اور روحانی طور پر ہماری سطح سے برتر کر دیا ہے۔"

اور واقعی اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ وضاحت نے نہ صرف ذہنی اور روحانی سفر کی کئی منزلیں طے کی ہیں بلکہ اس نے اپنی شاعری کی مسافتوں میں بھی نئی زمین اور نئے آسمان تلاش کئے ہیں اور اپنے مشاہدے اور مطالعے کے در کھولے رکھے ہیں۔۔

بہت دنوں سے میرا دل کہیں نہیں لگتا
سو میری میز پہ اچھی کتاب رہنے دو

اور

بچھڑ جائے تو تہہ میں لے کے چھوڑے
سمندر کا بچھڑنا ہی بہت ہے

وضاحت نسیم کی اپنی ذات بھی سمندر کی مانند گہری ہے۔ اس کی کئی تہیں ہیں۔ ایم اے انہوں نے اردو ادب میں کیا اور رخ بینک کا کیا۔ ابتداءً ملازمت کی حبیب بینک سے کی اور

وضعدار اتنی ہیں کہ اسی پر قناعت کئے ہوئے ہیں لیکن ترقی کی کئی منزلیں طے کرنا نہیں بھولیں۔

17 جون 1956ء کو کراچی میں پیدا ہونے والی اس شاعرہ کا نام وضاحت نسیم ہے اور تخلص نسیم۔ اردو' انگریزی اور جاپانی زبانیں جانتی ہیں۔ جاپان فاؤنڈیشن ٹوکیو میں چھ ماہ جاپانی زبان پڑھی اور چند دن ٹوکیوڈائیگاک یونیورسٹی میں پڑھایا بھی۔ اسی وجہ سے غالباً" ہائیکو بڑے پیار سے لکھتی ہیں۔

شاعری کے علاوہ ان کی وابستگی مضمون نگاری سے بھی ہے۔ کلام افکار' سیپ' اوراق اور آہنگ میں شائع ہوتا ہے۔ پہلا مجموعہ کلام "خواب دریچے" شائع ہوچکا ہے اور دوسرا اشاعت کے مراحل میں ہے۔ غزل کو بہتر ذریعہء اظہار سمجھتی ہیں لیکن جب کوئی ایک خیال بڑی شدت کے ساتھ ان سے اظہار چاہتا ہے تو پھر نظم کا انتخاب کرتی ہیں۔ نثری نظم کی بھی مخالف نہیں کیونکہ ان کے بقول نثری نظم میں بہت اچھی موضوعاتی شاعری سامنے آئی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ نثری نظم کوئی اچھی صنف نہیں نامناسب ہے۔

نسیم کہتی ہیں اردو زبان جس طرح سے عالمی سطح پر پھیلتی جارہی ہے' اس ترقی کو دیکھتے ہوئے یقین سا ہوتا ہے کہ اس زبان سے محبت کرنے والے اور اس کی حفاظت کرنے والے لوگ بہت ہوں گے۔ (آمین) اس زبان کے مستقبل کو مخدوش کرنے والی طاقتیں بھی اپنا زور آزمارہی ہیں لیکن یہ ایک سعی رائیگاں ہے۔

مشاعروں کے ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ..... "آج کے دور میں مشاعروں نے کچھ عجیب سا رخ اختیار کرلیا ہے۔ اب تو مشاعروں کا بھی وہی حال ہوگیا ہے جو ہماری معاشرت کا حال ہے۔ سیاست نے ایسا زور پکڑ لیا ہے کہ لگتا ہے شاعر بھی بے بس ہوگئے ہیں۔ بہت بڑے پیمانے پر کئے جانے والے مشاعروں میں تو خاص طور پر منتظمین کی صوابدید پر شعراء کا انتخاب ہوتا ہے۔ ادب کی تخلیق میں تو مشاعروں کا اتنا کچھ حصہ نہیں ہے۔ البتہ مشاعروں کے انعقاد سے نئے ذہنوں تک یہ بات ضرور پہنچتی ہے کہ ادب بھی کوئی صنف ہے' جس میں لطیف احساسات کے ساتھ زندگی ہم کلام ہوتی ہے۔ ادب کی تخلیق میں تخلیقی نشستیں ہی بہتر کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ہلہ گلہ کرکے صحیح معنی میں ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔"

نسیم اس بات سے متفق نہیں کہ دور حاضر میں ادب کا تعلق عمل سے کٹ گیا ہے۔ وہ کہتی ہیں اس کے ثبوت میں وہ تخلیقات پیش کی جاسکتی ہیں جو پاکستان کے سیاسی عمائدین اور مجموعی طور پر پاکستان کی سیاست کو ہوجانے والے آشوب چشم کے باعث بالخصوص کراچی کے ادیبوں اور شاعروں نے تخلیق کیں۔ کیا ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات میں ان سنگین واقعات پر افسوس کا اظہار نہیں کیا جو کراچی اور دوسرے شہروں میں وقوع پذیر ہوتے

رہے۔ ہاں اس بات سے مجھے اتفاق ہے کہ ادب سے قاری کا رشتہ کمزور ہو گیا ہے مگر ادب بے اثر کبھی نہیں ہوا۔ قاری کے ادب سے بے خبر ہونے کی وجوہ روزمرہ کی مصروفیات، معاشی بدحالی، مہنگائی، ڈش اور وی سی آر ہیں۔ معاشی بدحالی اور رزق کی فراہمی کی جدوجہد نے انسان کو مصروف کردیا ہے پھر جہاں معاشی طور پر یکسوئی اور فراغت نظر آتی ہے، وہاں پر تعیش زندگی نے کتاب اور صاحب کتاب کی اہمیت بھلا دی ہے۔ ادب کو پر اثر بنانے کا کام بھی اب ہمارے میڈیا کو ہی ادا کرنا ہوگا۔ قاری میں ادب پڑھنے کی رغبت اب ہمارے اساتذہ کی بھی ذمہ داری ہے۔ تربیت گاہوں سے پڑھنے کے رجحان کو فروغ ملے گا تو بات بنے گی۔

آخری سوال کے جواب میں نسیم اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بولیں کہ ''مغربی رجحانات نے ہمارے معاشرے کو بنایا کم اور بگاڑا زیادہ ہے۔ مغربی ادب کی تکنیک سے ہمارے ادب نے بہت کچھ استفادہ کیا اور اپنے ادب میں اضافہ کیا ہے۔ اس تکنیک کو بنیاد بناتے ہوئے اگر برصغیر سے باہر اردو ادب لکھنے والوں نے اپنے مسائل سے چشم پوشی کی ہو تو میں نہیں کہہ سکتی۔ ورنہ بنیادی طور پر کوئی بھی تخلیق کار اپنے مسائل، حسیت اور احساس و شعور کو بھلا کر کچھ بھی تخلیق نہیں کرسکتا چاہے، اس کی تخلیق کی تکنیک اپنی ہو یا خارجی۔''

عکس فن

شاخ سبز کیلئے

فسردہ ساعت ہمارے حصے میں جب بھی آئی
تو ہم نے سوچا کہ وہ تو خوش ہے
جہاں کی رنگین وسعتوں میں
حیات افروز راحتوں میں
گلوں میں، رنگوں میں، تتلیوں میں
ہمارے دل سے دعا یہ نکلی
خدا اسے شادماں ہی رکھے
خدا کرے اب سے کوئی غم نہ چھو کے گزرے
ہمیشہ اس کی رو پہلی نیندوں میں
جگنوؤں جیسے خواب کھیلیں
اور اپنی تنہائی میں سمٹ کر
ہم اس دعا کا عذاب جھیلیں

خوشیوں سے کس نے بھر دیا دامن ترا وکیل
تھا یہ تو تار تار ۔ ابھی کل کی بات ہے

فقط وکیل انصاری

نیویارک

۲۹ جون ۱۹۹۷ء

Vakeel Ansari
76-55, 266th Street
New Hyde Park N.Y. 11040
U.S.A

وکیل انصاری

نیویارک

میں نے اکثر سوچا لوگ اپنا ملک' اپنا وطن چھوڑ کر پرائی سرزمین پر کیوں جا بستے ہیں۔ اس کے باوجود کہ میرے اپنے ایک بیٹے کی مثال میرے گھر میں موجود ہے کہ وہ ٹھیک 14/ اگست کے دن 1987ء میں پاکستان کی سرزمین کو سلام کر کے یہ کہہ کر گیا کہ "ملک ز خدا تنگ نیست۔ اب اپنا رزق کہیں اور تلاش کروں گا کہ یہاں سفارشوں نے مجھ پر روزی کے دروازے بند کر دیئے ہیں" اور میں نے آنسوؤں اور دعاؤں کی چھاؤں میں اسے رخصت کیا تھا چنانچہ سخن ور حصہ دوم اور سوم کے سوالنامہ میں ایک سوال یہ بھی رہا کہ "حصول تعلیم و ملازمت کی تفصیل لکھیے" اور اس سوال کے جواب میں بیرون ملک جا بسنے والوں کی کہانیاں سخن ور دوم میں موجود ہیں۔

سخن ور سوم میں اس سوال کا جواب وکیل انصاری کے تعارف میں ملاحظہ ہو کہ روزی روٹی کے لئے ہمارے نوجوانوں کو کیسے کیسے مقامات آہ و فغاں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں: "میٹرک کے نتائج آنے سے پہلے نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا مگر نوکری تھی کہ مل کر نہیں دیتی تھی۔ دور دراز جا کر نوکری تلاش کرنا شروع کر دی۔ ایک دن محلے کے ایک صاحب کی موٹر سائیکل لے کر انٹرویو دینے نکلا۔ کم عمری اور ناتجربہ کاری تھی۔ ایک موڑ پر پولیس نے پکڑ لیا۔ لائسنس پاس نہ تھا' لہٰذا موٹر سائیکل سمیت تھانے پہنچا دیا گیا۔ اب پولیس افسر صاحب نے موٹر سائیکل کی چوری کا الزام لگا دیا۔ بہت کوشش کی کہ وہ میرا سچ سنیں مگر وہ ہمارے "وطن کی پولیس" تھی۔ پھر چند بزرگوں کی مداخلت سے آٹھ گھنٹے بعد تھانے سے رخصتی ہوئی۔ اس دن نوکری ملنے کی پوری پوری امید تھی مگر وہ پولیس اور تھانے کی نذر

ہو گئی۔" وکیل انصاری نے اس طرح سکون کا لمبا سانس لیا جیسے ابھی ابھی ہماری پولیس کے چنگل سے رہائی پاکر آئے ہوں۔ پھر انہوں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میرا پورا نام قاضی محمد وکیل احمد انصاری اور تخلص وکیل ہے۔ 29 / اکتوبر 1952 کو کراچی میں پیدا ہوا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول ناظم آباد سے میٹرک کا امتحان دیا۔ اسلامیہ کالج کی شام کی کلاسز سے بی اے کیا اور ایل ایل بی کے پہلے سال ہی میں کینیڈا جانے کا چانس مل گیا۔ ویسے میٹرک کا نتیجہ آنے سے پہلے قمر ہاؤس کراچی میں واقع ایک سوئس کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی مگر 1971ء کی جنگ کے بعد کمپنی بند ہونے لگی اور کراچی کے سیاسی حالات روز بروز ابتر ہونے لگے تو میں نے یہاں سے چلا جانا بہتر جانا۔ ٹورنٹو کینیڈا سے ملازمت کے ساتھ ساتھ آرکیٹکچول انجینئرنگ اور پھر ڈیرائٹ امریکہ سے سول انجینئرنگ مکمل کی۔ 1977ء میں پاکستان واپس آیا مگر ملازمت حاصل کرنے سے محروم رہا چنانچہ واپس امریکہ چلا گیا۔ 1979ء سے نیویارک کی مشہور کمپنی The Allertion 'Co میں بحیثیت ڈائریکٹر کام کر رہا ہوں۔"

وکیل انصاری کے آباو اجداد تغلق کی دعوت پر ہرات سے ہندوستان آئے اور بلند شہر کے قصابات میں قاضی مقرر کئے گئے۔ دادا مرحوم قاضی محمد عزیز الدین انصاری رخشاں اور ان کے چھوٹے بھائی قاضی محمد ریاض الدین انصاری ریاض ملازمت کے سلسلے میں بلند شہر سے ریاست گوالیار منتقل ہو گئے۔ وہاں "بزم ادب" نامی تنظیم کے تحت آل انڈیا مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے۔ وکیل انصاری نے کراچی میں بھی اپنے بھائی کو ساقی فاروقی اور اطہر نفیس جیسے شعراء کے درمیان پایا اور اس ماحول سے بہت کچھ سیکھا۔ اسلامیہ کالج میں بزم ادب کے سیکریٹری کی حیثیت سے ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یوں شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔

وکیل انصاری خود نیویارک میں اردو کی بقا کے لئے سرگرم عمل ہیں چنانچہ اردو کے مستقبل سے پرامید ہیں اور کہتے ہیں کہ "اردو کا مستقبل تابناک ہے۔ اردو برصغیر کی سب سے بڑی زبان ہے اور رابطے کی زبان ہے۔ گذشتہ ہفتے میرا پشاور سے آگے آزاد علاقے میں جانا ہوا، اس بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ لوگ وہاں بھی اردو لکھتے اور پڑھتے ہیں اور بلوچستان کے دیہی علاقوں میں اردو لکھی اور بولی جاتی ہے۔ پنجاب اور سندھ تو ہمیشہ سے اردو کی ترقی و ترویج میں آگے آگے ہیں۔ ہندوستان میں اردو رسم الخط ضرور خطرے میں ہے مگر اردو بولی جارہی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں اردو آج بھی رابطے کی زبان ہے۔ جنوبی افریقہ، چونی میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پھر اس بات کو فراموش نہ کریں کہ جس دیئے میں ہوا سے مقابلہ کرنے کی طاقت ہوگی، وہ دیا سروائیو کرے گا۔ اردو کا مقابلہ دنیا کی دوسری بڑی زبانوں سے ہے اور اگر ہم نے اردو کو جدید تقاضوں کے مطابق نہ ڈھالا تو شاید یہ اردو کبھی قصہ ء

پارینہ بن کر رہ جائے گی۔"

وکیل انصاری کے لئے شاعری میں نظم بہتر طور پر اظہار خیال کا ذریعہ ہے۔ مگر موڈ ہو تو غزل بھی ان کے لئے اظہار خیال کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ نثری نظم کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ "اگر آپ موثر طور پر نثری نظم کہنے پر عبور رکھتے ہوں اور اظہار خیال موثر طور پر نثری نظم میں ہی کر سکتے ہیں تو ضرور کریں۔ ادب کی تخلیق میں مشاعرے بھی اقراء ترکیبی کا اہم حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مراحل ہیں گو کہ مشاعرے آج کل سٹیج پر فارمنس بننے کی وجہ سے اپنی افادیت کھو رہے ہیں۔ مگر کہنے اور سننے اور خیالات کا تبادلہ کرنے کے لئے آج بھی موثر ذریعہ ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسری تخلیقات کو بھی غیر موثر نہیں کہا جاسکتا ہے۔"

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "ادب تو کسی بھی زمانے میں بے اثر چیز نہیں بن سکتا ہے۔ مگر معاشی ترازو میں تولنے میں شاید قاری سے اس کا رشتہ کمزور تر نظر آنا حقیقت ہے۔ آج کا قاری اپنے ذاتی مسائل حل کرنے میں منہمک ہے۔ اپنے خاندان کی کفالت کے ساتھ ساتھ اب اس کو خاندان کے تحفظ کا خیال بھی کرنا پڑتا ہے۔ معاشی حالات کو قابو میں کیا جائے یا سیاسی حالات سے نبرد آزما ہوا جائے۔ اسی تگ و دو میں قاری صبح و شام بسر کر رہا ہے۔ بڑے شہروں کی حالت اور زیادہ ابتر ہے۔ کراچی جیسے سوا کروڑ آبادی والے شہر میں ایک شاعر پانچ سو کتابیں نہیں بیچ پاتا ہے۔ قاری ادب سے رابطہ اس وقت کرے گا' جب وہ معاشی اور سیاسی حالات سے مطمئن ہو گا۔ ترجیحات کی بات ہے۔ پہلے پیٹ بھرنا ہے پھر دوسری باتیں ہیں۔"

آخری سوال کے جواب میں وکیل انصاری کہتے ہیں کہ "سینئر ادیبوں کا احترام اپنی جگہ مگر تحقیق اپنی جگہ۔ کہتے ہیں کہ مغرب سے ہمیں تکنیک خریدنا چاہئے مگر اور مغربی رجحانات کی درآمد پر پابندی ہونا چاہئے تو صاحب مغرب کی ثقافت اور تکنیک تو ایک ساتھ ہی آتی ہیں۔ یہ کیا بات کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو۔ آخر کب تک ہم کبوتر کی طرح اپنی آنکھیں بند کر کے خطرہ ٹل جانے کا مژدہ سناتے رہیں گے۔ حقیقت سے فرار کب تک؟ کوشش کیجئے کہ ہر برائی میں اچھائی کا پہلو نکال لیں۔ اب کوئی چیز بھی بیرونی نہیں رہی ہے۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے آپ کے ڈرائنگ روم پر قبضہ کر لیا ہے۔ آپ کے پاس زیادہ چوائس نہیں ہے۔ مغرب اتنا برا بھی نہیں ہے جتنا کہ آپ ٹی وی پر دیکھ کر اندازہ لگاتے ہیں اور یہ کہنا کہ بیرونی فیشن کی پیروی کر کے اچھا ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا ہے تو میں یہی کہوں گا کہ میر امن دہلوی اور حضرت امیر خسروؒ کو آپ پہلے ہی چھوڑ چکے ہیں' لہٰذا ہر اس ذرائع سے سیکھیے جو آپ سے بہترین اور پھر اس کو آپ ماڈل میں ڈھال لینے کی کوشش کریں۔"

وکیل انصاری نے شاعری کے علاوہ ہلکے پھلکے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اب گذشتہ پانچ سال سے صحافتی دنیا میں بحیثیت تجزیہ نگار بین الاقوامی تعلقات عامہ پر ایک ہفتہ وار کالم لکھ رہے ہیں۔

کراچی جل رہا ہے

چاروں طرف ہے شور، لگی ہے غضب کی آگ
یہ آگ جس کو کہئے حسب اور نسب کی آگ
پانی کی طرح بہتا ہے انسان کا لہو
یعنی کہ ایک قوم کے ارمان کا لہو
بچے، جوان، بوڑھے، خواتین سب اسیر
اپنے گھروں میں بند ہیں بے دست و پا فقیر
کرفیو کے دھندلکوں میں سسکتے ہوئے یہ لوگ
پابندیوں کے سائے میں پلتے ہوئے یہ لوگ
آلام عسکری سے کچلتے ہوئے یہ لوگ
ہاتھوں کو اپنے سوگ میں ملتے ہوئے یہ لوگ
گویا ہجوم غم میں پگھلتے ہوئے یہ لوگ
سورج کی طرح شام کو ڈھلتے ہوئے یہ لوگ
کیا چاہتا ہے ان کا ابلتا ہوا لہو
ہر طاق کے چراغ میں جلتا ہوا لہو
بے چین ہے سماج بہت بے قرار ہے
اک معجزے کا شاید اسے انتظار ہے
اور معجزہ ہے وقت مناسب کا منتظر
وقت مناسب آئے گا شداد کے لئے
چیخے گا ظلم رحم کی امداد کے لئے
بس اتنا یاد رکھنا ہے پیغام وقت کا
اہل زبان و اہل قلم جاگتے رہو
حق، خونِ دل سے کرکے رقم جاگتے رہو
خود داریوں کا رکھو بھرم جاگتے رہو
تا صبح تم کو رب کی قسم جاگتے رہو

عکس فن

جو مرے وجدان پر اترا، وہی لکھتا رہا
میں ہواؤں پر سکوتِ سرمدی لکھتا رہا

ہلال نقوی

Dr. Hilal Naqvi
1094/9, Dastagir Society,
Federal B Area
Karachi, Pakistan.

ڈاکٹر سید ہلال نقوی

کراچی

یہ 1965ء کی بات ہے میں نے اپنے تین بچوں کی پرورش کے ساتھ میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ میٹرک میں نے پی آئی بی کالونی کے نیشنل اسکول سے کیا تھا۔ اس وقت کی بچھڑی سہیلیاں قیصر، شہناز اور صوفیہ سے اب ملاقات ہوئی۔ صوفیہ صدر میں ملیں۔ شہناز اور قیصر نے "جنگ" اخبار میں میری آمد کی خبر پڑھ کر مجھ سے فون پر رابطہ کیا اور بہت پیار اور امنگوں سے ملنے چلی آئیں۔ میٹرک کے بعد جہاں پرانے ساتھی بچھڑے، وہاں کچھ نئے ساتھی بھی ملے، ان میں ڈاکٹر ہلال نقوی ہیں اور ولی رضوی۔ ولی رضوی روزنامہ "امن" میں صحافی ہیں۔ ہلال نے پی ایچ ڈی کرلیا اور تدریسی شعبہ اختیار کیا۔ میرے اور ہلال کے مشترکہ اور بہت چہیتے پروفیسر مجتبیٰ حسین (مرحوم) تھے۔ میں نے سراج الدولہ کالج میں ارادتاً" داخلہ لیا تھا۔ ہوا یوں کہ میں اپنے من پسند مضامین کی تلاش میں مختلف کالجوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ سراج الدولہ میں میرا پہلا سامنا مجتبیٰ صاحب سے ہوا۔ میں نے پوچھا جناب یہاں کا یونیفارم کیسا ہے؟ (کیونکہ لڑکیوں کے کالجوں میں یونیفارم ہوتا تھا) مجتبیٰ صاحب نے میری جانب غور سے دیکھا۔ ابرو چڑھائے اور ذرا سرد لہجے میں بولے۔ "یہاں یونیفارم نہیں ہوتا۔" ان کے ادیب ہونے کا یہ اظہار، یہ انداز مجھے چپکے سے کہہ گیا۔ میں ان سے ہی بہت کچھ سیکھوں گی۔ چنانچہ میں نے سراج الدولہ کالج میں داخلہ لے لیا۔

پھر وہیں مجھے ہلال نقوی ملے۔ ہم نے چار سال ایک ہی کالج میں گزارے اور ہماری قدر مشترک ادبی و صحافتی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ ہمارے مجتبیٰ صاحب بھی تھے، جن سے مجھے بے حد محبت تھی۔ جب بھی تھی اور اب بھی ہے اور ہلال کو بھی مجھ سے کم نہیں۔ اب جب

میں نے سخن ور حصہ سوم کے لئے ہلال کو سوالنامہ تھمایا تو بہت سی سنہری روپہلی یادیں اجاگر ہو گئیں۔ ہم گریجویشن کے بعد کم کم ہی ملے مگر مجھے ہلال کی ادبی سرگرمیوں کی خبریں تو لاس اینجلس میں بھی ملتی رہیں اور اب یہ دیکھ کر مجھے حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی کہ ہلال نے ادب کی دنیا میں اپنا ایک سنگ میل نصب کردیا۔ انہوں نے اپنی ایک الگ راہ اپنائی۔ ایک ایسی راہ جو عام نہیں اور جس پر سنگ ریزے بھی بکھرے ہیں مگر اس پر عزم لڑکے نے ان سنگ ریزوں کو پھول کی پتیاں بنالیا۔ ہلال کی تصانیف' تالیف مقالے اور مضامین بے شمار ہیں۔ سہ ماہی رسالہ "رثائی ادب" کے مدیر بھی ہیں۔ جی چاہے ایسے علم دوست شخص کو پلکوں پر بٹھایا جائے اور نظر بد سے بچانے کے لئے آنکھوں میں چھپا لیا جائے لیکن پھر ہلال کو آپ سے متعارف کیسے کراؤں گی۔۔۔۔ تو آیئے ہلال سے ملیں۔

"ہلال اپنے بارے میں ہمیں بتائیں' ذرا آرام سے' ذرا تفصیل سے۔" "جی سلطانہ مہر میرا پورا نام سید ہلال رضا نقوی ہے۔ تخلص ہلال ہی کرتا ہوں۔ میرے والدین کا تعلق یوپی کے معروف خان زادے سادات امروہہ سے ہے۔ امروہہ مصوروں' ادیبوں' شاعروں' فنکاروں اور تخلیق کاروں کے حوالے سے ہر جگہ جانا جاتا ہے۔"

میرے والدین ہجرت کرکے 1947ء ہی میں پاکستان آگئے۔ میرے والد G.H.Q.DEHLI میں تھے۔ تقسیم کے بعد G.H.Q. PAKISTAN کے لئے انہیں راولپنڈی بھیجا گیا۔ میرے والد 20 سال تک راولپنڈی میں رہے۔ 1953ء میں 18 مارچ) راولپنڈی ہی میں میری پیدائش ہوئی۔ میرے والد کثیر الاولاد آدمی ہیں۔ ہم 14 بہن بھائی تھے' 9 بقید حیات ہیں' چار بھائی پانچ بہنیں۔ ہاں بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔

میرے والد انتہائی دیانت دار' جفاکش' دیندار' شریف النفس اور منضبط آدمی ہیں۔ بچوں کی تعلیم کی خاطر انہوں نے میری والدہ اور اپنی ساری اولاد کو کراچی بھیج دیا۔ اس وقت پنجاب کے مقابلے میں کراچی میں تعلیمی رجحانات زیادہ تھے۔ میں نے کراچی میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ میٹرک کے بعد 1965ء میں سراج الدولہ کالج کراچی میں داخلہ لیا۔ یہ کالج تحریک پاکستان کے ایک سنجیدہ بنیادی کارکن راجہ صاحب محمود نے قائم کیا تھا۔ یہاں اساتذہ کا ایک ایسا علمی حلقہ ہمیں میسر آیا' جس نے طلباء کو قلم اور کتاب کی حرمت عطا کی۔ مولانا جواد الصفو' پروفیسر امیر امام' پروفیسر یحییٰ سلام اللہ' ڈاکٹر صغریٰ بیگم اور سب سے بڑھ کر (میرے نزدیک) پروفیسر مجتبیٰ حسین۔ یہی وہ شخصیت تھی' جس نے پہلی بار ذہن میں شعرو ادب کی کھڑکیاں کھولیں۔ اس کالج کے عقب میں کچھ فرلانگ پر حضرت جوش ملیح آبادی کا دولت کدہ تھا۔ اکثر پروفیسر مجتبیٰ حسین کے ساتھ وہاں جانا ہوتا اور یوں بہت کم عمری میں مجھے ایک اہم نقاد اور ایک اہم ترین شاعر کے قریب رہنے کا موقع ملا۔

یہاں بہت اچھے فعال اور ذہین طلباء و طالبات بھی تھے، جنھوں نے کالج کی تہذیبی و ادبی سرگرمیوں کو ایک قندیل کی طرح روشن رکھا، ان میں سلطانہ مہر، اقبال فریدی، ولی رضوی، انور سعید اور ایسے دیگر بہت سے نام ہیں جو اب ایک شخصیت کے طور پر اپنی مرکزیت رکھتے ہیں اس کالج میں میں نے ایک دیواری اخبار "مہر نیم روز" کا اجراء کیا تھا۔ جوش اس کے سرپرست تھے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین اور رئیس علوی صدر اور میں اس دیواری ادبی اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ اقبال حسین حیدری اور سطوت حسین اسے انتہائی ذوق و شوق سے لکھتے تھے اور طلباء پڑھتے تھے۔ ہر پندرہ دن بعد ایک نیا دیواری اخبار کھڑکی کے فریم میں لگا دیا جاتا تھا۔ کالج کے پرنسپل میجر تصویر حسین نقوی کی پذیرائی سے اخبار 1969ء تک جاری رہا۔ 1969ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد جامعہ کراچی سے میں نے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ 1974ء میں میری پہلی پوسٹنگ اردو کے لیکچرر کے طور پر سراج الدولہ کالج ہی میں ہوئی۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین صدر شعبہ اردو کے طور پر جامعہ بلوچستان جا چکے تھے لیکن ان سے ایک ایسا تعلق خاطر جس میں ادبی رشتہ سب سے مقدم تھا قائم رہا۔

مجھے پڑھاتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ کئی جگہ تبادلہ ہوا، آجکل گورنمنٹ کالج گلشن اقبال میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر ہوں۔

میں ایک ایسے ادبی ماحول میں رہا کہ مجھے تمام اصناف کے ساتھ ساتھ مرثیے سے گہرا شغف ہو گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس وقت پاکستان اور ہندوستان کے انتہائی مرکزی افراد میں میرا نام اس حوالے سے لیا جاتا ہے۔

مرثیے کے متعلق میرا بنیادی شعور یہ ہے کہ غزل اور نظم کی طرح مرثیہ بھی ایک شعری صنف ہے۔ اسے تنگ نظر نقادوں اور جذباتی عقیدہ پرستوں نے مذہبی حدود میں قید کر دیا ہے۔ میرا پورا ادبی جہاد یہی ہے کہ مرثیہ سراپا ادبی صنف ہے۔ آپ میرا مرثیے کا مجموعہ "اذان قتل" دیکھئے اور اس پر جوش، جمیل الدین عالی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ممتاز حسین، ڈاکٹر علی صدیقی، کیفی اعظمی کی آراء دیکھئے، آپ خود اندازہ کر سکیں گی۔ میرا ایم ڈی کا موضوع بھی "بیسویں صدی اور جدید مرثیہ" تھا۔ 1985ء میں مجھے کراچی یونیورسٹی سے اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔

شاعری میں غزل، نظم اور مرثیے کے علاوہ سنجیدہ قسم کے تحقیقی مراحل، بہت واضح اور تہذیبی و ادبی نوعیت کی تنقید میرے شعبے ہیں۔ شاعری کا ہر مکتب خیال، ایک اچھے شاعر کے ذہن کو مختلف وقتوں میں چھوتا رہتا ہے لیکن تخلیق کار کی وہ ذہنی ساخت جو نوعمری ہی سے قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے احساس اور اس کے خیال کی لاش کو محض مخصوص نظریوں اور منتخب شخصیات کی طرف محسوس اور غیر محسوس دونوں حوالوں سے پہچانی جاتی ہے۔ میں نظم

کے شعراء سے ہمیشہ متاثر ہوا۔ نظیر اکبر آبادی' انیس' اقبال' جوش اور علامہ جمیل مظہری' جنہوں نے متاثر کیا۔ غزل گو شعراء میں غالب کی قوت متخیلہ اور ان کے خیال کی کاٹ بھی متاثر کرتی رہی۔

ہم قلم' فنون' صریر' الفاظ اور دوسرے رسائل میں میری تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ زندگی میں کئی اہم موڑ آتے ہیں اور بعض اوقات وہ زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں۔ ہلال مجھے بتارہے تھے کہ کالج کے زمانے میں انہیں ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ محبت ایک عام انسانی جذبہ ہے لیکن ان کے لئے یہ جذبہ خاص ہوگیا کہ اس نے ہلال کے احساسات کی پوری بساط الٹ دی۔ ہلال شعر کہنے لگے۔ انسانیت سے ان کی محبت بڑھ گئی۔ پھول' خوشبو اور رنگوں کی طرح جینے کی تمنا بھی بڑھ گئی۔ یہ تھا ایک صحت مند ذہن کے سوچنے اور محبت کو برتنے کا انداز۔

اردو کے مستقبل کے حوالے سے گفتگو ہوئی تو ہلال نے کہا۔۔۔۔ "اردو کا مستقبل بہت روشن ہے جو لوگ زبانوں کی تاریخی نشوونما اور انسانی رشتوں کے درمیان اس کی فیض رسانی سے آگاہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زبانوں کے خلاف سیاسی مصلحتوں کے طوفان بظاہر بہت شورش رکھتے ہیں لیکن ان میں جان نہیں ہوتی۔ پاکستان میں چند نادانوں نے اسے بلا وجہ سیاسی جواز کے تہہ خانوں میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔"

یہاں لوگ یہ بات بھول گئے ہیں کہ پنجابی' سندھی' بلوچی' سرائیکی' ملتانی یا پشتو کا ارتقاء علاقائی سطح پر اس وقت زیادہ ہوگا' جب قومی سطح پر اردو کو کشادگی عطا کریں گے۔ ہمارے ادیب و شاعر اردو کے خیر خواہ ہیں۔ اردو سب کی زبان ہے۔ اسے مہاجروں کی زبان کہنا زیادتی ہے۔ اقبال سے فیض و قاسمی تک سب نے اردو کے لئے اپنا لہو حرفوں میں سمویا ہے۔ یہ تینوں شاعر پنجابی ہیں مگر اردو میں ان کی خدمات کون بھلائے گا۔ جوش ملیح آبادی کے آباو اجداد پٹھان تھے۔ اردو پر لکھنؤ' دہلی' امروہہ یا بہار کا ٹھیکہ اردو کی روانی' سلاست' تیزی اور پیچ و خم باد صبا کی طرح ہیں اور باد صبا کو کون قید کرسکتا ہے۔

ہلال کہتے ہیں۔۔۔۔ "ہر صنف اپنی جگہ اظہار خیال کا موثر ذریعہ ہے۔ آج ہر احساس' ہر جذبہ' ہر رویہ اور ہر فکری رو ہر صنف میں دیکھی جاسکتی ہے بقول مولانا شبلی' میر انیس نے تو مرثیے میں غزل اور دوسری تمام اصناف کو سمو دیا ہے۔ اس کا تعلق تخلیقی رویے سے بھی ہوگا کہ کس خیال کے لئے کس صنف کا پیمانہ موزوں ہوگا۔ اسے کوئی فارمولا نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر آپ کہیں کہ غزل اظہار خیال کا سب سے بہتر ذریعہ ہے تو غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر نے "تنگنائے غزل" کہہ کر اپنی بے بسی کا اظہار کردیا ہے اور نثری نظم کے متعلق میں کہوں گا کہ جانے کیوں یہ گمان ہوگیا ہے کہ اس کے کچھ اصول نہیں ہیں' اس کی

بھی کچھ راہیں اور کچھ خطوط ہیں۔ جنگل کی بے ترتیبی میں بھی ایک غیر محسوس ترتیب ہوتی ہے۔ یہ صاحب نظر ہی سمجھ سکتا کہ وہ ترتیب کیا ہے۔ اس کے باضابطہ اصول نہ سہی لیکن اسے بے گھوڑے کی طرح چھوڑنا بھی نہیں چاہئے۔"

مشاعروں کے بارے میں بڑے تاسف سے بولے..... "پاکستان اور ہندوستان میں مشاعروں کا کردار گذشتہ کئی برسوں سے انتہائی نچلے درجے کا ہے۔ لوگوں نے مشاعرہ گاہ کو Picnic Point بنالیا ہے۔ سنجیدہ اور اچھے تخلیق کاروں پر ہوٹنگ کی جاتی ہے۔ "گولیوں" کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ترنم سے غزل پڑھنا کوئی معیوب نہیں۔ شعر کا تو تعلق ہی لحن اور موسیقی سے ہے مگر ہمارے ہاں معاملہ ہی دوسرا ہے بقول جوش' شاعر غزل گو نہیں رہے۔ غزل گا ہوگئے ہیں۔ تخلیق نشستیں ارتقائے سخن کے لئے انتہائی صحت مند کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ان تخلیقی نشستوں کو ٹیلی ویژن جیسے طاقت ور میڈیا کے ذریعے عوام الناس کے لئے ادبی تربیت کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔"

آج کے ادب کے بارے میں ہلال نقوی کا خیال ہے کہ "مادیت کی شکار نسل انسانی ضرورتوں میں ایسی جکڑ گئی ہے کہ انسانی رشتوں کی صداقت اور انسانیت کے منصب اعلیٰ سے آج کے انسان کا رشتہ کٹ گیا ہے۔ ادب کیونکہ انسانیت ہی کا مظہر ہے' اس لئے اس فضا میں یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ ادب سے قاری کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ اس کے زیر اثر یہ رائے بھی قائم کرلی گئی کہ ادب ایک بے اثر چیز بن کر رہ گیا ہے۔ سچائی' دیانت' حرف حق کی جسارت' تمناؤں کا اظہار اور محبت کی توانائی تو ایک ایسی روشنی ہے جو ہر عہد اور ہر صدی میں اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دیکھنے والے اندھیروں کو زیادہ پسند کرنے لگیں۔ ادب سے قاری کا رشتہ کمزور نہیں پڑا۔ قاری خود اپنی جگہ ذہن کی کمزوری کا شکار ہوگیا ہے۔"

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا..... "اچھا ادب اچھی انسانی اقدار ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ انسانی قدریں مغرب سے بھی لئے جاسکتے ہیں۔ مغرب کے رجحانات اور ان کے ادب کی پیروی اگر بقول آپ کے "ادبی فیشن" کے طور پر قبول کی جاتی رہی تو یقیناً" یہ فیشن کے گزر جانے کی طرح خود بھی انسانی منظرنامے سے ہٹتی چلی جائے گی۔ تخلیق کار وہی لکھتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے' وہ جس فضا میں رہے گا وہیں کی آکسیجن سے زندہ رہے گا۔ اگر آکسیجن برآمد کی گئی کہ تو اسے مصنوعی طریقوں سے پھیھڑوں تک پہنچانا ہوگا۔ ظاہر ہے اپنے مسائل' اپنا احساس و شعور' اپنا وجدان اور اپنی حسیت ہی تخلیق کو لباس عطا کرے گی۔ تکنیک کے لئے مظاہر کہیں سے بھی منتخب کئے جاسکتے ہیں۔"

عکسِ فن

قطعات

فن میں ہلال فکر کی حد چاہتا ہوں میں
قدآوروں کے بیچ میں قد چاہتا ہوں میں
مجھ کو کمال عجز سے لکھنا ہے مرثیہ
اے خالقِ انیس مدد چاہتا ہوں میں

دائم ہے یہی طرزِ بیانِ مقتل
ہے خون کا لہجہ یہ زبانِ مقتل
جو آج بھی انساں کو جگا دیتی ہے
ہے نوکِ سناں پر وہ اذانِ مقتل

ہر دور میں انساں کا حشم ہو جائے
مینارہ ء تہذیبِ امم ہو جائے
لکھے گا وہی ہاتھ وفا کی تاریخ
جو ہاتھ قلم ہوکے علم ہو جائے

کچھ دیر ابھی رات کے آنے میں تھی باقی
ٹھوکر لگی سورج کو اندھیرے میں گرا دن

[illegible]
(احمد ہمیش)

Ahmad Hamesh
2-J, 8/6
Urooj Building Clinic
Nazimabad
Karachi, Pakistan

احمد ہمیش

کراچی

میں کُچھ بھی لکھنے سے پہلے کاغذ کی پیشانی پر پہلے بسم اللہ لکھتی ہوں اور لکھنے پر ہی منحصر نہیں، میں اپنے سارے کام اللہ کے بابرکت نام سے شروع کرتی ہوں اور اس میں برکت پاتی ہوں۔ یہ برکت مجھے مسرتیں دیتی ہے۔ ان مسرتوں کا ادراک بھی میں ہی کرسکتی ہوں کیونکہ ممکن ہے۔ وہ دوسروں کے لئے وہ معنی نہ رکھتی ہوں اور یہ مسرت مجھے اس دن بھی حاصل ہوئی جب.........

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سخن ور حصہ سوم کے لئے جو فہرست میرے پاس تھی؛ ان میں بہت سے شعراء و شاعرات کا نام نہ تھا لیکن ان کے تعارف کسی وسیلے سے مجھے مل گئے لیکن جن شعراء و شاعرات کے نام میری فہرست میں تھے، ان میں سے کچھ تک میں نہ پہنچ سکی۔ میرا سوالنامہ ان تک ضرور پہنچا لیکن ان کی مصروفیت یا بے توجہی سے جواب مجھے نہ ملا چنانچہ وہ اس تذکرے میں شامل نہ ہوپائے۔ مجھے اس کا افسوس بھی ہے لیکن متبادل خوشی بھی مجھے ملی، جب میں نے چند بھولے بسرے لوگوں کو پالیا۔ وہ لوگ جو ادب کا سرمایہ ہیں، جو حرف کی حرمت و آبرو ہیں اور حرف سے حاصل ہونے والی مسرت کے ضامن بھی۔

احمد ہمیش بھی انہی میں سے ہیں۔ احمد ہمیش بھلانے والی شخصیت نہیں مگر میری کوتاہی کی وجہ سے وہ مجھے یاد نہ آئے اور جب انور جبیں قریشی کی زبان سے احمد ہمیش کا نام سنا تو سچ پچ جیسے مجھے افسوس ہوا۔ میں اپنے آپ سے نادم تھی کہ میں احمد ہمیش کو کیسے بھولی۔ پھر جب تک میں حبیب بینک کے ایک کمرے میں شمس وارثی صاحب کے ساتھ انور جبیں قریشی سے باتیں کرتی رہی تو وہ احمد ہمیش کی باتیں تھیں۔ ان سے فون نمبر لے کر رابطہ کیا، ملاقاتیں

ہوئیں، باتیں ہوئیں اور میں نے محسوس کیا کہ اگر احمد ہمیش سے ملاقات نہ ہو پاتی تو علم کے حصول کے حوالے سے لاس اینجلس سے کراچی تک میرا یہ سفر تشنہ رہتا۔ (سچ کے اظہار میں، میں نے کبھی ندامت محسوس نہ کی)۔

میں "سخن ور حصہ سوم" کے سلسلے میں احمد ہمیش سے باتیں کر رہی تھی۔ انہی لمحوں میں ایک پیاری سی لڑکی کافی بنا کر لائی۔ احمد نے تعارف کرایا۔ یہ میری بیٹی انجلا ہمیش ہے۔ میں نے پوچھا آپ نے بچی کا نام انجلا کیوں رکھا؟ بظاہر اس سوال کی کوئی تک بھی نہیں کہ کسی سے پوچھا جائے کہ آپ نے اپنا یا کسی اپنے کا یہ نام کیوں رکھا لیکن میرے صحافیانہ مزاج کا تجسس مجھ سے بعض وقت اسی نوعیت کے سوال کرواتا ہے اور مجھے مایوسی نہیں ہوتی چنانچہ احمد ہمیش کا جواب میری معلومات میں اضافہ ہی کر گیا اور یہ احمد ہمیش کی زندگی کا ایک اہم واقعہ بھی ٹھہرا۔

انہوں نے بتایا "بیٹی کی پیدائش نے میری زندگی میں بڑی تبدیلیاں پیدا کیں۔ میں اپنی بیٹی کا ایک منفرد نام رکھنا چاہتا تھا۔ اسی زمانے میں، میں مولانا ابوالکلام آزاد کی انگریزی میں لکھی قرآن پاک سے سورہ فاتحہ کی تفسیر پڑھ رہا تھا، اس میں عربی لفظ انجلا (اس میں لا کو کھینچ کر پڑھنا ہے) کے معنی ہیں باطن کی روشنی (Enlighten) میں نے عربی کی لغت کھنگالی اور ماہرین سے بھی رجوع کیا۔ پھر عربی کے عالم جناب محسن نقوی سے تصدیق کرنے کے بعد میں نے بیٹی کا نام انجلا رکھا۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں، یہ کرسچن نام ہے مگر ایسا نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا کہ کیا آپ عورتوں کی آزادی کے خلاف ہیں کیونکہ 1991ء کے "تشکیل" پہلے شمارے میں آپ کے ایک اداریہ کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے؟ احمد ہمیش نے کہا۔ بات اس طرح نہیں ہے۔ میرے خاندان میں کئی عورتیں استحصالی قوتوں کا شکار رہی ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بیٹی بھی انہی حالات سے دوچار ہو، لہٰذا میں نے اسے تعلیم دلوائی اور اپنے جریدے سہ ماہی "تشکیل" کی ادارت سونپی تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور بیٹی نے مجھے مایوس نہیں کیا لیکن کوئی آدھی ادھوری عورت مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے کہا ہے کہ کئی شاعر اور افسانہ نگار عورتیں مرد سے مستعار لی ہوئی مردانگی کا بھونڈا مظاہرہ کرتی ہیں۔ عورتوں کی آزادی اور حقوق کی بیشتر چیمپئن عورتیں بشمول کشور ناہید دراصل اپنا سوشل اسٹیٹس بڑھانے اور انجوائے کرنے کے لئے یہ ناٹک کرتی ہیں۔ عام عورت کے دکھ درد اور مصائب سے انہیں کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہوتی۔ ایسی عورتیں عورتوں کے حقوق کی آڑ میں مغربی عورتوں کی طرح حقوق زوجیت ادا کئے بغیر ہی مرد سے تمام عمر "ایلی مونی" وصول کرنا چاہتی ہیں۔ ایسی عورتیں میری نظر میں ادھوری عورتیں ہیں، جن کا کوئی مرتبہ نہیں۔ اس کا ذکر میں نے اپنے اداریہ میں کیا تھا۔ ایسی عورتیں تصور وفا سے

عاری محض جسمانی آزادی کی دلدادہ ہیں جبکہ میں عورت کی روحانی آزادی کا قائل ہوں۔ میں نے اپنی پوری زندگی اپنی مرحومہ ماں کی محبت کے روحانی حصار میں گزاری ہے۔ کوئی عورت اگر روحانی آزادی کے مرتبہ کے مصداق ہو تو میں نہ صرف اس کا مرتبہ تسلیم کروں گا بلکہ اس سے ہار جانے میں بھی مسرت محسوس کروں گا۔ میں نے اپنی بیٹی کی ذہنی تربیت بھی انہی خطوط پر کی ہے۔

میں نے احمد سے یہ بھی پوچھا کہ یہ تخلص ہمیش انہیں کہاں سے ملا۔ بولے.... میرا گھر کا نام تو شدن ہے ’جیسے پیار میں بزرگ پکارتے ہیں۔ نام احمد قریشی صدیقی ہے۔ 1959ء میں لاہور میں ایک خاتون نے میر حسن کی مثنوی کا حوالہ دیتے ہوئے کہ اس میں ایک جگہ ہمیشہ‘ ہمیش آیا ہے‘ مجھے یہ تخلص دیا۔ مجھے اچھا لگا چنانچہ میں نے اسے اپنا لیا۔

میرا اگلا سوال تھا آپ اظہار خیال نظم میں کرتے ہیں یا غزل میں؟ وہ سنبھل کر بیٹھے اور بولے.... ”سلطانہ صاحبہ آپ نے بڑا اچھا سوال کیا۔ دراصل شاعری ’کیفیت شعری کے نزول کے بغیر ممکن نہیں مگر کسی بھی فارم میں کیفیت شعری کے نزول کے ساتھ شاعر کے مزاج اور مرتبہ خیال کو بڑا دخل ہے۔ غزل کے شاعر کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ غزل کی فارم میں بڑے سے بڑے خیال کے اظہار کے باوجود عروض کی پابندی اور شعر موزوں کی اہلیت ناگزیر ہے جبکہ نظم کے شاعر کا بھی ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ نظم کی فارم (پابند‘ معریٰ‘ آزاد اور نثری نظم) میں بڑے سے بڑے خیال کے اظہار کے باوصف زیادہ سے زیادہ آزادی لی جاسکتی ہے۔ اس اعتبار سے میں نے اظہار خیال کے لئے نظم کی فارم کا انتخاب کیا۔ حالانکہ میں نے گذشتہ 35 سال کے دوران چند غزلیں بھی کہیں مگر جلد ہی محسوس کیا کہ میرا مزاج غزل کی فارم پر پورا نہیں اترتا اور میں ناصر کاظمی اور محبوب خزاں کی روایت میں ایک بھی نمائندہ غزل نہیں کہہ سکتا یا انور شعور اور پرکاش فکری جیسے نمائندہ غزل کے شاعروں کی برابری نہیں کرسکتا‘ اس لئے میں نے بیشتر نظم کی فارم سے رجوع کیا اور 35 سال کے دوران (پابند‘ معریٰ‘ آزادی اور نثری نظم) کی فارم میں لگ بھگ 150 نظمیں لکھیں۔

نثری نظم کے حوالے سے انہوں نے کہا.... ”میں پہلے دو غلط فہمیاں دور کرتا چلوں۔ میری نثری شاعری کے متعلق ایک غلط فہمی یہ ہے کہ میں نے اردو نثری شاعری کے بانی ہونے کا دعویٰ خدانخواستہ صحیح نہیں کیا حالانکہ میں نے دعویٰ کے ساتھ باقاعدہ دستاویزی ثبوت پیش کیا‘ جو لوگ اردو نثری شاعری کے ڈانڈے ماہنامہ ”نگار“ کے پرانے شماروں میں شائع کئے گئے انشاء لطیف اور نثر لطیف سے ملاتے ہیں‘ وہ بالکل لاعلم ہیں۔ علاقہ نیاز فتح پوری کو بنگلا نہیں آتی تھی‘ انہوں نے ٹیگور کی شاعری کے نثری تراجم انگریزی کے توسط سے کئے۔ ان نثری تراجم کے انداز سے انشاء لطیف اور نثر لطیف کے جو نمونے شائع کئے گئے‘ ان میں نثری

شاعری کا آہنگ نہیں پایا جاتا۔ پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نثری شاعری کا بانی فرانسیسی شاعر چالس بوولیئر ہے، وہ بھی لاعلم ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ دنیا کی زبانوں میں سب سے پہلے نثری شاعری سنسکرت میں کی گئی۔ سنسکرت شعریات میں نثری شاعری کا عہد حضرت عیسیٰ کے ظہور سے قبل کا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے میری شاعری کی جڑیں سنسکرت میں ہیں۔ میں سنسکرت کا طالب علم رہا اور سنسکرت نثری شاعری سے ہی میں نے اپنا رشتہ جوڑا۔ اس طرح سنسکرت ناٹکوں کے مکالموں میں پائے جانے والے نثری شاعری کے آہنگ (یہی آہنگ ٹیگور نے "گیتا انجلی" میں برتا ہے) کو میں نے اپنایا اور اسے پہلی بار 1961ء میں لاہور کے قیام کے دوران لکھی ہوئی اردو نثری نظموں میں برتا۔ 1961ء میں ہی کہی ہوئی ایک نثری نظم "اور یہ بھی ایک ڈائری" ماہنامہ "نصرت" 1962ء میں شائع ہوئی۔ اس طرح میں اردو نثری نظم کا بانی ہوں۔ بعض لوگ لاعلمی میں سجاد ظہیر کو ان کے شعری مجموعہ "پگھلا نیلم" کے حوالے سے اردو نثری شاعری کا پہلا شاعر کہتے ہیں جبکہ سجاد ظہیر کا مجموعہ پگھلا نیلم" 1964ء میں شائع ہوا اور اس میں شامل جن نظموں کو پروز پوئم Prose Poem سمجھ لیا گیا ہے، وہ دراصل پروزیک Prosaic ہیں پھر یہ کہ میں نے تو 62-1961ء کے بعد 67-1964ء کے دوران تجدید کے سلسلے سے نثری نظم کی تکنیکی و موضوعی توسیع کی اور یہ سلسلہ 1973ء تک جاری رہا مگر لاعلمی اور بددیانتی کا یہ عالم دیکھنے میں آیا کہ 1970ء کے بعد قمر جمیل، مبارک احمد، انیس ناگی، کشور ناہید اور عبدالرشید وغیرہ نے علیحدہ علیحدہ اردو نثری شاعری کے بانی ہونے کا دعویٰ کیا۔ افسوس ان عقل مندوں کو کوئی یہ بتانے والا نہیں کہ احمد ہمیش نے نہ صرف 62-1961ء میں اردو نثری نظم کی بنیاد رکھی بلکہ اس کے یہاں آج تک نثری شاعری کی موضوعی توسیع کا سلسلہ جاری ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے بیشتر اردو نقاد دریافت کے منصب سے عاری ہیں۔ وہ لاعلم اور بددیانت بہ یک وقت ہیں کیونکہ میرے حق میں اردو نثری نظم کا بانی ہونے کی صداقت کو تسلیم کرنے کے لئے علم اور دیانت لازم ہے۔"

"کس مکتب فکر سے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ انہوں نے ٹھہر کر کہا..... "سچ پوچھئے سلطانہ مہر صاحبہ! میں کسی بھی مکتب فکر سے وابستہ نہیں اگر کوئی مکتب فکر مادی فلسفوں سے اخذ کیا گیا ہے **مثلاً** "رومانیت، جدیدیت اور ترقی پسندی..... تو ان سے میرا کوئی علاقہ نہیں۔ "نئے اور پرانے" سیاسی نظریات کی سطح پر دائیں اور بائیں بازو یا مغرب کے زیر اثر اردو شعر و ادب میں در آئے۔ علاقیت، تجریدیت اور ہیئت پرستی کے رجحانات سے میں سخت بیزار ہوں۔ دراصل میں نے شعر و ادب کے تخلیقی منصب کے پیش نظر اپنے جمالیاتی نظام کی خود بازیافت کی ہے۔ میں نے راست اپنی جڑیں (Roots) سنسکرت شعریات، سنسکرت ناٹک اور فارسی شاعری کے اکابرین میں دریافت کی ہیں۔ گہرے مذہبی مزاج کا آدمی ہوں، صاحب

عقیدہ ہوں۔ تاہم مختلف مذاہب اور مسالک سے اختلاف نہیں رکھتا۔ ہر مذہب اور مسلک سے انسانی قدروں کا انتخاب کرتا ہوں۔ خلاف اس کے 20-19ویں صدی کے مادی فلسفوں سے ساخت کئے گئے فکری نظام اور سیاسی نظریات سے بالکل متفق نہیں۔ ان میں سے کسی نظام نے انسان کو مطمئن نہیں کیا' اسی لئے میں خود کو بہ حیثیت شاعر و ادیب انسانی آفاقی قدروں سے جوڑتا ہوں۔"

اردو کے مستقبل کے بارے میں انہوں نے کہا اس سے قطع نظر کہ اردو زبان اپنے ماضی سے حال تک بظاہر عدم تحفظ سے دوچار رہی ہے۔ اسے کبھی سرکاری زبان بننے نہیں دیا گیا۔ پاکستان میں سرکاری سطح پر تاحال اردو جگہ نہیں لے سکی ہے۔ بیوروکریٹس یا پاکستانی کالے انگریزوں کی زبان انگریزی ہے اور محض زبانی جمع خرچ کے طور پر اردو کا قومی زبان کہلانا تو محض ڈھونگ ہے جبکہ ہندوستان میں بھی جہاں ہندی بظاہر سرکاری زبان ہے مگر در پردہ وہاں کے نوکر شاہوں یا بھارتی کالے انگریزوں کی سرکاری زبان بھی انگریزی ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ گذشتہ دہائیوں کے دوران محض مذہبی تفریق کی بناء پر اردو کے رسم الخط کو دیوناگری میں ڈھالنے کی مہم چلائی گئی۔ تاہم برصغیر پاک و ہند سے عرب ملکوں' برطانیہ' جرمنی' امریکہ اور کینیڈا تک عام بول چال کی سطح پر اردو ناگزیر ہے۔ پاکستان کے چاروں صوبوں والے رابطہ کی سطح پر اردو ہی بولتے ہیں۔ شہروں میں کاروباری لین دین کے بیشتر موقعوں پر چاروں صوبوں والے ایک دوسرے اردو بول کے ہی مطلب براری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی صورتحال ہندوستان میں ہے۔۔۔۔ کہ وہاں دہلی کی راج دھانی سے اتر پردیش تک محض نام کی سرکاری بھاشا ہندی لکھنے والے جب ایک دوسرے سے بولتے ہیں تو شدھ ہندی کی بجائے عام فہم اردو میں بولتے ہیں جبکہ بہار' بنگال' مدھیہ پردیش' مہاراشٹر' تامل ناڈو' آندھرا پردیش اور کرناٹک میں مختلف قوموں سے رابطہ کی سطح پر ہندی کی بجائے انگریزی اور ہندوستانی اردو بول کے مطلب براری کی جاتی ہے۔ (خیال رہے کہ اسی ہندوستانی اردو کو گاندھی جی نے محض "ہندوستانی" کا نام دیا تھا) ان حقائق کے پیش نظر دنیا بھر میں عام بول چال کی سطح پر اردو کے مستقبل کو محفوظ تصور کیا جا سکتا ہے۔

اب آیئے! شعر و ادب کی سطح پر بھی اردو کے محفوظ مستقبل کے متعلق کچھ باتیں ہو جائیں۔ اول یہ کہ یہ تاثر ذہن سے نکال دینا چاہئے کہ اردو سمیت دنیا کی کسی بھی زبان کے شعر و ادب کی اہمیت اور اس کا ریکاگنیشن (Recognition) کسی سرکاری یا غیر سرکاری سرپرستی کا محتاج ہے! یا اگر کوئی زبان سرکاری سطح پر مقتدر نہ ہو تو اس کے شعر و ادب کی مقبولیت متاثر ہوتی ہے!

ہر چند کہ اردو زبان کو برصغیر پاک و ہند میں سرکاری سطح پر اقتدار تو کبھی ملا نہیں مگر اردو

کے شعرو ادب کا تخلیقی ورثہ دنیا کی کسی بھی نمائندہ زبان کے شعری و ادبی تخلیقی ورثہ سے کسی اعتبار سے بھی کم نہیں۔ ہاں! اگر اردو شعرو ادب کی تاریخ صحیح لکھی گئی ہوتی تو اس حقیقت کا علم ہو چکا ہوتا کہ اردو شاعری اور اردو فکشن کی تاریخ انگریزی اور یورپ کی کئی زبانوں کے شعرو ادب کی تاریخ سے بھی پرانی تاریخ ہے۔ جب برصغیر میں امیر خسرو کا بول بالا تھا تو اس دور میں مغرب کے شعرو ادب کا خانہ خالی تھا۔ تب وہاں گپ شپ فضولیات (Gossips) پر گزارا ہو رہا تھا۔ امیر خسرو کے بعد بھی اردو شعرو ادب کے اکابرین نے اپنے اپنے دور میں اپنے تخلیقی مرتبہ کا لوہا منوایا۔ اس سے قطع نظر کہ فورٹ ولیم کالج کی سازشی سرپرستی نے اردو شعرو ادب کی قدیم وراثتی عظمت کو نقصان پہنچایا۔ مزید تحقیق' تالیف اور تنقید کے شعبہ میں پیروی مغرب نے اتنا زور پکڑا کہ آج تک یہ تاثر زائل نہیں ہوا کہ گذشتہ چار دہائیوں میں خلق کیا جانے والا اردو شعرو ادب خدانہ خواستہ سب کا سب پیروی مغرب کی ڈگر پر چل رہا ہے! جبکہ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چار دہائیوں سے (یعنی نصف صدی) کا اردو شعرو ادب کسی بھی زبان میں لکھے جانے والے شعرو ادب سے کم نہیں بلکہ بیشتر صورتوں میں برتری کا مستحق ہے مثلاً" انگریزی جو پرانے انگریز آقا کی زبان ہے' اب وہ دنیا بھر کی بول چال کی نمائندہ ہونے کے باوجود بیشتر بین الاقوامی تجارتی لین دین کے کام آتی ہے۔ "ٹوفل" جو امریکی انگریزی کا تجارتی پیمانہ ہے۔ اس کی تجارتی توضیع کے سبب دنیا بھر میں انگریزی غلط لکھی اور بولی جاتی ہے۔ انگلش گرامر والی برٹش معیار کی انگریزی کا دائرہ تو بہت محدود ہو کے رہ گیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے وطن برطانیہ میں انگریزی یتیم نظر آتی ہے۔ اعلیٰ درجہ کے معیاری انگریزی تراجم دس فیصد سے زیادہ پائے نہیں جاتے' جہاں تک موجودہ انگریزی شعرو ادب کا تعلق ہے تو اگر اس سے موجودہ اردو شعرو ادب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو دیانت دارانہ تجزیہ کے مطابق موجودہ اردو شعرو ادب تخلیقی اعتبار سے برتری کا مستحق ثابت ہو گا۔ البتہ اس کا صحیح اندازہ تبھی ہو سکتا ہے' جب موجودہ اردو شعرو ادب کا صحیح انگریزی ترجمہ کرایا جائے اور مستند اہل نظر سے اس پر رائے طلب کی جائے۔ تاہم انگریزی کے مقابل اردو کو یہ برتری چھپے ہوئے لفظ "Print Word" کی صورت حاصل ہے جبکہ اعداد و شمار سے اس کی توثیق ہو سکتی ہے۔

اب انگریزی کے بعد عربی کے مقابل اردو کی حیثیت ملاحظہ فرمایئے جیسا کہ لسانی سطح پر عربی و عجمی کی روایت تو صدیوں گزرے جہاں کی تہاں دفن ہو چکی بعد کے زمانوں میں عربی شعر و ادب بہت کم لکھا گیا۔ وہ بھی لبنان کے کچھ عیسائی عربی جاننے والے شعرو ادب لکھ گئے یا تالیف و تراجم کی سطح پر مصر میں جامعہ اظہر نے عربی کا بھرم رکھ لیا۔ نجیب محفوظ کا نام نوبل پرائز کے حصول کے بعد سنا گیا جبکہ وہ اردو کے کرشن چندر' بیدی' غلام عباس اور شوکت

صدیقی کے مقابلے میں معمولی فکشن رائٹر ہے۔ دراصل گذشتہ نصف صدی کے دوران تیل کی دولت (پٹرو ڈالر) اور حج کی آمدنی کے بے پناہ حصول نے تجارتی سطح پر عربی کو بول چال کی زبان بنائے رکھا مگر تہذیبی سطح پر مہذب کہلانے کے لئے عربوں کے پاس عربی شعر و ادب کے نام پر کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ یہاں کسی تفصیل میں نہ جا کے یہ ذکر ناگزیر ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے جو اہل اردو' عرب ملکوں میں سکونت اختیار کرنے کے دوران صرف مشاعروں اور موسیقی کی محفلوں کے انعقاد سے عربوں کی پرانی لسانی شعری تہذیب کا بھرم رکھنے کے لئے کوشاں ہیں' وہ اس لحاظ سے لائق تحسین ہیں کہ ان کے ذریعہ اردو زبان کے شعر و ادب کا مستقبل محفوظ نظر آتا ہے۔"

اب میں پوچھنا چاہوں گی قاری کا ادب سے رشتہ رہا ہے یا نہیں؟ جواب میں احمد ہمیش نے کہا اول یہ کہ اردو سمیت دنیا کی مختلف زبانوں کے شعر و ادب کا قاری شروع سے آج تک منتخب رہا ہے' اس لئے کہ کسی بھی دور میں چند منتخب شاعر و ادیب ہوتے ہیں اور ان کے قاری کی تعداد بھی کم مگر منتخب ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بظاہر تاثر یہی ہوتا ہے کہ گویا شعر و ادب بہت سے شاعر و ادیب خلق کر رہے ہیں یا لکھ رہے ہیں اور بہت سے لوگ شعر و ادب پڑھ رہے ہیں جبکہ شعر و ادب کی تاثیر اپنی نوعیت کی ہمہ گیر تاثیر ہے۔ بالکل اس اعلیٰ درجہ کے پرفیوم کی طرح جو کہیں ایک موزوں جگہ رکھا ہو اور چھوں اور محسوس کیا جا رہا ہو۔ تاہم کسی بھی اعلیٰ درجہ کے پرفیوم کو مچھلی بازار میں نہیں رکھا جا سکتا۔ دراصل ادب کے قاری کا رشتہ ادب کے نام پر ادب کے مچھلی بازار سے نہیں بلکہ آج بھی ادب کا قاری اعلیٰ درجہ کے پرفیوم کی مثل ادب کو اس کی موزوں جگہ رکھ کے اس سے رشتہ رکھتا ہے۔ ایک بات اور! بازار میں چاٹ خوب بکتی ہے مگر ڈائمنڈ کی دکان پر کبھی کبھار ہی کوئی ڈائمنڈ کا خریدار آتا ہے۔ تاہم چاٹ اور ڈائمنڈ میں بہت فرق ہے۔

گو بات طویل ہو چلی تھی لیکن جوابات وقیع تھے اور گفتگو علمی تھی' لہٰذا اس خیال کے

پیش نظر کہ ہمارے قارئین کے علم میں اضافہ ہوگا اور اس حوالے سے علمی بحث کے دروازے بھی وا ہو سکتے ہیں۔ میں نے آخری سوال پوچھا۔ احمد ہمیش کا جواب خاصا طویل ہے لیکن دلچسپ ہے' ملاحظہ ہو' کہتے ہیں....

اول یہ کہ کسی بھی دور میں ادیبوں کی بھیڑ ادب خلق نہیں کرتی۔ ہر دور میں دو چار ادیب سے زیادہ نہیں ہوتے۔ آج کے دور میں بھی برصغیر پاک و ہند اور بیرونی اردو دنیا میں چند ہی ادیب اپنی تہذیبی وراثت سے جڑے ہوئے ہیں اور شعر و ادب خلق کر رہے ہیں پھر یہ کہ ادب پر جمہوری نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ چند منتخب ادیبوں کے خلق کئے ہوئے ادب پر چند مستند و معتبر اہل نظر ہی ورڈکٹ (Verdict) دے سکتے

ہیں۔ اسے آپ ادب کی جینوئن مطلق العنانی سمجھ لیں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ ہے۔ تاہم اس سے قطع نظر ہم کچھ دیر کے لئے تاریخی تناظر میں دیکھیں کہ آخر ہمارے شعروادب کے متعلق کب سے اور کہاں سے ایک غلط اور بے بنیاد موقف اختیار کیا گیا! تو پتہ یہ چلتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام یا زیر نگرانی پہلے تو ایک گہری سازش سے ہمارے سنسکرت اور فارسی شعروادب کی قدیم عظمتوں کو یکسر منقطع کردیا گیا۔ ان کی جگہ لوگوں کو ذہنی غلام بنانے کے لئے اوسط درجہ کی تحریروں کے تراجم اور تالیف کی سطح پر تحقیق و تنقید کو رواج دیا گیا جبکہ تحقیق و تنقید کو شروع ہی سے دریافت کے منصب سے دور رکھتے ہوئے محض پیروی مغرب کو شعار بنالیا گیا۔ حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کے وقت سے اردو شاعری اور اردو نثر بشمول قصہ کہانی کو مغرب سے استفادہ کی طرف مائل کیا جانے لگا حالانکہ غالب کے وقت تک غزل اور مثنوی کی عشقیہ شاعری کی بڑی روایت تھی' اس کی جگہ مغربی رومانیت مستعار لی گئی پھر جیساکہ ہمارے یہاں نظیر اکبر آبادی نے اپنے دور میں "آدمی نامہ" اور "روٹی" جیسے اجتماعی آزار کے موضوع پر نظم کی شاعری کی بنیادی رکھی بلکہ انہوں نے اپنے زمانہ کے عام آدمی کے دکھ کا بے مثل مرقع پیش کیا۔ نظیر اکبر آبادی کے زمانہ میں تو مغرب کی شاعری پس ماندہ تھی مگر افسوس کہ ان حقائق کو جانے بغیر "انگارے" کے رجحان سے لے کے ترقی پسند تحریک تک روس اور یورپ سے مستعار لئے گئے۔ اجتماعی شعور سے مصنوعی اور فرمائشی نظمیں اور افسانے لکھے گئے۔ پوری ترقی پسند تحریک نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے موضوعات کا چربہ تھی۔ رہی سہی کسر پوری کی گئی جدیدیت کے رجحان اور لایعنیت' علامتیت و تجریدیت کے کھوکھلے تجربوں سے۔ اندر کی ضرورت کے بغیر استعارہ' علامت اور تجرید کے استعمال کا ایک فیشن ضرور چل نکلا مگر اس فیشن پر چلنے والے محض غیر شاعر و غیر ادیب تھے جبکہ نئے اور پرانے کی بحث کے دوران یہ بھلا دیا گیا کہ جب ہم ہر روز سویرے جاگ اٹھتے ہیں تو ہم اپنے سروں پہ جو آسمان دیکھتے ہیں' وہ نہ جانے کب سے قائم ہے اور نہ جانے کب تک قائم رہے گا! گویا آسمان نہ پرانا ہے اور نہ نیا!..... آسمان' آسمان ہے۔ یہ ایک ایسی ناگزیر صداقت ہے' جو کسی بھی زبان میں خلق کئے جانے والے شعروادب کے اظہار کی شکل اور فارم کو ناقابل تسخیر آفاقیت اور لامحدود تصور وقت سے ہمکنار کردیتی ہے۔

فارسی زبان کے عظیم شاعر حضرت بیدل اورنگ زیب کی موت کے بعد تک جسمانی طور پر زندہ رہے پھر وہ صرف جسمانی موت مرے۔ مگر اپنے عظیم تخلیقی ورثہ کے مصداق انہوں نے صرف میر' غالب' اور اقبال کو متاثر کیا بلکہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے حالیہ گزرے ہوئے عرصہ تک مغرب کے شعروادب اور فکر و فلسفہ یہاں تک کہ اہل سائنس کو بھی متاثر کیا۔ آج بھی فرانس' برطانیہ' جرمنی اور امریکہ میں بیدل کے تخلیقی

ورنہ خاص طور پر مثنوی "عرفان" اور "طلسم حیرت" پہ تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آنے والی صدیاں بھی بیدل کی صدیاں ثابت ہوں گی۔ البتہ اس کے پیش نظر یہ ناگزیر ہے کہ ہمارے اردو کے سینئر ادیب حضرات پہلے بیدل کا مطالعہ غور سے کریں اور معلوم کریں کہ مشرق کے بیدل نے مغرب کے اکابرین شعر و ادب، فکر و فلسفہ اور سائنس کو کہاں کہاں اور کس قدر متاثر کیا ہے! بعد اس کے مذکور سینئر ادیبوں کو چاہئے کہ آج کے اردو شاعروں و ادیبوں پر مغرب کے رجحانات، اس کے ادب کی پیروی اور وہاں کے فیشن کو اپنے ملک میں در آمد کرنے کے الزام صادر کرنے کی بجائے خود کو مغرب کی ذہنی غلامی سے نکالیں۔ مغرب کے پاس شاعری اور نثر کی کون سی تکنیک ہے، جو مشرق سے در آمد نہ کی گئی ہو! رہا سوال مسائل، حسیت اور احساس و شعور کے مسئلہ کا.... تو اس کے لئے بھی دیانت دارانہ اور سنجیدہ موقف لازم ہے۔ سو، بہتر یہ ہے کہ سینئر ادیب حضرات اپنی مصنوعی برتری کے زعم سے نکل کے آج کے دور کے اردو شاعروں و ادیبوں میں سے اگر چند کو نہیں.... تو صرف ایک احمد ہمیش کی کچھ منتخب نظمیں اور چند کہانیاں، خاص طور "کہانی مجھے لکھتی ہے"، "فریاد کی لے" اور "ہیں خواب میں ہنوز" کو بغور پڑھ لیں تب ممکن ہے کہ ان پر ایک علیحدہ جہان معنی منکشف و روشن ہو۔"

عکس فن

غزل

کس توقع پہ کیا اٹھا رکھیئے
دل سلامت نہیں تو کیا رکھیئے

روح کا غم ہی استعارہ ہے
روح کے غم سے واسطہ رکھیئے

لکھیئے کچھ اور داستان دل
اور زمانے کو مبتلا رکھیئے

سر میں سودا رہے محبت کا
پاؤں کی خاک میں انا رکھیئے

بوند بھر آب کیا مقدر ہے
ابر رکھیئے تو کچھ ہوا رکھیئے

جیب مفلس تو اک روایت ہے
ورنہ کیا ہے کہ کچھ بچا رکھیئے

مجھے دیکھ لینے دو صبحِ فردا کی روشنی
مری آنکھ سے ابھی ہاتھ اپنا ہٹاؤ مت

یاسمین حمید

Yasmin Hameed
C-48, Phase1, L.C.C.H.S.
Lahore Cantt.
Lahore, Pakistan

یاسمین حمید

لاہور

یاسمین حمید کا پہلا مجموعہ "پس آئینہ" 1988ء میں شائع ہوا اور سند قبولیت حاصل کر گیا ۔ دوسرا "حصار بے در و دیوار" 1991ء میں اور تیسرا "آدھا دن اور آدھی رات" 1996ء میں شائع ہوا۔ مجھے یہ تینوں کتابیں 1997ء میں لاس اینجلس میں میرے بھائی ضیاء خان سے ملیں۔ یہ کتابیں ضیاء خان کے نام تھیں، جب وہ مجھ سے ملنے آئے تو دوران گفتگو انہوں نے کہا، جب آپ "سخن ور حصہ سوم" مرتب کریں تو یاسمین حمید صاحبہ کو مت بھولئے گا۔ بڑے غضب کی شاعرہ ہیں۔ پھر جب میں نے یاسمین کا کلام پڑھا تو یاسمین کے کلام کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ میں نے آنے سے قبل ضیاء بھائی کو سوالنامہ دیا کہ یہ یاسمین تک آپ کے توسط سے پہنچ جانا چاہئے اور یاسمین کا جواب میرے پاس براہ راست آگیا۔ میں نے یاسمین کی بھیجی ہوئی چند غزلیں، نظمیں پڑھیں اور ان میں چھپی احساس کی شدت نے اس بات کی صداقت کو نمایاں کردیا کہ اعلیٰ ادب سچے جذبوں کی فراوانی سے وجود میں آتا ہے۔ ادب معاشرے کا آئینہ ہی نہیں زندگی کا ترجمان بھی ہوتا ہے اور یاسمین کا کلام اس کی گواہی دے رہا ہے۔

میں شہر شب کو آنکھوں کی دعا دینے سے پہلے
در و دیوار کا چہرہ بدلنا چاہتی ہوں

مجھے تہ میں جا کے اچھالنے ہیں گہر کئی
میں ہوں مطمئن، مجھے ڈوبنے سے بچاؤ مت

غبار بے یقینی نے مجھے روکا ہوا ہے
زمیں سے پھوٹ کر باہر نکلنا چاہتی ہوں

یاسمین کا تعلق درس و تدریس سے رہا ہے۔ کویت کے انٹرنیشنل اسکول آف پاکستان میں انہوں نے 1979ء سے 1982ء تک گریڈ ون سے تیسری جماعت تک کے بچوں کو پڑھایا۔ لاہور کے "عالمہ اسکول" سے بحیثیت ڈائریکٹر 1986ء سے وابستہ ہیں۔ یہ اسکول یونیورسٹی آف لندن سے جی سی ای کے انٹرنیشنل امتحانات کے لئے رجسٹرڈ ہے۔ اس کے علاوہ بھی یاسمین نے فن و ادب سے تعلق رکھتے ہوئے لاہور ٹی وی کے لئے 1996ء میں پاکستان کی ادبی شخصیات کے انٹرویوز پر مبنی پروگرام بعنوان "مخزن" پیش کیا۔ 1993ء میں میوزیکل ٹی وی پروگرام "فن اور فنکار" کی میزبان اور نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ 1994ء میں خواتین کی تخلیقات پر مبنی "پاکستانی ادب" کے عنوان سے انگریزی میں ایک خصوصی نمبر جو 327 صفحات پر مشتمل تھا، مرتب کرنے میں معاونت کی۔ اسے "اکیڈمی ادبیات پاکستان" نے شائع کیا۔ ہم عصر اردو شعراء و شاعرات کی شاعری کو "پاکستانی لٹریچر" کے عنوان سے انگریزی میں ترجمہ کیا، اسے بھی اکیڈمی ادبیات پاکستان نے شائع کیا۔ 1995ء میں اور 1996ء میں اس وقت کی وزیر اعظم کے دورہ ء لندن اور واشنگٹن کے موقع پر حکومت پاکستان کی جانب سے منعقدہ کلچرل فیشن شو کے لئے اور 1996ء میں پاکستان میں ورلڈ کپ کرکٹ فیسٹیول کے لئے کنٹری کے مسودات اور گیت یاسمین حمید نے لکھے تھے۔

18 مارچ 1951ء کو پیدا ہونے والی یاسمین حمید کا رجحان شروع سے ہی تعلیم اور ادب کی طرف تھا۔ گو ان کے مضامین سائنس کے رہے۔ ہوم اکنامکس کالج سے 1970ء میں انہوں نے بی ایس سی کیا۔ ان کی تعلیمی خدمات کے صلے میں انہیں پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے 1972ء میں رول آف آنر اور گولڈ میڈل دیا گیا کیونکہ انہوں نے ایم ایس سی میں فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ یاسمین کا کلام فنون اوراق، سیپ، اقدار، تسطیر، معاصر وغیرہ میں شائع ہوتا ہے۔

ان کا ذریعہ ء اظہار صرف شاعری ہی ہے۔ نظم اور غزل دونوں لکھتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فنکار تو زندگی کی ہر جہت سے وابستہ ہوتا ہے۔ کسی مخصوص مکتب فکر میں محدود رہ کر تخلیق کا دائرہ بھی محدود ہو جاتا ہے۔ میں تخلیق کے معاملے میں ذہن کو کسی ایک سمت کا اسیر کرنے کی قائل نہیں۔ ویسے مجھے ہمیشہ ایسی شاعری نے متاثر کیا ہے، جس میں ذہن اور دل دونوں بولتے ہوں، جس میں جذبہ و فکر کی مکمل آمیزش ہو۔

یاسمین حمید اردو کا مستقبل تابناک دیکھ رہی ہیں۔ کہتی ہیں "جو زبان اپنی نو عمری میں ادب کو میر اور غالب جیسے شاعر دے چکی ہے، اس کا مستقبل یقیناً پر امید ہے۔ بیسویں صدی کے اردو ادب کا احاطہ کیا جائے تو مجموعی طور پر فکشن اور شاعری کا ایک بڑا حصہ اس معیار کو

کتاب کی بجائے سیٹلائٹ کے ذریعے ہوتے ہیں۔ دنیا Short Cuts کی عادی ہو گئی ہے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو 800 صفحات کا ناول پڑھنا چاہیں گے یا شاعری کی کتاب کے ساتھ شام گزارنا پسند کریں گے۔ ادب سے دوری کا ایک سبب آج کل کا تعلیمی نظام بھی ہے۔ میتھس، فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی، اکنامکس، کمپیوٹر سائنس۔ ہمارا تعلیمی نظام آج کے فرد کو معاشی ذمہ داری کے لئے تو تیار کرتا ہے، اس کی روح کی آبیاری نہیں کرتا۔ ادب سے دلچسپی اسی زمانے میں شروع ہوتی ہے، جب ہمارے بچے یہ سب مضامین پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ کسی ایک مقام پر ہم اس توازن سے محروم ہو رہے ہیں جو انسان کی شخصیت کو مکمل کرتا ہے، جس میں فنون لطیفہ کے ذوق کی آبیاری ہوتی ہے اور ادب کی دنیا سے بھی نسبت پیدا ہوتی ہے۔

ہر ادیب چاہتا ہے کہ اس کی تحریر پڑھی جائے اور ظاہر ہے جب تک ترسیل نہیں ہوگی ادب معاشرے کو متاثر نہیں کرے گا۔ ادب کا ایک بڑا حصہ اب ایک مخصوص طبقے تک محدود ہے۔ پھر بھی میں سمجھتی ہوں کہ لکھا ہوا لفظ اگر تاثیر رکھتا ہے اور اس نے ایک محدود گروہ کو بھی کسی ایک وقت میں کسی بھی سطح پر متاثر کیا تو اس نے اپنا مقصد پالیا۔"

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "یہ ممکن نہیں کہ کسی ایک زبان کے ادب پر دوسری زبانوں کے ادب کے اثرات مرتب ہی نہ ہوں۔ یورپی ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ یونانی ادب نے چودھویں صدی میں اطالوی ادب کو متاثر کیا اور پھر تمام یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سولھویں صدی میں انگریزی ادب کے رجحانات میں آنے والی تبدیلی اسی عمل کی مرہون منت ہے۔ ادب کی حد بندی نہیں کی جاسکتی لیکن اس بات سے میں اتفاق کرتی ہوں کہ اصناف اور تکنیک کے اصول تو باہر سے آسکتے ہیں لیکن انہیں اپنی حسیت کے قالب میں ڈھالنا ہی اصل ہنر ہے۔ بیرونی رویوں پر سوچ بچار تو ہو سکتی ہے لیکن ان کی عین بعین نقالی نہیں ہونی چاہئے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ سچا شاعر یا ادیب ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ طرز احساس کی نقالی وہی کرے، جس کے اپنے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو، جسے اپنے مسائل، اپنے ماحول اور اپنی ذات کی پیچیدگیوں کا شعور نہ ہو۔"

عکسِ فن

غزل

ہم سب خود کو تنہا کہنا چاہتے ہیں
جھوٹے ہو کر سچا کہنا چاہتے ہیں

اپنے خدوخال کی ہر کمزوری کو
اور کسی کا چرا کہنا چاہتے ہیں

ڈرتے رہتے ہیں جن کی بے مہری سے
ان لوگوں کو اچھا کہنا چاہتے ہیں

چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے والے
اجنبیوں کو اپنا کہنا چاہتے ہیں

آنکھوں والے کب سنتے ہیں آنکھوں کی
سب راتوں کو اجلا کہنا چاہتے ہیں

دل جس سے منسوب کیا ہے ہم اس کو
اپنے قد سے اونچا کہنا چاہتے ہیں

تجھ کو جب سوچتا ہوں، دُور تلک رنگ نظر آتے ہیں

دیر تک روپ سمٹ رہتا ہے

تجھ کو جب سوچتا ہوں!

۱۹ . ۱۲ . ۹۷

Younus Javed
NursinghDas Garden
B.O.R I, Club Road
Lahore, Pakistan

یونس جاوید

لاہور

یونس جاوید کا نام آج پاکستانی شعراء کی فہرست میں صفحہ اول پر ہے، مگر شاعری سے زیادہ ان کی شہرت ڈرامہ نویسی کی ہے۔ انہوں نے اب تک متعدد ڈرامہ سیریز، لانگ پلے اور 25 منٹ دورانیے کے بھی کئی ڈرامے لکھے ہیں۔ اتنے کہ انہیں خود بھی شاید صحیح گنتی نہ معلوم ہو۔ میں بھولی نہیں کہ جب میں اپنا ذاتی ماہنامہ "روپ" شائع کرتی تھی، اس زمانے میں بمبئی کے ایک فلمی سیٹ پر میری ملاقات نامور فلم اسٹار دھرمندر سے ہوئی۔ دھرمندر نے 50 منٹ دورانیے کا اور 65 ایپی سوڈ پر مشتمل سیریز "اندھیرا اجالا" کی اتنی تعریف کی کہ میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ گو کہ وہ ڈرامہ میرا لکھا ہوا نہ تھا مگر میرے پاکستان کے ایک ہونہار فرزند یونس جاوید کی تعریف بھی میری اپنی تعریف تھی۔ میرے وطن کی تعریف تھی۔

اور اب جبکہ یونس جاوید کا شعری مجموعہ "کالر پہ نیا پھول" شائع ہونے جا رہا ہے۔ آپ کو شاعر یونس جاوید سے ملواتی ہوں۔ ان کے شعری مجموعے کا نام جس طرح نیا نیا چونکا دینے والا ہے۔ یونس جاوید کی شخصیت بھی ایسی ہی ہے۔ ان کی نظمیں بھی ان کی شخصیت کی طرح ہیں۔ اگر آپ نے ان کا کلام یعنی نظمیں اردو اور پنجابی "ماہ نو" اور "ادب دوست" میں پڑھی ہونگی تو آپ بھی میری رائے سے متفق ہوں گے ویسے یونس جاوید نے شاعری کے علاوہ اور کام بھی کئے ہیں یعنی تنقید و تحقیق بھی کی۔ انتھالوجی (Anthology) بھی مرتب کیں۔ تین جلدوں میں کلیات ناسخ مرتب کیں۔ حواشی لکھے اور مقدمے لکھے۔

تو آیئے یونس جاوید سے ان کے بارے میں تفصیلی گفتگو کریں۔ ہاں یہ بتا دوں کہ ان کا نام یونس جاوید ہے اور اسی کو تخلص سمجھ لیں کیونکہ بقول خود تخلص کی ضرورت کبھی محسوس

ہی نہیں کی۔ نام خود ہی جو اتنا معتبر ٹھہرا۔

تو جناب یونس جاوید...... آپ کی جائے پیدائش تاریخ سن وغیرہ وغیرہ... سوال سن کر بولے...... "نہ تاریخ یاد ہے نہ سن۔ ماہ اکتوبر تھا۔ میں ستاروں اور سیاروں کے حوالے سے سکارپیو (علامت بچھو) ہوں۔ لاہور کے مضافات میں پیدا ہوا تھا۔ پاکستان وجود میں آنے سے ذرا پہلے ان دنوں والد ٹھیکیدار تھے۔ کسی نہر کی کھدائی کے سلسلے میں میرٹھ کے آس پاس تھے۔ قرآن پاک حفظ کرنے کے لئے اندرون شہر لاہور کی مسجد چینیاں والی میں مجھے داخل کرا دیا گیا' جہاں قرآن پاک حفظ کیا' مختلف مساجد میں تراویح بھی پڑھائیں۔ والد کا کاروبار "انار کلی" میں تھا۔ اعلیٰ ترین قلم کے امپورٹ کرنے والوں میں سے تھے' لہٰذا بچپن میں ہی قلم اور قلم کاروں سے شناسائی ہوئی۔ مونٹ بلانک' لائف ٹائم' پارکر' ڈوفولڈ' وی ایس' بلیک برڈ' سوان' ایورشارپ اور پیلیکن تمام پین میرے پاس ہیں۔ اسی قسم کے قلم رکھنے والے ادیبوں' شاعروں اور اسکالرز کو اپنی ہی دکان پر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ زیادہ تر پڑھنے کا کہ لکھنا ابھی نہ آتا تھا مگر مسجد ہی میں تھے کہ لفظ جوڑ جوڑ کر "آخر شب" لکھا جو بعد میں ناول کہلایا۔ (بعد میں ڈس اون کر لیا مگر اب جی چاہتا ہے اون کر لیا جائے) میٹرک کے فوراً بعد جو کہانیاں لکھیں' وہ "تیز ہوا کا شور" کے نام سے افسانوں کے مجموعہ میں شامل ہیں۔ یہ تمام افسانے مرزا ادیب کے اصرار پر لکھے اور "ادب لطیف" میں شائع ہوئے کہ ان دنوں ادب لطیف بہت بڑا جریدہ تھا۔ 1972ء میں پنجاب یونیورسٹی سے دوسرے نمبر پر ایم اے اردو کیا۔"

یونس جاوید کہتے ہیں۔ میں اردو کے مستقبل سے ذاتی طور پر امید ہی نہیں' پر یقین بھی ہوں۔ جب تک پرنٹ میڈیا زندہ ہے ہندوستان میں اس کو ختم کرنے کے رجحانات کے باوجود یہ زندہ ہے اور رہے گی۔

اصناف سخن میں نظم کہتے ہیں۔ نثری نظم کو شاعری نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ مشاعرے کا تاریخی دور تو سمٹ رہا ہے۔ پاکستان میں تو مشاعرے ٹی وی تک محدود ہو چکے ہیں۔ البتہ ادبی انجمنیں ابھی تک فعال ہیں۔ جن میں حلقہء ارباب ذوق جس کا آغاز 12/ اپریل 1939ء کو ہوا' آج تک زندہ ہے اور میرا مشاہدہ ہے کہ اس نے ادب سازی ہی نہیں کی' ادیب سازی کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے اور تخلیقی رجحانات کو لوگوں کے ذہنوں میں بطریق احسن بیدار کیا ہے۔

میرے اگلے سوال کے جواب میں یونس جاوید نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ "بات یہ ہے حضور کہ اہل وسائل' وسائل تو اپنے پاس رکھتے ہیں اور مسائل ادیب کی جھولی میں ڈال کر کہتے ہیں کہ میاں انہیں حل کرو۔ تم لکھو' تم سوچو' تم عمل کرو ادیب کو تخلیق کے ساتھ

ساتھ جسم و جاں کا رشتہ بھی تو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ لہٰذا میری مجبوری ہے تو دوسرے کی بھی مجبوری ہو سکتی ہے کہ وہ شاعری یا افسانے کے ساتھ ٹی وی یا فلم کے لئے لکھے۔ میں مانتا ہوں کہ ڈائجسٹوں اور دیگر میڈیا کے لئے لکھنے کا رجحان مجبوری ہے۔ میں خود کو تو کریٹ کہہ سکتا ہوں دوسروں کو نہیں۔ جب قاری نے اپنا رشتہ کتاب سے ہٹا کر ڈش سے جوڑ لیا تو مجھے ڈش سے بھی رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ اور میں تو کر رہا ہوں۔ لہٰذا بے اثر ہونے کا مفروضہ خود ساختہ ہے۔ یہی میری گزارش ہے۔"

آخری سوال سن کر یونس جاوید نے کہا۔ "کوئی کچھ بھی کہے۔ اچھا ادب وہیں تخلیق ہوتا ہے' جہاں مسائل زیادہ ہوں۔ صحرا قریب ہو یا سمندر' اور چند لوگوں کو چھوڑ کر جو محض فیشن کے طور پر ادب کی تقلید یا نقل میں ہوں گے باقی سب اپنی مٹی سے جڑے ہوئے ہیں اور اسی کی بوباس لئے ہوئے ہیں۔ اچھا ادب کم کم تخلیق ہو سکتا ہے اور کم ہی شائع ہوتا ہے خصوصاً برِ عظیم میں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ بیرونی یا اندرونی فیشن یا قدغن سے یا اس کے بغیر اچھا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا ایک تاثر ہو سکتا ہے کہ تخلیق کا سفر کبھی رکا ہے نہ رکے گا' البتہ عشق' تخلیق اور تعلقات عامہ چونکہ فل ٹائم جاب ہیں اور بعض لوگوں نے عشق اور تخلیق کو پارٹ ٹائم اور تعلقات عامہ اور اس کے مفادات کو فل ٹائم بنا رکھا ہے تو انہیں آپ ادب کے زمرے میں لاتے ہی کیوں ہیں؟

یہی حال سیاست کا ہے۔ تعلقات عامہ اور سیاست دونوں سطحی چیزیں ہیں۔ اعلیٰ صرف تخلیق اور عشق ہے اور جنہیں کام کرنا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ کئے بغیر نہیں رہیں گے۔"

یونس جاوید آج کل دو ماہی صحیفہ اور بکس کے ایڈیٹر ہیں۔ بورڈ کے ریڈر اور اسسٹنٹ آف لٹریچر بھی ہیں۔ مختلف اداروں سے اب تک بیس پچیس ایوارڈز اور میڈل لے چکے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔

عکسِ فن

کیمپس کی وہ شام

مرے لہو میں پکارا ہے کون رات گئے
کسک سی اٹھی ہے پھر، جی میں درد اترا ہے

زباں کی نوک پہ پھر کس کا نام آیا ہے
ہر ایک سمت نظر آ رہی ہیں تصویریں

سڑک سے لے کے نہر تک، نہر سے جنگل تک
بجھے بجھے سے مناظر، لہو لہو رستے

جو میرے دل کے دریچے پہ ایک دستک ہیں
لہو رلانے کو کیوں آ گئے ہو رات گئے؟

لہو رلاتی ہوئی شب گزر تو جائے گی
جو ہوگی صبح تو آنکھیں کہاں سے لاؤں گا

کرن کرن سے جو میں نے لیا تھا نور کبھی
اسے تو میں نے تمہارے لئے بچایا تھا

وہ درد میں نے جو گیتوں میں بن کے رکھا تھا
اسے تو میں نے تمہارے لئے ہی گایا تھا

وہ گھر کہاں ہے رسیلا، وہ زندگی ہے کہاں
وہ نغمہ سرد ہواؤں میں گم ہوا ہے کہاں

مجھے خبر تو کرو، میں جو تھا تو تھا تو میں تھا
کہ راستے کی مسافت نے کس کو چاٹ لیا

آج کی شاعرات

اس عنوان سے 1973ء میں، میں نے کتاب شائع کی تھی، جس میں ایک سو تین شاعرات کا تعارف تھا۔ یہ تعارف بھی میں نے شاعرات سے اس وقت لیا تھا، جب میں روزنامہ جنگ میں ہر ہفتے ایک شاعر یا شاعرہ کا تعارف شائع کرتی تھی۔ ان شاعرات کے نام کی فہرست درج ذیل ہے۔ (سلطانہ مہر)

فہرست بوئے گل

راحیل اختر
اختر بیگانہ
خلیق تبسم
ثریا حیا
رئیس بانو نقوی
زیب النساء زیبی
حسینہ شفق
خورشید بانو شمع
عسکری شہناز
صنوبر مصور
عظمیٰ ناہید
شوکت فرخ
سعیدہ ناز
فہمیدہ نسرین
نعیم حسین نگار
محمودہ ہیر

عشرت جہاں آفریں
خورشید اعظم پروانہ
ریحانہ رضوی
سکندر حیا بریلوی
زہرہ اشتیاق
سحر میمن
شفیق بانو بریلوی
نور شمع
شہناز وصی
ضمیر فاطمہ جعفری
عشرت جہاں پشاوری
مہ جبین فاطمہ ماہ
شاہدہ سلطانہ ناز
نسیم قمر
نگار حفیظ نگار

گلنار آفریں
پروین شاکر
خاتون حجاب
خورشید فاطمہ
آل زہرہ نقوی
سردار بانو
بشریٰ شمس
شمیم اختر شمیم
صائمہ خیری
عظمت عزمی
محترم عشرت جہاں
مہر نگار تیموری
عابدہ ناز
نسیم ہدیٰ نسیم
عذرا ہما

انوپا
آنسہ پنہاں
حسنہ زیدی
رضیہ ابو جعفر
زیب گلشن مولوی
سعدیہ روشن
شمسہ صدیقی
شمیم رحمان شمیم
عابدہ بانو صبا
عزیز بدایونی
فائزہ صدیقی
رحمت النساء ناز
نوشابہ نرگس
نصیرہ ملک
فریدہ ہما

نالۂ دل

ادا جعفری	سیدہ حنا	ربیعہ فخری رزمی	ثریا زیبا
شہاب قزلباش	ڈاکٹر سرور سلطانہ	محمودہ جبیں سوز	رشیدہ سلیم سیمیں
شائستہ زیدی	طلعت اشارت	عرفانہ عزیز	میمونہ غزل
پروین سید فنا	فہمیدہ ریاض	نور بانو محجوب	سعیدہ عروج مظہر
معینہ انور معین	منور سلطانہ لکھنوی	کشور ناہید	ثریا محمود ندرت
وحیدہ نسیم	زہرہ نگاہ	رابعہ نہاں	

دودِ چراغ محفل

زاہدہ انجم	رضیہ انور امروہوی	بغدادی بیگم	رابعہ پنہاں
بلقیس جمال بریلوی	کنیز فاطمہ حیا	بیگم خورشید آرا	خیاب علوی
تراب النساء علوی	سروری عرفان اللہ روحی	صفیہ شمیم ملیح آبادی	عذرا عزمی
رشیدہ بیگم عیاں	میمونہ غزالہ بریلوی	بیگم قمر القادری	قمر جہاں چندوسوی
سید نسیم فاطمہ بریلوی	انور الصباح بیگم	نور جہاں	نور بدایونی

سُخن ور حصہ اول

سخن ور حصہ اول میں ساٹھ پاکستانی شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس کی فہرست درج ذیل ہے۔

ترتیب

احسان دانش
اطہر نفیس
اقبال عظیم
انجم اعظمی
ابن انشاء

ذوالفقار علی بخاری
بہار کوٹی
بہزاد لکھنوی

تابش دہلوی
صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
تحسین سروری

حبیب جالب
سید محمد جعفری
جوش ملیح آبادی
جون ایلیا

حفیظ جالندھری
حفیظ ہوشیارپوری
شان الحق حقی

عبدالعزیز خالد
خالد علیگ

راغب مراد آبادی
سید آل رضا
رئیس امروہوی

سحر انصاری
سرور بارہ بنکوی

سعید رضا سعید
سلیم احمد

حمایت علی شاعر
شاعر لکھنوی
شبنم رومانی
شکیب جلالی
منظور حسین شور
شورش کاشمیری

صہبا اختر

سید ضمیر جعفری

سراج الدین ظفر
ظہیر کاشمیری

سید عابد علی عابد
عارف عبدالمتین
جمیل الدین عالی
عظیم عباسی
عبیداللہ علیم
عندلیب شادانی

احمد فراز
فضل احمد کریم فضلی
فیض احمد فیض

قابل اجمیری
قتیل شفائی
قمر جلالوی

ماہر القادری

محسن احسان
محسن بھوپالی
محشر بدایونی
عزیز حامد مدنی
مصطفیٰ زیدی
منظر ایوبی
منظر صدیقی

ناصر کاظمی
احمد ندیم قاسمی

وزیر آغا

تذکرہ شعراء و شاعرات' سخن ور حصہ دوم

حیدر اعظمی	دوحہ قطر۔ عربین گلف
حیدر قریشی	ہیئے رشمی۔ جرمنی
ڈاکٹر خالد سہیل	اونٹاریو۔ کینیڈا
عقیل دانش	لندن۔ برطانیہ
اطہر راز	لندن۔ برطانیہ
علی طباطبائی راز لکھنوی نومبر	لاس اینجلس۔ امریکہ
محمد ممتاز راشد	دوحہ۔ قطر۔ عربین گلف
راہی شہابی	جے پور۔ ہندوستان
سید شمیم رجز	لاس اینجلس۔ امریکہ
رحمت قرنی	لندن۔ برطانیہ
رحمٰن صدیقی	لاس اینجلس۔ امریکہ
رشی خان	برلن۔ جرمنی
رئیس الدین رئیس	علی گڑھ۔ ہندوستان
تسلیم الٰہی زلفی	اونٹاریو۔ کینیڈا
ساحل صدیقی	ڈربن۔ ساؤتھ افریقہ
رحمٰن واگلے ساز	لاس اینجلس۔ امریکہ
سحر مہدی	انگلینڈ۔ برطانیہ
امجد علی سرور	دوحہ۔ قطر' عربین گلف
رفعت سروش	دہلی۔ ہندوستان
سلطان الحسن فاروقی	انگلینڈ۔ برطانیہ
اشرف شاد	سڈنی۔ آسٹریلیا
شاہد علی خان شاہد	بحرین۔ عربین گلف
ڈاکٹر شبانہ نذیر	دہلی۔ ہندوستان
مرتضٰی شبلی	سری نگر۔ ہندوستان
ڈاکٹر شبیر احمد	فلوریڈا۔ امریکہ
رخسانہ شمیم	برلن۔ جرمنی

فرحت شہزاد	لاس اینجلس۔ امریکہ
شمشیر سنگھ شیر	روڈاوور۔ ڈنمارک
ضیاء خان	ریاض۔ سعودی عرب
سید مظفر احمد ضیاء	شکاگو۔ امریکہ
طہٰ آفندی	بحرین۔ عریبن گلف
ظفر عظیمی	دوحہ۔ قطر، عریبن گلف
عبدالحمید سولکر ظہور	مسقط۔ عمان، عریبن گلف
عابد جعفری	اونٹاریو۔ کینیڈا
عابدہ کرامت	کویت
عبدالرحمٰن	نیویارک۔ امریکہ
خواجہ ریاض الدین عطش	اسکوکل۔ الے نائی۔ امریکہ
عطیہ نیازی	لاس اینجلس۔ امریکہ
استاد ابراہیم العریض عنایت	بحرین۔ عریبن گلف
غوثیہ سلطانہ	ہینوول۔ الے نائی۔ امریکہ
سعید قیس	بحرین۔ عریبن گلف
کرامت غوری	کویت
سیدہ کنیز فاطمہ کرن	آسٹریلیا
بلراج کومل	دہلی۔ ہندوستان
گلزار	بمبئی۔ ہندوستان
گلشن کھنہ	ہونسلو۔ برطانیہ
مرزا محبوب بیگ	لاس اینجلس۔ امریکہ
عبداللطیف خان محفوظ	مالمو۔ سویڈن
ڈاکٹر مختار الدین احمد	رودرہیم۔ برطانیہ
مخمور سعیدی	دہلی۔ ہندوستان
جمشید مسرور	اوسلو۔ ناروے

خضر مسیحا	لاس اینجلس۔ امریکہ
مونا شہاب	میری لینڈ۔ امریکہ
افشاں مہرین	الخبر۔ سعودی عرب
ناصر نظامی	ایمسٹرڈم۔ ہالینڈ
واجد ندیم	شکاگو۔ امریکہ
افتخار نسیم	شکاگو۔ امریکہ
نسیم سید	اونٹاریو۔ کینیڈا
نسیمہ کلثوم	ہینووا۔ الے نائی۔ امریکہ
آصفہ نشاط	لاس اینجلس۔ امریکہ
نعیمہ ضیاء الدین	سین برگ۔ جرمنی
سرفراز نواز اعظمی	مدینہ منورہ۔ سعودی عرب
نورجہاں نوری	لندن۔ برطانیہ
نوشاد علی موسیقار	بمبئی۔ ہندوستان
نیر جہاں	لاس اینجلس۔ امریکہ
نیاز جیراج پوری	بمبئی۔ ہندوستان
رشید نیاز	دوحہ۔ قطر، عریبین گلف
نیاز گلبرگوی	شکاگو۔ امریکہ
سید حسن جہانگیر ہمدم	سان فرانسسکو۔ امریکہ

اہل قلم کا آئینہ ہوتی ہے ہر کتاب

دنیائے ادب کی مطبوعات

نئی رتوں کا سراغ (نظمیں، غزلیں، قطعات)	ڈاکٹر طاہر سعید ہارون	(لاہور)
متاعِ عزیز (غزلیں)	عزیز الحسن عزیز	(نیویارک)
چراغاں (غزلیں)	سید محمد حنیف اخگر	(نیویارک)
شہر نگار (غزلیں، قطعات)	سرور عالم راز	(ڈیلس)
پاکستان میں ٹیلیویژن صحافت (ترجمہ)	اوج کمال	(کراچی)
فن تحقیق (ایم اے کے نصاب کیلئے)	اوج کمال	(کراچی)
Flower in Flames (ترجمہ بنگال سے کوریا تک)	راجندر سنگھ ورما	(پٹیالہ)
Every Word Aglow (حرف حرف روشنی)	راجندر سنگھ ورما	(پٹیالہ)
میرے خواب (نظمیں، غزلیں)	زرین یاسین	(نیو جرسی)
بانو کے افسانے (21 افسانوں پر مشتمل مجموعہ)	بانو ارشد	(لندن)
آئینوں کے چہرے (نظمیں، غزلیں)	رشیدہ عیاں	(نیو جرسی)
دل کے گنبد میں (غزلیات)	صلاح الدین ناصر	(نیویارک)
دشت جنوں (غزلیات)	غوث متھراوی	(کراچی)
ہاں اور نہیں کے درمیاں (غزلیں، نظمیں)	احمد نوید	(کراچی)
خیاباں (نعت، منقبت، غزلیات)	سید محمد حنیف اخگر	(نیویارک)
Flute & Bugle (ترجمہ بنگال سے کوریا تک)	پرکاش چندر	(دہلی)

زیر طبع

عقیدت کا سفر (سات سو سالہ نعتیہ شاعری کا انتخاب)	مرتب: حمایت علی شاعر	(کراچی)
خواب آنکھوں میں (نظمیں، غزلیں)	ڈاکٹر زاہدہ تسنیم مقصود	(کراچی)
لیلائے سخن (نظمیں، غزلیں)	سید کاظم رضا رضوی	(کراچی)
حرف تمنا (غزلیات)	شاہدہ نسیم سالک	(سنسناٹی)
بولتی آنکھیں (نظمیں، غزلیں)	خواجہ رحمت اللہ جری	(کراچی)
بانو کی کہانیاں (21 افسانوں پر مشتمل مجموعہ)	بانو ارشد	(لندن)
تفہیم منظوم	مخدوم علی ممتاز	(کراچی)
حرف دل گداز (مجموعہ کلام) زیر اہتمام ڈائیلاگ پبلی کیشنز	سید انعام نادر	(کراچی)

اور

ایک بین الاقوامی معروف جریدہ

ماہنامہ دنیائے ادب کراچی (مدیر اعزازی) اوج کمال

عورتوں کی شبلی نعمانی

ہمارے ہاں اول تو شاعروں کے تذکرے لکھے ہی کم گئے اور اگر لکھے بھی گئے تو ان کا جنازہ اٹھنے کے بعد۔ مبادا وہ کسی قدر اطمینان سے مرجائیں۔ ایک ڈر شاید معاصرین کے درمیان تقدیم و تاخیر کا بھی ہو۔ یوں بھی شعراء کے معاملے میں حرف تحسین قبل از مرگ کو واویلا قبل از مرگ ہی سمجھا جاتا ہے حالانکہ۔

کلمات تحسین سے مرحومین کے دل تو بڑھ نہیں سکتے
علامہ اقبال بھی اپنی قبر کا کتبہ پڑھ نہیں سکتے

"مردہ تذکروں" میں تذکرہ نگاروں کیلئے "جہاں مردہ بدست زندہ" والی سہولتیں میسر ہوتی ہیں کہ جسے چاہو بانس پر چڑھا دو اور جس کے پاؤں تلے سے چاہو زمین کھینچ لو' وہاں ان کی زندگی کے مستند حالات کی فراہمی کا عملی دشوار ہی نہیں مشکوک بھی ہو جاتا ہے جبکہ زندگی میں ان کا یہ حال ہے کہ شاید ہی کوئی شاعر اپنی درست تاریخ ولادت پر پیدا ہوا ہو۔ ویسے بھی معاشرے سے شعراء کے تعلقات اکثر کشیدہ ہی رہے ہیں۔ انہوں نے دنیا کو لائق اعتنا نہ سمجھا اور دنیا نے ان کو قابل توجہ نہ گردانا۔ جو شعراء اپنے فن کی "بھاپ" پر اپنی کتابوں میں زندہ رہ گئے' ان میں بھی اکثر تذکروں کے حوالے سے "لاولد" ہی رہے۔ زمانے کو ان کی زندگی کے صرف اسی قدر حالات میسر آئے' جتنے ان کے اشعار سے نچوڑے جاسکے مگر یہ عمل گمراہ کن بھی ہو سکتا ہے کہ اس کلیئے کے مطابق ریاض خیر آبادی جیسے متشرع باعمل پارسا کو شرابی کبابی لکھا جاسکتا ہے۔ یہ تو کتاب کی بات تھی۔ کتاب سے باہر بہت کم شعراء کے بارے میں معلوم ہو سکا کہ خلد آشیانی شہر کے کس محلے میں قیام رکھتے تھے اور اگر کسی مکان میں رہتے تھے تو کہیں بے در و دیوار ہی تو نہیں تھا۔ گھر سے پالکی میں نکلتے تھے یا زمین کا گز بنے پیدل گھومتے رہتے تھے اور تو اور اس دگرگوں صورتحال کی کچھ نشان دہی مرزا غالب جیسے عظیم شاعر کے ہاں بھی ملتی ہے' جب وہ کہتا ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

یہ بات نہیں کہ شعراء کے تذکرے لکھے نہ گئے ہوں مگر جیساکہ پہلے عرض کیا گیا کہ عموماً "مرنے کے بعد لکھے گئے' اس لئے عموماً" چھدرے چھدرے رہ گئے اور بعض تو صرف "شجرہ نسب" کی شاخوں ہی میں گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ بارے کہ اس صدی میں بالخصوص برصغیر کی آزادی کے بعد زندگی کی نئی کروٹوں کے ساتھ تذکرہ نگاری نے بھی کروٹ لی ہے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے' سلطانہ مہر کا "سخن ور" اس سمت میں ایک مینار نو ہے اور مینار نور بھی۔

سلطانہ مہر اردو کی جانی مانی ناول نگار۔ کہانی کار اور صحافی ہیں۔ "سخن ور" کے عنوان سے ان کے قلم سے اب تک زندہ شعراء کے دو تذکرے کتابی صورت میں سامنے آچکے ہیں اور دونوں کتابیں قلم کاری اور جان کاری کا جرات انگیز کارنامہ ہیں۔ سلطانہ مہر نے یہ وسیع خرمن دانہ دانہ کرکے اتنے عرصے میں جمع کیا ہے کہ اب یہ زندہ شعراء بھی مرنے لگے ہیں۔ سلطانہ نے مراسلت میں ہی سو دیڑھ سو میل کاغذ یقیناً" لکھا ہوگا مگر وہ تو ذاتی رابطوں کیلئے لمبے لمبے سفر بھی کرتی رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ محض اسی مقصد سے وہ ایک مرتبہ اسلام آباد بھی آئی تھیں۔ مجھے تو اس کی لگن' تلاش' لیاقت' تیاگ اور بھیسہ سے یوں لگتا ہے جیسے اس بی بی نے "ہانڈی روٹی" کو قرطاس و قلم پر قربان کر رکھا ہے۔ اس حوالے سے سلطانہ مہر کو اگر چھوٹے پیمانے پر عورتوں کی شبلی نعمانی" کہا جائے تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔

ادبی حلقے ابھی "سخن ور" (حصہ اول) کے "ورطہ حیرت" میں چکرا رہے تھے کہ "سخن ور" (حصہ دوم) بھی منظر عام پر آگیا جو پہلے سے بھی زیادہ بھرداں اور بھرپور ہے کہ اس میں سلطانہ نے بھارت کے زندہ شعراء کو بھی اپنی قلم رو میں شامل کرلیا ہے۔ سچ ہے کہ جو لوگ مشکل لمحات کو سر کرتے ہیں' ان کے حوصلے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ میں تو اس عظیم الشان کارنامے کو دیکھ کر اسی طرح سراسیمہ ہو گیا جیسے طرح کوئی اچانک K-2 کے سامنے آجائے۔ سلطانہ مہر کی لیاقت اب کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ تحسین اور اعتراف کی بات یہ ہے کہ اس کے قلم پر تکان یا تکرار کا شائبہ تک نہیں آنے پایا۔ یہ اس کے قلم کا اعجاز ہے کہ وہ ایک جیسے شاعروں کے گرد بھی مختلف کہانیوں کے ہالے بنتی چلی گئی ہے۔ سلطانہ مہر نے یقیناً" ہماری ادبی تاریخ کی ایک ضرورت کو بااحسن وجوہ پورا کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس عہد کے بعض اہم شعراء کی شاعری کو سمجھنے کے علاوہ خود ان کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی مگر میرے نزدیک انفرادی خصوصیت خود سلطانہ مہر کے اسلوب تحریر کا وہ تخلیقی طلسم ہے' جس نے اس دستاویز کو ادب کا خانہ عارژنگ بنادیا اور پھر اردو ادب کا یہ شیش محل اردو ادب کے "کوہ نور ہیرے" کی روشنی سے بھی جگمگا رہا ہے۔ میری مراد جناب مشفق خواجہ کے مقدموں سے ہے کہ یہ شخص جہاں کوئی لفظ رقم کردے وہاں حسن معنی کا ایک میلہ چراغاں روشن ہو جاتا ہے۔

سید ضمیر جعفری

محترمہ سلطانہ مہر امریکہ میں بیٹھ کر "سخن ور" کے نام سے
اردو شاعرات اور شعراء کی جو "انتخابیہ" مرتب کر رہی ہیں،
انہیں دورِ جدید کے تذکرۂ شعرائے اردو کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔
یہ بہت محنت طلب کام ہے اور پھر پاکستان سے سات سمندر پار بیٹھ
کر اس موضوع پر اتنی لگن سے کام کرنا سلطانہ مہر کا ایک ایسا
کارنامہ ہے جو تاریخ ادب اردو کا ایک ناگزیر حصہ بن چکا ہے۔"
"سخن ور" کی دو ضخیم جلدیں مرتب کرنے کے بعد اب وہ جلد سوم
لا رہی ہیں، جس میں شاعرات کے علاوہ شعراء کے بھی حالات اور
نظریات شامل ہوں گے اور ان کے کلام کا انتخاب بھی درج کیا
جائے گا۔ مجھے اس جلد کا شدید انتظار رہے گا کیونکہ یہ ایک مکمل
تذکرہ ہوگا...... اس لیے کہ سلطانہ مہر جو بھی اپنا کام اپنے ہاتھ
میں لیتی ہیں، اسے تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتی ہیں۔
احمد ندیم قاسمی